جنگل جوگی اور لاش

اے حمید

کمانڈو کی بیٹی

PDFBOOKSFREE.PK

بسم اللہ الرحمن الرحیم

معزز قارئین توجہ فرمائیں!

پاکستان ورچوئل لائبریری پر موجود تمام کتابیں قارئین کے مطالعے اور دعوتی واصلاحی مقاصد کے لئے اپلوڈ کی جاتی ہیں۔

تنبیہ

کسی بھی کتاب کو تجارتی یا مادی نفع کے حصول کی خاطر استعمال کرنے کی سخت ممانعت ہے، اور ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کے لیے استعمال کرنا اخلاقی، قانونی و شرعی جرم ہے۔

روبی کو اپنی طرف گھورتے دیکھ کر سپاہی نے کہا۔

"بی بی میری طرف پٹر پٹر کیا دیکھ رہی ہو۔ مجھے بتاؤ تم دونوں اتنی رات گئے کہاں سے آرہی ہو؟" روبی نے اتنی دیر میں سوچ لیا تھا کہ اسے اب کیا کہنا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ پولیس کسی واردات کی تفتیش کرے یا نہ کرے مگر خود کسی واردات میں ملوث ہونے سے بڑی گھبراتی ہے۔ چنانچہ اس نے آواز میں گھبراہٹ پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"میں لاہور کے ایک کالج کی پروفیسر ہوں۔ یہ میری سہیلی ہے۔ میں اسے ملنے لاہور سے آئی تھی۔ اس کا خاوند نشہ کرتا ہے۔ اس نے میری سہیلی کو مارا پیٹا ہے۔ وہ اسے جان سے مار دینا چاہتا ہے۔ میں اسے بڑی مشکل سے نکال کر بھاگی ہوں۔ ہو سکتا ہے اس کا خاوند ہاکی لے کر اسے ہلاک کرنے ..... پیچھے ..... پیچھے آرہا ہو۔ آپ پلیز ہمیں یا تو پولیس چوکی میں پناہ دے دیں یا ہمیں لاہور جانے والی بس میں بٹھا دیں۔"

پولیس کانسٹیبل پر وہی اثر ہوا جس کا روبی کو یقین تھا۔ ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔

"بی بی! پولیس کو کیوں بیچ میں پھنساتی ہو۔ لڑائی جھگڑا اچھی بات نہیں ہے۔ تھانے میں کوئی واردات ہو گئی تو ہمیں پسوڑی پڑ جائے گی۔ اس بی بی کو لے کر لاہور کی طرف چلی جاؤ۔ آگے اڈہ ہے۔ کوئی بس آئی تو اس میں بیٹھ جانا۔ اس کا خاوند آیا تو میں اسے سنبھال لوں گا۔ جاؤ شاباش۔"

روبی نے شبانہ کو ساتھ لیا اور سڑک پر آگے چل پڑی۔ تھوڑا آگے جانے کے بعد مغویہ لڑکی شبانہ کہنے لگی۔

"تم نے خوب ڈراما کیا۔ لیکن تم پولیس کو بتا دیتیں کہ تم مجھے ڈاکوؤں کے چنگل سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھڑا کر لائی ہو۔" روبی نے آہستہ سے کہا۔

"وہاں نادر بدمعاش کے ڈیرے پر جو اتنی لاشیں پڑی ہیں ان کا حساب بھی تو دینا پڑتا۔"

شبانہ خاموش رہی۔ آگے چوک آگیا۔ بائیں جانب لاری اڈہ بالکل سنسان پڑا تھا۔

"یہاں تو کوئی لاری نہیں ہے۔" شبانہ نے فکر مند ہو کر کہا۔ روبی نے کہا۔

"اسٹیشن پر چلتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہاں کوئی لاہور جانے والی گاڑی مل جائے۔" ابھی وہ اسٹیشن کی طرف جانے کا پروگرام ہی بنا رہی تھیں کہ سڑک پر لاری کی بتیاں نظر آئیں۔ پھر ہارن کی آواز آئی۔ ایک لاری اڈے پر آکر رک گئی۔ اس میں بیٹھے اکثر مسافر سو رہے تھے۔ ڈرائیور نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر روبی اور شبانہ سے کہا۔

"بی بی لاہور جانا ہے تو بیٹھ جاؤ۔ سنتری نے بتایا ہے کہ تم لاہور جا رہی ہو۔"

روبی اور شبانہ جلدی سے لاری کی ایک خالی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ لاری چل پڑی۔ روبی نے اطمینان کا سانس لیا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد لاری لاہور شہر کے شمالی مضافات میں سے گزر رہی تھی۔ بادامی باغ میں ان لاریوں کے واسطے نیا نیا اڈہ تعمیر ہوا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ مسافر اترنے لگے۔ روبی اور شبانہ بھی گاڑی سے اتر آئیں۔ ابھی رکشے نئے نئے چلے تھے۔ مگر انہیں ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔ شبانہ نے ڈرائیور کو ماڈل ٹاؤن کی طرف چلنے کو کہا۔ ٹیکسی لاہور شہر کی خالی خالی روشن سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ رات کا پچھلا پہر شروع ہو چکا تھا۔ روبی کی آنکھیں جل رہی تھیں مگر نیند کوسوں دور تھی۔ اسے بار بار دارا کا خیال آتا کہ نہ جانے وہ کس طرف نکل گیا ہو گا۔ لیکن وہ جہاں بھی گیا ہو گا میاں خان کے فارم میں ضرور واپس آجائے گا۔ روبی بھی چاہتی تھی کہ دن کا اجالا پھیلنے سے پہلے پہلے کسی طرح میاں خان کے فارم میں پہنچ جائے۔ روبی مغویہ لڑکی شبانہ کو اس کے ماں باپ کی کوٹھی کے دروازے پر چھوڑ کر واپس جانے لگی تو شبانہ نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"نہیں میری بہن! میں اکیلی گھر میں داخل نہیں ہوں گی۔ تم میرے ساتھ چلو گی۔ پلیز!"

روبی اس کے ساتھ ہولی۔ کوٹھی بڑی عالی شان تھی۔ آگے پیچھے کشادہ باغ تھا۔ پورچ

میں تین گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی تھیں۔ ایک لائیٹ جل رہی تھی۔ شبانہ نے برآمدے میں آکر محرابی دروازے کے باہر لگی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ تیسری بار گھنٹی دینے سے اندر کسی کی نیند بھری آواز آئی۔

"کون ہے؟" یہ کوئی نوکر تھا۔ شبانہ نے رقت بھری آواز میں کہا۔

"میں ہوں رحمت بابا شبانہ۔" اندر جو کوریڈور تھا اس کی بتی ایک دم روشن ہو گئی۔ دروازہ کھل گیا۔

ایک عمر رسیدہ نوکر نے آگے بڑھ کر شبانہ کے ماتھے کو چوم لیا اور یا اللہ تیرا شکر ہے۔ یا اللہ تیرا شکر ہے پکارتا ہوا گھر میں سوئے ہوئے لوگوں کو آوازیں دینے لگا۔

دو منٹ بعد شبانہ ایک سجے سجائے ڈرائینگ روم میں اپنی بھاری بدن والی والدہ کے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھ کر اس کی بلائیں لے رہی تھی۔ ادھیڑ عمر باپ خوش بھی تھا اور کچھ پریشان بھی تھا۔ وہ ٹیلی فون کا کوئی نمبر گھما رہا تھا۔ روبی نے انہیں صرف یہی بتایا تھا کہ میں شبانہ کو بدمعاشوں کے ڈیرے سے نکال لائی ہوں میں نے اسے بے آبرو ہونے سے بچا لیا ہے اور غنڈے اب انکا نہ تو پیچھا کریں گے اور نہ شبانہ کو دوبارہ اغوا کرنے کی دھمکی دیں گے۔ مگر شبانہ کے باپ کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے خاندان کی عزت غنڈوں بدمعاشوں کے ہتھکنڈوں سے محفوظ ہو گئی ہے۔ اس نے روبی کی باتوں پر زیادہ یقین نہیں کیا تھا۔ وہ ڈی۔ ایس۔ پی کو فون کر رہا تھا اور روبی کے دیکھتے دیکھتے اس نے ڈی۔ایس۔پی سے بات شروع کر دی۔ جب روبی نے ڈی۔ایس۔پی کا سنا تو یہ کہہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں نے اپنا فرض ادا کر دیا اب مجھے اجازت دیں۔"

مگر شبانہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بڑی عاجزی سے بولی۔

"بہن! پلیز ابھی مت جاؤ۔ ابھی میرے کمرے میں میرے پاس بیٹھو۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے تم میرے پاس رہو گی تو مجھے حوصلہ رہے گا۔" روبی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تم جوان لڑکی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہاری عزت بچا لی ہے۔ تمہیں بھی اب بہادری سے کام لینا چاہئے۔ اپنے اندر اعتماد پیدا کرنا چاہئے۔ تم کالج میں پڑھتی ہو۔ اس تعلیم کا کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فائدہ جو تمہارے اندر اعتماد اور دلیری پیدا نہ کر سکے۔ اب مجھے اجازت دو۔" شبانہ کی امی اور ڈیڈی نے بھی روبی کو باقی رات وہیں آرام کرنے کو کہا مگر روبی نے واپس جانے پر اصرار کیا۔ اتنے میں باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ روبی کے کان کھڑے ہو گئے۔ شبانہ کے باپ نے کہا۔

"میں نے ڈی۔ایس۔پی صاحب کو شبانہ کی واپسی کی خبر کر دی تھی۔ انہوں نے ایس ایچ او کو جگا کر شبانہ کا بیان لینے کے لئے بھیجا ہے۔" اتنے میں گھنٹی بجی شبانہ کا باپ دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ روبی نے اسے روک دیا اور کہا۔

"میں کسی وجہ سے نہیں چاہتی کہ پولیس کو پتا چلے کہ میں شبانہ کو نکال کر لائی ہوں۔ اس میں آپ کی بیٹی کی بھی بھلائی ہے۔ اگر پولیس کو میرا پتا چل گیا تو آپ کی بیٹی پر پھر کوئی مصیبت آسکتی ہے۔"

شبانہ کے باپ نے کہا۔

"تم جیسے کہتی ہو ویسے ہی ہو گا بیٹی خدا کا شکر ہے میں نے ڈی ایس پی کو فون پر یہ نہیں بتایا تھا کہ اسے ایک عورت نکال کر لائی ہے۔ تم ایسا کرو ساتھ والے کمرے میں چلی جاؤ۔"

روبی جلدی سے ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ ڈرائینگ روم میں تھانیدار دو سپاہیوں کے ساتھ داخل ہوا۔ اس نے شبانہ کے والد کو سلام کیا پھر شبانہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"خدا کا شکر ہے بچی گھر واپس آگئی بیٹی تمہیں کون لایا ہے یہاں؟" شبانہ کی بجائے اس کے باپ نے جلدی سے کہا۔

"اکیلی ہی بدمعاشوں کے چنگل سے نکل کر بھاگی ہے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بچی گھر آگئی۔" تھانیدار نے بڑے ادب سے تھوڑا مسکراتے ہوئے شبانہ کے باپ کی طرف دیکھا اور کہا۔

"جناب والا! میں نے بچی سے پوچھا ہے۔ اسے جواب دینے کا موقع دیں۔" شبانہ کے والد بولے۔

"وہ بے چاری سخت پریشان ہے۔ وہ بھی یہی جواب دے گی۔" تھانیدار نے شبانہ کی طرف دیکھ کر اپنا سوال دہرایا۔

شبانہ اب پوری طرح اپنے ہوش و حواس میں تھی۔ وہ روبی کو اپنی سب سے بڑی محسنہ سمجھتی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ روبی کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا۔ ان دونوں نے اسے نادر بدمعاش اور اس کے غنڈوں کے چنگل سے نکالا تھا اور ان سب کو ہلاک کر دیا تھا۔ وہ بھلا کس طرح روبی کا نام لے سکتی تھی۔ اپنے گھر کی فضا نے شبانہ میں مزید خود اعتمادی پیدا کر دی تھی۔ اس نے بڑے سکون سے کہا۔

"تھانیدار صاحب میں پڑھی لکھی لڑکی ہوں۔ ٹھیک ہے غنڈوں نے مجھے کالج کے گیٹ سے قابو کر کے اغوا ضرور کر لیا تھا مگر میں موقع کی تلاش میں تھی۔ آج رات مجھے موقع مل گیا اور میں کھڑکی کا شیشہ توڑ کر وہاں سے نکل بھاگی اب آپ کا فرض ہے کہ ان بدمعاشوں کو گرفتار کریں جو عزت دار لوگوں کی عزتوں سے کھیلتے ہیں۔ میں آپ کو نادر بدمعاش کے اڈے کا پورا پتہ بتائے دیتی ہوں۔" تھانیدار کا چہرہ ایسا تھا جیسے اسے شبانہ کی ایک بات کا بھی یقین نہیں آیا۔ کہنے لگا۔

"بیٹی! تو اس وقت تھکی ہوئی ہے اور بڑے خطرناک قاتلوں کے پنجے سے نکل کر آئی ہے۔ تو آرام کر میری بچی۔" تھانیدار اٹھا اور شبانہ کے والد سے کہنے لگا۔

"سر جی! میں کل کسی وقت حاضر ہوں گا۔ ویسے ہماری ایک چھاپہ مار پارٹی دو گھنٹے ہوئے ان بدمعاشوں کے اڈے کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔ ہو سکتا ہے بچی کے وہاں سے بھاگ نکلنے کے بعد پولیس پارٹی وہاں پہنچی ہو۔ اچھا جی میں چلتا ہوں آپ آرام کیجئے۔" تھانیدار اپنے سپاہیوں کو لے کر ڈرائینگ روم سے نکل گیا۔

روبی نے بند دروازے کے ساتھ کان لگائے یہ ساری باتیں سن لی تھیں۔ جب پولیس والے چلے گئے تو روبی دروازہ کھول کر ڈرائینگ روم میں آگئی۔ شبانہ کی والدہ اور والد اسے تحسین اور احسان بھری نظروں سے دیکھنے لگے شبانہ کے والد نے اس سے کہا۔

"بیٹی! تم نے اپنے بارے میں ہمیں کچھ نہیں بتایا کہ تم کون ہو اور ہماری بچی کے پاس کیسے پہنچ گئیں۔" روبی کا چہرہ سنجیدہ تھا۔ اس نے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"آپ لوگ ایسی باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں جن کا آپ کے ساتھ کوئی تعلق کوئی واسطہ نہیں ہے۔ میں جو بھی کوئی ہوں میں نے آپ کی بچی کو عزت و آبرو سمیت آپ کے پاس پہنچا دیا ہے اور یہ میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ اب میں سو جانا چاہتی ہوں۔ اور آپ سے صرف اتنا چاہوں گی کہ میرے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائیں۔"

شبانہ کا باپ اور والدہ روبی سے معذرت کا اظہار کرنے لگے۔ شبانہ کے باپ نے شبانہ سے کہا۔

"بیٹی! اپنی بہن کو اپنے کمرے میں لے جاؤ اور تم بھی آرام کرو۔" پھر اس نے روبی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بیٹی! تم بے فکر رہو تمہارے بارے میں یہاں کسی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں نکلے گا۔"

شبانہ روبی کو اپنے کمرے میں لے آئی روبی نے قمیص کے اندر سے چاقو اور ریوالور نکال کر سرہانے کے نیچے رکھ دیا۔ وہ بڑے آرام دہ بستر پر لیٹ گئی شبانہ بولی۔

"تم آرام کرو روبی! تم نے جیسا کہا ہے ویسا ہی ہو گا۔ میں ساتھ والے کمرے میں سونے جا رہی ہوں۔"

روبی نے کوئی جواب نہ دیا۔ شبانہ کے جانے کے بعد روبی نے اٹھ کر دروازے کی چٹخنی لگا دی بند کھڑکی کے آگے پردہ کھینچا اور بستر پر لیٹتے ہی آنکھیں بند کر لیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ گہری نیند سو رہی تھی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو سارے کمرے میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ روبی نے اٹھ کر غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھویا اور کھڑکی کا پردہ اٹھا کر باہر دیکھا کوٹھی کا عقبی لان اور اس کے پیڑ پودے دھوپ میں روشن روشن تھے۔ ایک مالی کونے کی جانب مشین چلا کر گھاس کاٹ رہا تھا۔ دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی روبی نے دروازہ کھول دیا۔ شبانہ شگفتہ چہرے اور صاف ستھرے لباس کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ وہ روبی کے لئے ناشتہ لائی تھی۔ روبی بستر پر بیٹھ گئی۔ سرہانے کے نیچے سے ریوالور نکال کر کھولا اور اس کی گولیاں گننے لگی۔ صرف پانچ گولیاں ریوالور میں باقی تھیں۔ روبی

نے ریوالور دوبارہ سرہانے کے نیچے رکھ دیا۔ ناشتہ کرتے ہوئے شبانہ کہنے لگی۔

"روبی بہن! تم نے مجھ پر میرے خاندان پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ ہم ساری زندگی اس کا بدلہ نہیں چکا سکتے۔"

روبی نے کوئی جواب نہ دیا۔ شبانہ نے پوچھا۔" روبی بہن! اب تمہارا کہاں جانے کا ارادہ ہے؟ تم نے اپنے بارے میں تو مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔" روبی چائے پی رہی تھی۔ پیالی ہونٹوں سے ہٹاتے ہوئے بولی۔

"آخر تم لوگوں کو میرے بارے میں اتنی کرید کیوں ہے؟ میں نے تو تمہارے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔" شبانہ نے فوراً معذرت پیش کی اور بولی۔

"معاف کرنا روبی میں نے ویسے ہی پوچھا تھا اصل میں مجھے تمہاری سلامتی کی فکر ہے۔" روبی نے بے نیازی سے کہا۔

"تمہیں میری فکر کرنے کی ضروت نہیں۔ میں اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔"

دونوں خاموشی سے ناشتہ کرنے لگیں۔ اس وقت دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ روبی نے وہاں سے کیسے نکلنا تھا اور نکل کر کہاں جانا تھا؟ یہ سب کچھ اس نے پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ اس نے شبانہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تمہیں میرے ایک دو کام کرنے ہوں گے۔" روبی نے چائے کی پیالی طشت میں رکھنے کے بعد شبانہ سے کہا۔

"مجھے میرے سائیز کا ملیشیا کا ایک مردانہ سوٹ یعنی شلوار قمیص، قمیص کے اندر پہننے کے لئے لٹھے کی ایک مضبوط صدری اور ربر کے جوتے لا دو۔" شبانہ سمجھ گئی کہ روبی اس کی عزت بچانے کے واسطے تین چار غنڈوں کا خون کر چکی ہے اور اب وہ مردانہ حلیئے میں لاہور سے کسی دوسرے شہر کی طرف فرار ہو جانا چاہتی ہے اس نے کہا۔

"میں یہ ساری چیزیں تمہیں لا دوں گی۔" پھر شبانہ اٹھ کر الماری کے پاس گئی وہاں سے سو سو کے پچاس ساٹھ نوٹ نکال لائی۔" اور روبی کے قریب پلنگ پر رکھ کر بولی۔" یہ قبول کر لو۔ تمہیں ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔" روبی نے ہاتھ سے نوٹوں کو پرے کر دیا۔

"شکریہ! میرے پاس سب کچھ ہے۔" اسی وقت شبانہ نے روبی کا ناپ لیا اور گاڑی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نکال کر شہر کی مارکیٹ میں آگئی۔ وہاں سے مطلوبہ چیزیں خریدیں اور واپس اپنی کوٹھی میں آکر روبی کے حوالے کر دیں۔ روبی نے کپڑے پہن کر دیکھے وہ اس کے جسم پر پورے تھے۔ روبی نے کچھ کرنسی نوٹ ابھی تک اپنی کمر کے ساتھ تھیلیوں میں ڈال کر باندھ رکھے تھے۔ یہ نوٹ اس نے صدری کی جیب میں رکھ لئے جو قمیص کے نیچے پہنی ہوئی تھی۔ اسی صدری کی ایک جیب میں ریوالور اور چاقو بھی سنبھال کر رکھ لیا۔ اس کے بعد اس نے شبانہ سے کہا۔

"قینچی لا کر میرے سر کے بال بالکل چھوٹے چھوٹے کر دو۔ جیسے لڑکوں کے ہوتے ہیں۔" روبی کے بال پہلے ہی گردن تک کٹے ہوئے تھے۔ شبانہ نے انہیں کاٹ کر مزید چھوٹا کر دیا۔

روبی کا جسم پہلے ہی دبلا پتلا تھا چنانچہ اس کے نسوانی خطوط ملیشیا کے کھلے مردانہ کرتے میں بڑی آسانی سے چھپ گئے تھے۔ عورت ہونا روبی کے چٹان جیسے عزائم کی راہ میں رکاوٹ ضرور تھا لیکن روبی نے اپنی بے پناہ قوت ارادی اور جرائم کے خلاف جنگ کے جذبے سے اس کمزوری پر بہت حد تک قابو پا لیا تھا۔ اس میں روبی کی اس ٹریننگ کا بھی حصہ تھا جو اس نے دشمن پر بغیر کسی ہتھیار کے غالب آنے کے واسطے ہانگ کانگ میں حاصل کی تھی۔ بدی کی طاقتوں اور جرائم پیشہ مجرموں نے اسے جس بے دردی سے گھر سے بے گھر' اپنی پیاری بچی عائشہ اور محبوب ترین خاوند شیر خان سے الگ کر دیا تھا' روبی کو اس کا بھی شدت سے احساس تھا۔ وہ کسی دوسرے ملک میں تیسرے درجے کا شہری بننے کی بجائے اپنے وطن میں اپنے خاوند کے ساتھ عزت آبرو کی غریبانہ زندگی بسر کرنا چاہتی تھی لیکن جرائم پیشہ لوگوں نے ہر قدم پر اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کیں اور اس کی عزت کا سودا کرنا چاہا۔ روبی نے نہ اپنی عزت کا سودا کیا نہ کسی دوسری پاک باز عورت کی عزت کا سودا کرنے کی اجازت دی اور پھر وہ ایک قہر بن کر بجلی کا کوندا بن کر اٹھی اور اب ہر اس عادی مجرم پر بجلی بن کر گر رہی تھی جو خاندانوں کی عزتوں اور مامتا کے جگر کے ٹکڑوں کا سودا کرنا چاہتے تھے اور تاوان کی رقم نہ ملنے پر مظلوم لڑکیوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنا کر انہیں ہلاک کر دیتے یا آگے فروخت کر دیتے تھے۔ شبانہ نے ڈرتے ڈرتے روبی سے پوچھا۔

"کیا تم مجھے بھی نہیں بتاؤ گی کہ یہاں سے کہاں جاؤ گی؟"

روبی اس وقت مردانہ لباس میں تھی۔ سر کے چھوٹے چھوٹے بالوں کی وجہ سے بھی وہ بالکل نوجوان لڑکا لگ رہی تھی۔ اس نے ذرا سے تبسم کے ساتھ شبانہ کی طرف دیکھا اور کہا۔

"نہیں بتا سکتی۔"

روبی وہاں سے سیدھی دارا کے دوست میاں خان کے فارم کی طرف نکل جانا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دارا وہاں ضرور پہنچ گیا ہو گا۔ اگرچہ میاں خان کا فارم نو غنڈوں کی قتل گاہ یعنی نادر بدمعاش کے ڈیرے کے قریب تھا۔ لیکن روبی کا وہاں پہنچنا بھی ضروری تھا۔ اسے ہر حال میں دارا سے ملنا تھا اور اس کے بعد کوئی اگلا پروگرام بنانا تھا۔ شام ہونے تک وہ شبانہ کے کمرے میں ہی رہی۔ اسی دوران پولیس آکر شبانہ کا بیان لے گئی تھی جس میں اس نے یہی بتایا تھا کہ وہ ڈیرے سے اکیلی بھاگی تھی اور وہاں جو قتل ہوئے ہیں ان کے بارے میں اسے کچھ علم نہیں ہے۔

جب شروع رات کا اندھیرا شہر کے گلی کوچوں میں اتر آیا تو روبی نے شبانہ سے کہا۔

"اب میں جاتی ہوں۔" شبانہ بولی۔

"تمہیں جہاں تک جانا ہے میں اپنی گاڑی میں چھوڑ آتی ہوں۔" روبی نے ملیشیا کی پتلی سی چادر اپنے کاندھوں پر ڈال رکھی تھی۔ اس نے شبانہ کے کاندھے کو تھپتھپا کر کہا۔

"ایک بات یاد رکھو۔ یہاں پولیس تمہاری نگرانی کر رہی ہے۔ اس کو تمہارے بیان پر یقین نہیں آیا ہو گا۔ وہ جانتی ہے کہ تم نادر بدمعاش کے ڈیرے پر ہونے والے قتل کی عینی گواہ ہو اور قاتل کو پہچان سکتی ہو اور جان بوجھ کر اس کا نام چھپا رہی ہو۔ تمہیں کچھ روز اسی طرح اپنے بیان پر ڈٹے رہنے کی ضرورت ہے۔ پولیس تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ تمہاری جگہ اگر کوئی غریب مزدور کی لڑکی ہوتی تو پولیس اسے تھانے لے جا کر اب تک سب کچھ اگلوا چکی ہوتی۔ مگر تم ایک امیر اور با اثر آدمی کی بیٹی ہو پولیس تم پر ہاتھ نہیں ڈالے گی۔ میں اکیلی ہی یہاں سے نکلوں گی مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تمہاری کوٹھی کے پچھواڑے جو سڑک ہے وہاں سے راوی کے پل کی طرف کونسا راستہ جاتا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

روبی جب رخصت ہونے لگی تو شبانہ کی آنکھیں فرط عقیدت سے بھر آئیں۔ روبی نے اچانک شبانہ کو گریبان سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور سخت لہجے میں کہا۔

"خبردار! آنسو مت بہانا۔ میں کسی بھی عورت کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی۔"

روبی نے شبانہ کا گریبان چھوڑ کر اسے تھوڑا سا پیچھے دھکیل دیا۔ شبانہ پلنگ پر گرتے گرتے بچی۔ اتنی دیر میں روبی کمرے کی کھڑکی سے اتر کر عقبی لان کی جھاڑیوں میں پہنچ چکی تھی۔ وہاں سے وہ جھکے جھکے چلتی عقبی باغیچے کی دیوار میں بنے ہوئے چھوٹے سے دروازے کی طرف بڑھی کوٹھیوں کے پچھواڑے کی چھوٹی سی سڑک پر کہیں کہیں کوئی بتی جل رہی تھی۔ روبی مردانہ لباس میں تھی۔ ایک پتلی چادر اس نے اپنے ملیشے کے مردانہ شلوار قمیص والے سوٹ کے اوپر لے رکھی تھی۔ سر کے بال چھوٹے چھوٹے مردانہ طرز کے تھے۔ اسے کوئی بمشکل ہی پہچان سکتا تھا کہ یہ ایک عورت ہے۔ وہ بڑے اطمینان سے کوٹھیوں کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی نسبتاً کھلی سڑک پر آگئی۔ یہاں اس کو ایک خالی ٹیکسی مل گئی اس نے ڈرائیور کو شاہدرہ چوک کی طرف چلنے کو کہا کیونکہ وہیں سے ایک سڑک شیخوپورہ کی طرف جاتی تھی۔

ٹیکسی لاہور کی روشنی اور بارونق سڑکوں پر سے گزرتی پندرہ بیس منٹ میں شاہدرہ چوک پہنچ گئی۔ یہاں سے روبی ایک بس میں سوار ہوئی اور شیخوپورہ شہر سے ذرا آگے جا کر اتر گئی۔ وہ اس جگہ کو پہچانتی تھی رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اس وقت کوئی سواری میاں خان کے گاؤں کی طرف جانے والی نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے ایک تانگے والے کو زیادہ رقم دے کر اور یہ کہہ کر جانے پر راضی کیا کہ میری ماں گاؤں میں بڑی بیمار ہے میں اس کی عیادت کو جا رہا ہوں۔ تانگہ کھیتوں میں سے گزر کر کچی سڑک پر روانہ ہو گیا۔ یہاں چاروں طرف اندھیرا تھا۔ صرف ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی ہی تھی۔ روبی کے پاس روپے بھی تھے۔ چاقو اور ریوالور بھی تھا جس میں صرف چند ایک گولیاں ہی باقی رہ گئی تھیں۔ سیم نالے یعنی کھال کے پل پر روبی نے تانگے والے کو واپس کر دیا۔

رات کی تاریکی اور ستاروں کی دھندلی روشنی میں کھیتوں میں میاں خان کے فارم کی طرف روانہ ہو گئی۔ آدھے گھنٹے بعد اسے میاں خان کے فارم کے اکلوتے بلب کی روشنی

دور درختوں میں نظر آئی۔ روبی نے اپنی رفتار تیز کر لی۔ اس کا خیال تھا کہ دارا وہیں پر ہو گا۔ وہ فارم کی عقبی جھاڑیوں والی دیوار سے ہو کر فارم کے احاطے میں آئی تو دونوں کوٹھریوں پر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ تخت پوش پر کوئی کھیس اوپر کیے سو رہا تھا روبی نے سوئے ہوئے آدمی کے منہ پر سے کھیس ہٹا دیا۔ یہ میاں خان کا بوڑھا ملازم تھا وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ روبی نے کہا۔

"میاں خان کہاں ہے؟ کیا میرا بھائی یہاں آیا تھا؟" ملازم نے روبی کو پہچان لیا تھا۔ کہنے لگا۔

"خان جی تو گھر چلے گئے ہیں۔ تمہارا ساتھی تمہارے بعد نہیں آیا۔ میں خان جی کو بلاتا ہوں۔" ملازم میاں خان کو بلانے چل دیا۔

روبی وہیں تخت پر بیٹھ کر سوچنے لگی۔ دارا ادھر کیوں نہیں آیا؟ اسے یہاں آجانا چاہئے تھا۔ وہ تو جانتا تھا کہ میں واپس فارم پر ہی آؤں گی۔ کہیں وہ کسی مصیبت میں تو نہیں پھنس گیا۔ روبی انہی خیالوں میں الجھی ہوئی تھی کہ میاں خان آگیا۔ اس نے ملازم کو دودھ گرم کرنے کو کہا۔

روبی بولی۔

"میں شہر سے کھانا کھا کر آرہی ہوں۔ دودھ کی ضرورت نہیں خان بھائی۔ یہ بتاؤ کہ دارا کہاں ہے؟" میاں خان تخت پوش پر بیٹھ گیا۔ اس کے گلے میں پستول لٹک رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"پہلے یہ بتاؤ تمہیں یہاں آتے کسی نے دیکھا تو نہیں؟" روبی نے کہا۔

"میرا خیال ہے کوئی میرا پیچھا نہیں کر رہا ویسے بھی میں نے مردانہ حلیہ بنا رکھا ہے۔"

میاں خان بولا۔

"اچھا کیا۔ کیونکہ نادر بدمعاش اور اس کے سارے غنڈوں کے قتل کے بعد یہ سارا علاقہ خفیہ پولیس کی نگرانی میں ہے۔ تم لوگوں نے وہ کام کر دکھایا جو پولیس کئی سالوں سے نہیں کر سکی۔ علاقے کے لوگوں نے سکھ کا سانس لیا ہے۔ ان بدکردار جرائم پیشہ لوگوں نے شریفوں کی زندگیاں عذاب میں ڈال رکھی تھیں۔ کسی کی عزت انکے ہاتھوں محفوظ نہیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ اب عورتیں رات کو بھی گھروں سے نکل کر اپنے کھیتوں میں چلی جاتی ہیں۔"

روبی نے اپنے اصل موضوع پر آتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔ "دارا فارم پر کیوں نہیں آیا۔" پھر اس نے میاں خان کو سارا واقعہ سنا دیا کہ کس طرح وہ غنڈوں کو جہنم رسید کرنے کے بعد مغویہ لڑکی کو لے کر ڈیرے سے نکلے۔ کیسے اسی وقت پولیس کی چھاپہ مار پارٹی بھی آ گئی۔ فائرنگ شروع ہو گئی۔ وہ لڑکی کو گھوڑے پر بٹھا کر بھاگے۔ پھر دارا کا گھوڑا فائرنگ کے دھماکوں سے بے قابو ہو کر کھیتوں میں ان سے بچھڑ گیا۔ میاں خان نے ساری کہانی سنی اور کہنے لگا۔

"دارا بڑا سیانا آدمی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اتنے آدمیوں کے قتل کے بعد یہ سارا علاقہ پولیس کے گھیرے میں آجائے گا اور اس فارم میں اس کے گرفتار ہونے کا پورا امکان ہے۔ اسی خیال سے وہ ادھر نہیں آیا۔" میاں خان نے اندھیرے میں ڈوبے آس پاس کے درختوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ "مجھے شک ہے کہ تمہارے پیچھے بھی خفیہ پولیس کا کوئی نہ کوئی آدمی گاؤں کے باہر سے لگ گیا ہو گا۔" روبی کہنے لگی۔

"اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو میں ابھی یہاں سے چلی جاتی ہوں۔ میں نہیں چاہتی کہ ہماری وجہ سے تم کسی مشکل میں پڑ جاؤ۔" میاں خان نے اٹھ کر کوٹھری کا تالہ کھول دیا اور روبی سے کہا۔

"تم یہاں آرام کرو۔ صبح بات کریں گے۔ میرا ملازم فارم کے احاطے میں پہرہ دے گا۔ تم اطمینان سے سو جاؤ۔"

میاں خان خاموشی سے جدھر سے آیا تھا ادھر چل دیا۔ روبی کو میاں خان کی باتوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کے بارے میں اس کا رویہ بہت محتاط ہو گیا ہے۔ یہ ایک قدرتی بات تھی۔ میاں خان بدمعاشی اور اسمگلنگ چھوڑ کر اب ایک شریفانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا نام پولیس کے رجسٹروں میں دوبارہ چڑھے۔ روبی نے میاں خان کے اس رویے کو دل میں سراہا اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس کی شریفانہ زندگی میں کسی قسم کا خلل نہیں ڈالے گی۔ ویسے بھی چونکہ دارا وہاں نہیں تھا اس لئے روبی کے وہاں ٹھہرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ وہ اگلے روز وہاں سے جانے والی تھی لیکن میاں خان کے محتاط

رویے کو دیکھتے ہوئے روبی نے اسی وقت وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے پاس کافی پیسے تھے۔ جو نوٹوں کی شکل میں اس کی قمیص کے اندر صدری میں موجود تھے اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر بوڑھا ملازم تخت پوش پر بیٹھا پہرہ دے رہا تھا۔ روبی اس کے پاس آئی۔ ملازم اٹھ کھڑا ہوا۔

"کچھ چاہئے بی بی۔" بوڑھے تجربہ کار ملازم نے رات کو ہی روبی کو مردانہ لباس میں پہچان لیا تھا۔ روبی نے کہا۔

"میں شہر جا رہی ہوں۔ خان جی کا میری طرف سے شکریہ ادا کرنا۔" ملازم نے کہا۔

"بی بی اس وقت تمہیں شہر جانے والی سواری کہیں نہیں ملے گی۔ ایسا کرو گھوڑی سے جاؤ۔ اسے شیخوپورہ والی سڑک پر پہنچ کر چھوڑ دینا۔ یہ اپنے آپ فارم میں پہنچ جائے گی۔"

روبی کو یہ ترکیب پسند آئی۔ اس کا ایک بڑا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد وہ گھوڑی پر بیٹھی اندھیرے کھیتوں میں سے گزر رہی تھی۔

روبی کو شیخوپورہ والی سڑک پر پہنچتے پہنچتے ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس جانب پولیس کا کوئی آدمی اسے نہیں ملا۔ اس نے گھوڑی کا رخ پیچھے کی طرف کر کے اسے بھگا دیا۔ اب وہ لاہور والی سڑک پر تھی۔ آگے بائیں جانب شیخوپورہ شہر کی بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ وہ پولیس چوکی کے سامنے سے گزرنے کی غلطی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سڑک سے اتر کر کھیتوں میں سے ہوتی ہوئی اور ایک چکر کاٹ کر پولیس چوکی سے کوئی دو فرلانگ آگے سڑک پر چڑھ آئی۔ اس وقت رات کا دس ساڑھے دس کا وقت ہو گا اسے لاہور جانے والی لاری مل گئی۔ یہ لاری پنڈی سے آ رہی تھی۔ روبی کراچی جانے کا سوچ کر میاں خان کے فارم سے نکلی تھی۔ اسے شیر خان اور اپنی بیٹی عائشہ کی یاد بہت ستانے لگی تھی۔ وہ کسی دوسری طرف نکل جانے سے پہلے اپنے محبوب خاوند اور جگر کے ٹکڑے اپنی پیاری بچی سے ایک بار ضرور ملنا چاہتی تھی۔ اسے یہ خیال بھی تھا کہ شاید کراچی میں شیر خان سے دارا کا کچھ پتہ چل جائے۔ وہ لاہور ریلوے اسٹیشن کے قریب لاری سے اتر گئی۔ مردانہ لباس میں ہونے کی وجہ سے کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ روبی نے لاہور سے کراچی تک کا تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خریدا اور پلیٹ فارم پر آ کر بنچ پر بیٹھ گئی۔ وہ عام

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

قسم کا محنت کش لڑکا لگ رہی تھی۔ جو پوٹھوہار کے علاقے سے محنت مزدوری کے واسطے لاہور آجاتے ہیں۔ رات کے بارہ بجے اسے کراچی کی گاڑی ملی۔ تھرڈ کلاس میں اس زمانے میں ابھی زیادہ رش نہیں ہوا کرتا تھا۔ چنانچہ وہ بڑے آرام کے ساتھ برتھ پر چڑھ کر لیٹ گئی۔ یہ پسنجر ٹرین تھی اور اسے اگلے روز رات کو کراچی پہنچنا تھا۔

روبی کو اس ٹرین میں چھوڑ کر ہم دارا کی طرف چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کے ساتھ کیا گزری۔ جس وقت پولیس کی فائرنگ سے بدک کر دارا کا گھوڑا بے قابو ہو کر کھیتوں میں دوڑ پڑا اس وقت پولیس بھی اس کے پیچھے لگ گئی تھی۔ پولیس کی جیپ کچھ دور تک دارا کے پیچھے گئی مگر اونچی فصل کی وجہ سے وہ آگے نہ جا سکی۔ دارا ان کی گرفت سے نکل چکا تھا۔ اس نے گھوڑے کو قابو میں کر لیا تھا اور اب اپنی مرضی سے اسے کھیتوں میں بھگائے لئے جا رہا تھا۔ کھیتوں سے نکل کر اس نے گھوڑے کو ایک کچے راستے پر ڈال دیا۔ وہ ابھی تک گھوڑے کو بھگائے لئے جا رہا تھا۔ یہ علاقہ اسمگلنگ کے سلسلے میں میاں خان کی سانجھ میں اس کی آماجگاہ رہ چکا تھا اور وہ یہاں سے واقف تھا۔ روبی کے بارے میں وہ مطمئن تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح مغویہ لڑکی کو لے کر لاہور پہنچنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ میاں خان کے فارم پر دارا اس لئے نہیں جانا چاہتا تھا کہ وہ علاقہ پولیس کی نگرانی میں آ چکا تھا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ روبی کو بھی لاہور سے واپس میاں خان کے فارم میں نہیں آنا چاہئے۔ وہاں کسی بھی وقت وہ پکڑی جا سکتی تھی۔ دارا ایک بڑی نہر کے کنارے نکل آیا۔ یہ نہر آگے جا کر ساہیوال کی جانب نکل گئی تھی۔ دارا نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ نہروں نہر ساہیوال پہنچنے کی کوشش کرے اور پھر وہاں سے کوئی بھی ٹرین پکڑ کر سندھ کے علاقے میں داخل ہو جائے۔ چنانچہ اس نے نہر کنارے گھوڑے کو دلکی چال پر ڈال دیا۔ جب پو پھٹنے لگی تو دارا واردات والے علاقے سے بہت دور نکل آیا تھا مگر ساہیوال کا علاقہ ابھی کافی دور تھا۔ تھوڑی دیر میں دن نکلنے والا تھا اس علاقے میں دارا کو کوئی نہیں جانتا تھا۔ پولیس نے بھی اس کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ پنجاب پولیس کے لئے وہ اجنبی تھا۔

جب دن کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی تو دارا ریلوے لائن کا چھوٹا سا پل عبور کر کے ایک قصبے میں داخل ہو گیا۔ یہاں گاؤں کے باہر ایک تکیہ تھا جہاں اکھاڑے میں گاؤں

کے کچھ جوان کشتی لڑ رہے تھے۔ یہاں ایک کنواں بھی تھا۔ دارا نے گھوڑے کو ایک طرف باندھا۔ اسے دانہ پانی کھلایا۔ کنوئیں پر نہایا۔ تازہ دم ہوا اور قصبے کی ایک دوکان میں بیٹھ کر اس نے بند مکھن کھایا۔ چائے کا گلاس پیا۔ اسے تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کسی جگہ تھوڑی دیر سو جانا چاہتا تھا مگر اس میں خطرہ بھی تھا۔ شیخوپورہ پولیس نے ٹیلی فون پر ساہیوال ضلع کی پولیس کو بھی قتل کی وارداتوں اور دارا کے فرار ہو جانے کی اطلاع کر دی ہو گی۔ وہاں اس کی شکل سے کوئی بھی واقف نہ تھا پھر بھی اسے اجنبی کی حیثیت سے پولیس پوچھ گچھ کے لئے کہیں بھی روک سکتی تھی۔ مگر اسے بڑی نیند آ رہی تھی۔ وہ گھوڑے کے پاس ہی درخت سے ٹیک لگا کر سو گیا۔ وہ دو گھنٹے تک سویا رہا۔ جب آنکھ کھلی تو اکھاڑے میں کشتی لڑنے والے جوان جا چکے تھے اور کنوئیں کے پاس ایک فقیر بیٹھا چلم کے واسطے آگ جلا رہا تھا۔ دو گھنٹے کی نیند سے دارا کی تھکاوٹ کافی حد تک دور ہو گئی تھی۔ اس نے فقیر سے کوئی بات نہ کی اور گھوڑے پر بیٹھ کر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

دوپہر کے وقت وہ ایک ریلوے اسٹیشن پر پہنچا پتا کرنے پر معلوم ہوا کہ کراچی جانے والی گاڑی ایک گھنٹے بعد آئے گی اور یہاں یہ گاڑی تھوڑی دیر کے لئے رکتی ہے۔ دارا نے وہیں اسٹیشن سے باہر ایک ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ گھوڑے کو اس نے کچھ فاصلے پر ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا تھا۔ یہاں اسے گھوڑے سے الگ ہو جانا تھا۔ اب اسے گھوڑے کی ضرورت نہیں تھی۔ کراچی کا ٹکٹ خرید کر وہ پلیٹ فارم پر آ کر بیٹھ گیا اور گاڑی کا انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ٹرین آ گئی جس میں بڑا رش تھا۔ دارا ایک ڈبے میں چڑھ گیا۔ یوں ٹرین میں سفر کرتا وہ اگلے روز منہ اندھیرے کراچی پہنچ گیا۔ یہ اس کا اپنا شہر تھا مگر یہاں کی پولیس بھی۔ اس کی کھوج میں تھی۔ ابھی پوری طرح سے دن کی روشنی نہیں ہوئی تھی۔ دارا نے موقع غنیمت جانا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے ڈیرے سے تھوڑی دور ٹیکسی سے اتر گیا۔ یہاں ایک گلی میں اس کے دوست کا گھر تھا۔ وہ وہاں آ گیا۔ دوست اسے دیکھ کر گھبرایا۔ دارا نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گا۔ تم صرف اتنا کرو کہ میرے گھر جا کر بخشو سے کہو کہ مجھے تھوڑی دیر کے لئے آ کر مل جائے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوست اسی وقت دارا کے گیراج والے پرانے گھر کی طرف چل دیا۔ دس منٹ بعد بخشو چاچا دارا کے پاس بیٹھا اسے تمام احوال بتا رہا تھا۔ دارا نے بخشو سے روبی کے بارے میں پوچھا کہ وہ تو ادھر نہیں آئی اور شیر خان کا کیا حال ہے بخشو کہنے لگا۔

"روبی کو ادھر پھر نہیں دیکھا۔ شیر خان ابھی تک اسی مکان میں رہ رہا ہے مگر سنا ہے کہ سہراب کا بڑا بھائی ہاشم اس سے اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لینے کی فکر میں ہے۔"

دارا کا چہرہ متفکر ہو گیا کیونکہ شیر خان اکیلا نہیں تھا اس کے ساتھ اس کی اور روبی کی معصوم بیٹی عائشہ بھی تھی۔ جو شیر خان کی زندگی خطرے میں ڈال سکتی تھی۔ بخشو کہنے لگا۔

"مگر چونکہ ابھی پولیس روبی کی گرفتاری کے سلسلے میں اس کے خاوند شیر خان کے گھر کی نگرانی کر رہی ہے اس لئے ہاشم بدمعاش کے آدمی شیر خان پر ہاتھ ڈالنے سے گریز کر رہے ہیں۔ جونہی پولیس والے وہاں سے ہٹے ہاشم شیر خان اور اس کی بچی دونوں کو قتل کر دے گا۔"

دارا چپ رہا۔ پھر اس نے اپنی ماں کے بارے میں پوچھا۔ بخشو نے کوئی جواب نہ دیا۔ دارا نے آنکھیں سکیڑ کر بخشو کی طرف دیکھا اور کہا۔

"تم خاموش کیوں ہو چاچا۔ کیا بات ہے؟"

تب بخشو کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اس نے بتایا کہ دارا کی والدہ کو فوت ہوئے کئی دن ہو گئے ہیں۔ دارا نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور بچوں کی طرح سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ بخشو کہہ رہا تھا۔

"اماں جیل میں ہی بیمار ہو گئی تھی۔ اسے اسپتال بھی لے جایا گیا مگر اللہ کو یہی منظور تھا۔" دارا نے پوچھا۔

"ماں کو کہاں دفن کیا ہے؟ بخشو نے کہا۔

"پرانے پل والے قبرستان میں چل کر فاتحہ پڑھ لو۔ وہ مرتے وقت تمہیں بہت یاد کر رہی تھی۔"

دارا کو اپنی ماں کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لئے پورا دن کسی محفوظ جگہ پر گزارنا تھا۔ وہ اپنے جس شریف دوست کے گھر پر اس وقت موجود تھا وہ ڈر رہا تھا کہ کسی نے دارا کو وہاں

دیکھ لیا تو پولیس اسے بھی تھانے لے جائے گی۔ دارا کو اس حقیقت کا احساس تھا اور وہ کسی شریف آدمی کے لئے مصیبت نہیں بننا چاہتا تھا..... بخشو نے کہا۔

"بیٹا تم اکیلے کہاں جاؤ گے اب؟" دارا نے بے نیازی سے جواب دیا۔ "کہیں دن گزار لوں گا۔ یہاں میرا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔"

بخشو چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد دارا نے بھی اپنے دوست کا شکریہ ادا کیا۔ وہاں سے چادر کی بکل مار کر نکلا تو رکشے میں سوار ہو کر سیدھا کراچی سٹی ریلوے اسٹیشن پر آ گیا۔ یہاں اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر ایک ہوٹل میں اس نے ناشتہ کیا۔ تھوڑا وقت وہاں گزارا اور اسی معمولی سے ہوٹل میں ایک کمرہ کرائے پر لے لیا اور سارا دن کمرے میں پڑا رہا۔ جب شام ہو گئی تو ہوٹل سے نکلا۔ رکشا لیا اور سیدھا پرانے قبرستان میں آ گیا۔ بخشو چاچا وہاں پہلے سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ دارا کو اس کی ماں کی قبر پر لے گیا۔ ماں کی قبر کو دیکھ کر دارا ہچکیاں لے لے کر رونے لگا اور ماں کی قبر سے لپٹ گیا۔ جب ذرا طبیعت بحال ہوئی تو فاتحہ پڑھ کر ماں کی روح کو ثواب پہنچایا اور بخشو سے کہنے لگا۔

"چاچا! میں ایک مفرور قاتل ہوں۔ چاہے میں نے اپنے وطن کی بہنوں کی عزت بچاتے ہوئے بدمعاشوں کا خون کیا ہے مگر بہرحال میں قاتل ہوں اور قانون کو میری تلاش ہے۔ میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔" بخشو نے پوچھا۔

"پھر تم کہاں جاؤ گے بیٹا؟"

دارا کچھ سوچتا رہا۔ وہ قبرستان سے باہر آ گئے۔ شام کا اندھیرا رات کی تاریکی میں گھل مل گیا تھا۔ دور شہر کراچی کی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ وہ دونوں قبرستان کی ٹوٹی پھوٹی دیوار کے پاس ایک شکستہ چبوترے پر بیٹھ گئے۔ دارا کہنے لگا۔

"شاید مجھے میری ماں کی قبر کھینچ کر یہاں لے آئی تھی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ علاقہ غیر کی طرف نکل جاؤں لیکن جانے سے پہلے میں اپنی بہن روبی کی بیٹی عائشہ اور شیر خان کی خیریت ضرور معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس جو رقم ہے میں یہ رقم شیر خان کو دے دینا چاہتا ہوں تاکہ وہ اپنی بچی کی اچھی طرح پرورش کر سکے۔" بخشو نے کہا۔

"مگر شیر خان کے گھر کے آس پاس بھی سی آئی ڈی والے موجود رہتے ہیں۔ روبی بھی

تو قتل کر کے بھاگی ہوئی ہے۔ اس نے تو جیل بھی توڑی تھی۔ پولیس نے تمہیں وہاں دیکھ لیا تو معاملہ الٹ جائے گا۔" دارا نے انگلی سے بھر بھری زمین پر رات کے اندھیرے میں لکیریں بناتے ہوئے کہا۔

"یہ خطرہ تو مجھے مول لینا ہی ہو گا۔ شیر خان سے ملنا اس کی بچی کی خیریت معلوم کرنا بھی ضروری ہے۔"

بخشو آگے سے کچھ کہنے لگا تو دارا نے اسے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"چاچا تم اس میں دخل نہ دو یہ میرا اور ایک ایسی لڑکی کی اولاد اور اس کے خاوند کا معاملہ ہے جس کو میں نے بہن کہا ہے اور جو مجھے اب اپنی سگی بہن ہی کی طرح عزیز ہے تم اب جاؤ۔ آگے میں جانوں اور میرا کام۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بخشو' دارا کو وہاں اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ مگر دارا نے اسے وہاں سے واپس بھیج دیا۔ بخشو کے جانے کے بعد دارا قبرستان سے نکلا۔ ویران اندھیری سڑک پر آیا اور شہر کی طرف چلنا شروع کر دیا وہ اپنے ہوٹل سے شیر خان کے مکان پر جانا چاہتا تھا۔ اسے ایک خالی رکشہ مل گیا جس میں بیٹھ کر وہ اپنے ہوٹل میں آگیا۔ وہ غافل نہیں تھا۔ اس کی تجربہ کار ہوشیار آنکھیں اپنے ارد گرد کا باقاعدہ جائزہ لے رہی تھیں کہ کہیں کوئی خفیہ پولیس کا آدمی اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا۔ ایسے آدمیوں کو پہچاننے میں دارا نے کبھی غلطی نہیں کی تھی۔ ابھی تک کوئی اس کا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔ ہوٹل کے کمرے میں ہی اس نے رات کا کھانا کھایا۔ پھر جب رات گہری ہو گئی تو کمرے کو تالا لگایا۔ چادر کی بکل ماری۔ خاموشی سے اجنبی مسافروں کی طرح ہوٹل کے سامنے سے ایک رکشہ پکڑا اور اسے ایک خاص علاقے کی طرف چلنے کو کہا۔ شیر خان کے محلے تک دارا نے تین سواریاں بدلیں۔ اب وہ پیدل تھا اور ایک جگہ پرانی بلڈنگ کی اوٹ میں ہو کر شیر خان کی گلی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

جب اس نے پوری تسلی کر لی کہ کم از کم اس وقت وہاں پولیس کا کوئی آدمی موجود نہیں ہے تو اللہ کا نام لے کر بلڈنگوں کے ساتھ ساتھ چلتا شیر خان کے مکان پر آگیا۔ دو تین بار دروازہ کھٹکھٹانے پر شیر خان نے دروازہ کھول دیا۔ دارا جلدی سے اندر گھس گیا۔ شیر خان نے بھی اسے پہچان لیا تھا دروازے کو کنڈی لگاتے ہوئے شیر خان نے پوچھا۔

"تمہیں کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

"کیا کہہ سکتا ہوں شیر خان۔" دارا نے کندھے سکیڑتے ہوئے کہا۔ "میرا تو یہی خیال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے کہ کسی نے نہیں دیکھا ہو گا۔"

شیر خان نے دارا کو کرسی پیش کی اور کھانے کا پوچھا۔ دارا نے کہا۔

"میں کھا آیا ہوں۔"

شیر خان چارپائی پر بیٹھ گیا اور روبی کے بارے میں پوچھنے لگا کہ وہ کہاں ہے۔ کس حال میں ہے وہ کہاں ماری ماری پھر رہی ہے۔ مجھے یہ ہرگز گوارا نہیں میں بھی اس کے ساتھ شامل ہونا چاہتا ہوں۔ شیر خان کو روبی کے عزائم اور دیگر سب حالات کا علم تھا۔ اس نے یہاں جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

"شیر بھائی! میری بہن اس وقت میرے ایک جگری دوست کے مکان پر ہے۔ میں وہیں سے آرہا ہوں۔ اور تم سے ملنے کے بعد روبی کے پاس ہی جاؤں گا۔ بچی کہاں ہے۔"

شیر خان نے سانس بھر کر کہا۔

"ہماری ہمسائی مریم کے پاس ہے میں بچی کی کیسے دیکھ بھال کر سکتا ہوں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس قسم کے حالات پیدا ہو گئے ہیں۔ پولیس مسلسل میرے پیچھے لگی ہے۔ اس کا خیال ہے روبی مجھ سے ملنے اپنی بچی کو دیکھنے یہاں آتی ہے۔ اسے کیا معلوم کہ روبی نے تو پھر خبر ہی نہیں لی۔" دارا نے فوراً کہا: "شیر بھائی! ایسا نہ کہو۔ روبی تمہیں اور اپنی بچی کو ہر وقت یاد کرتی ہے۔" شیر خان نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

"تو پھر ہمیں یہاں اکیلا کیوں چھوڑ گئی ہے۔"

شیر خان دارا کا ہاتھ پکڑ کر بولا: "مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو میں ابھی بچی کو ساتھ والے مکان سے لے آتا ہوں۔ اب ہم اکٹھے رہیں گے۔ اکٹھے جیئیں گے۔ اکٹھے مریں گے۔ میں آخر مرد ہوں۔ کوئی بکری نہیں ہوں۔"

شیر خان سخت جذباتی ہو رہا تھا دارا نے اس کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا اور کہا:

"شیر خان! یہ جذبات کا معاملہ نہیں ہے۔ تمہارے بہادر مرد ہونے میں کسی کو شک نہیں لیکن حالات وہ نہیں ہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ اگر بچی نہ ہوتی تو پھر تمہارے یہاں پڑے رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ تم بچی کو ساتھ لے کر بھی روبی کے پاس جا سکتے

ہو۔ لیکن کیا تم نہیں جانتے کہ روبی اپنی بیٹی کو جرائم کی دنیا سے دور رکھنا چاہتی ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس کی پرورش قتل و غارت گری کے ماحول سے دور رہ کر کی جائے۔ اور تم ایک باپ کی حیثیت سے روبی کی یہ خواہش بڑی خوش اسلوبی سے پوری کر سکتے ہو۔ باقی جہاں تک روبی کا تعلق ہے وہ میرے پاس ہے میری حفاظت میں ہے۔ اپنے بھائی کی حفاظت میں ہے۔ ذرا سوچو اگر وہ یہاں آگئی یا تم اس کے پاس چلے آئے اور پولیس نے اسے پکڑ لیا تو پولیس تمہیں بھی نہیں چھوڑے گی۔ تم بھی گرفتار کر لئے جاؤ گے۔ تو پھر تمہاری بچی کا کیا بنے گا؟ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری اور روبی کی بیٹی جیل کی چار دیواری میں اپنی زندگی کا آغاز کرے؟ نہیں۔ یقیناً تم ایسا نہیں چاہو گے۔ تو بس اس کے لئے تمہیں سینے پر پتھر رکھنا ہو گا اور شریفانہ ماحول میں رہ کر اپنی بیٹی عائشہ کی پرورش کرنی ہو گی۔ یہی روبی کی بھی خواہش ہے۔" شیر خان نے تلخ لہجے میں کہا۔

"لیکن یہ ڈراما کب تک چل سکے گا؟ مجھے کب تک روبی سے جدا رہنا ہو گا۔ کیا میری بچی اپنی ماں کی شفقت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائے گی جب کہ اس کی ماں مری نہیں ہے زندہ ہے۔"

شیر خان سچا تھا۔ دارا کو اس کے جذبات کی قدر تھی مگر صورتحال کچھ ایسی پیچیدہ ہو گئی تھی کہ وہ بچی کو ساتھ لے کر یا اسے کسی ہمسائی کے رحم و کرم پر چھوڑ کر خود اپنی بیوی کے پاس نہیں رہ سکتا تھا جب کہ روبی اپنی بیٹی کی پرورش کے بارے میں بے حد سنجیدہ اور محتاط تھی۔ اس کا احساس دارا کو بھی اس دوران ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس نے بڑی مشکل سے شیر خان کو سمجھایا اسے صورت حال کی نزاکت سے آگاہ کیا اور یہ جھوٹ بھی بول دیا کہ روبی کا ارادہ ہے کہ ہم کسی مناسب موقع پر بچی کو ساتھ لے کر ملک سے باہر نکل جائیں۔

شیر خان نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"وہ سب کچھ کرے گی مگر پاکستان نہیں چھوڑے گی۔ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں اور دارا بھائی! پاکستان میں بھی نہیں چھوڑنا چاہتا۔ یہی ہمارا سب کچھ ہے۔ اب ہمیں یہیں جینا مرنا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اچانک باہر کچھ کھٹکا ہوا۔ دونوں خاموش ہو گئے۔ دارا نے جلدی سے صدری کی جیب میں سے پستول نکال لیا اور نیچی آواز میں شیر خان سے کہا۔

"کوئی باہر کھڑا ہے۔" یہ کہہ کر دروازے کی جانب دیوار سے لگ گیا۔ شیر خان نے آہستہ سے دروازے کا پٹ کھول کر گلی میں جھانک کر دیکھا۔ ایک بلی اس کے دروازے کے آگے سے دوسری طرف بھاگ گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور دارا کو آہستہ آواز میں بتایا۔

"بلی تھی۔ آجاؤ۔" دارا نے پستول جیب میں رکھ لیا اور واپس آکر چارپائی پر بیٹھ گیا پھر اس نے صدری کی دوسری بڑی جیب میں سے سو سو روپے کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور اسے شیر خان کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ "شیر بھائی! اسے اپنے پاس رکھ لو۔ تمہیں ان روپوں کی ضرورت ہو گی۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔ جب کبھی تمہارے پاس ہوں تو واپس کر دینا۔" شیر خان نے کمرے کے کمزور بلب کی روشنی میں نوٹوں کی گڈی پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر دارا کے ہاتھ کو پیچھے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا شکریہ۔ مگر مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔"

دارا شیر خان کے مزاج کو جانتا تھا اس نے واجبی سا اصرار کیا مگر شیر خان نے روپے لینے سے صاف انکار کر دیا اور طنزیہ انداز میں کہنے لگا۔

"شاید تم نہیں جانتے کہ اتنے پیسے کبھی میرے نوکر اپنے پاس رکھا کرتے تھے۔ مگر مجھے جب بھی دولت سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ تمہاری ہمدردی کا شکریہ لیکن آئندہ مجھ سے اس قسم کی ہمدردی کا اظہار مت کرنا۔"

شیر خان بے زار سا ہو کر چارپائی سے اٹھا اور اس نے سگریٹ سلگا لیا اور چارپائی پر سر نیچا کر کے سگریٹ پینے لگا پھر خود بخود ہی بولا۔

"جیسے بھی حالات ہیں یہ زیادہ دیر نہیں چلے گا۔ میری طرف سے روبی کو کہہ دینا کہ مجھے یہ گوارا نہیں ہے میں عائشہ کو لے کر اس کے پاس پہنچنے والا ہوں۔" یہ سوچ کر کہ روبی کا تو کوئی مستقل ٹھکانہ ہی نہیں دارا نے کہہ دیا۔

"ٹھیک ہے شیر بھائی۔ میں تمہارا پیغام روبی بہن کو پہنچا دوں گا۔" پھر اس نے موضوع کو بدلتے ہوئے شیر خان سے سہراب کے بھائی اور شہر کے مشہور غنڈے ہاشم کے بارے میں پوچھا کہ وہ اسے پریشان تو نہیں کر رہا؟ شیر خان کا حلق جیسے کڑوا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ایسے تاثرات ابھر آئے جیسے اسے کسی پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ کہنے لگا۔

"وہ گیدڑ مجھے کیا پریشان کرے گا۔ بس اس بے زبان عائشہ نے شیر خان کے ہاتھ باندھ دیئے ہیں۔"

باہر گلی میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ جیسے کوئی تیزی سے گزر گیا ہو۔ دارا جلدی سے اٹھا۔ پستول اس نے ایک بار پھر نکال لیا اور بولا۔

"بتی بجھا دو۔ کیا پیچھے سے کوئی راستہ باہر جاتا ہے؟" شیر خان نے بتی گل کر دی اور کہا۔

"پیچھے کوئی راستہ نہیں ہے۔ کوئی بات نہیں۔ یہ کہہ کر دارا نے دروازے کا پٹ کھول کر گلی میں دیکھا۔ گلی رات کے سناٹے میں دور تک خالی تھی۔ وہ تیزی سے نکل گیا۔ شیر خان نے دروازہ بند کر لیا۔ دارا گلی میں سے نکل کر اس جگہ آگیا جہاں سے بڑی سڑک گزرتی تھی اور کچھ فاصلے پر سینما کی بلڈنگ تھی۔ اس کو شبہ تھا کہ پولیس کے آدمی نے اسے دیکھ لیا ہے اور ہو سکتا ہے کسی طرف سے اچانک پولیس پارٹی نکل کر اس پر ہلہ بول دے۔ مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ بڑی سڑک پر آیا تو دیکھا کہ ایک طرف بند جیپ کھڑی ہے۔

دارا وہیں ٹھٹک گیا ضرور یہ پولیس کی جیپ ہے وہ پیچھے مڑنے ہی لگا تھا کہ اسے کسی عورت کی چیخ نما دہائی سنائی دی۔ وہ مدد کے لئے پکار رہی تھی۔ دارا کے قدم وہیں رک گئے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا یہاں اسٹریٹ لائٹ نہیں تھی۔ کچھ فاصلے پر کسی بلڈنگ کے کونے پر ایک بلب جل رہا تھا۔ جس کی بہت کم روشنی جیپ تک پہنچ رہی تھی۔ دارا نے دیکھا کہ جیپ میں سے ایک آدمی نکلا اور سامنے والی گلی کی طرف دوڑا گلی میں اسی عورت کی آواز پھر سنائی دی وہ روتے ہوئے بچاؤ بچاؤ پکار رہی تھی۔ بلڈنگ کی دوسری منزل پر دو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تین کھڑکیاں کھلیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے جھانک کر گلی میں دیکھا گلی میں فائر کی آواز گونجی اور ساری کھڑکیاں یکے بعد دیگرے بند ہو گئیں۔ اتنے میں دارا کیا دیکھتا ہے کہ تین غنڈہ نما آدمی ایک شلوار قمیص والی عورت کو گلی میں سے گھسیٹتے ہوئے باہر جیپ کی طرف لا رہے ہیں۔ جو آدمی جیپ میں سے نکل کر گیا تھا پستول کا ہوائی فائر اس نے کیا تھا تاکہ محلے کے کسی شریف آدمی کو مداخلت کرنے کی جرات نہ پڑے۔ پستول تو دارا کے ہاتھ میں بھی تھا۔

عورت تڑپ رہی تھی۔ اور غنڈوں کے ہاتھوں سے نکل جانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ رو رو کر دہائی دے رہی تھی۔ ان سے رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ اپنی عزت کا واسطہ دے رہی تھی۔ مگر چاروں بدمعاشوں میں سے کسی ایک پر بھی اس کی گریہ زاری کا اثر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اسے کھینچتے ہوئے جیپ کے پاس لے آئے۔ عورت کا دوپٹہ سڑک پر گر گیا تھا ایک غنڈے نے عورت کے منہ پر زور سے طمانچہ مارا۔ اسے گالی دی۔ عورت سسکیاں لینے لگی۔ دوسرے غنڈے نے عورت کو کاندھے پر ڈال لیا۔ جیپ کا دروازہ کھلا تھا وہ جیپ کی طرف آ رہے تھے دارا جیپ کی آڑ میں بالکل تیار کھڑا تھا جب چاروں کے چاروں غنڈے بے بس عورت کو اٹھائے جیپ کے پاس آئے تو دارا اوٹ میں سے نکل کر ان کے سامنے آ گیا پستول والا ہاتھ اس نے اپنی چادر کے اندر چھپا رکھا تھا۔ ایک اجنبی شخص کو اچانک سامنے دیکھ کر غنڈوں پر کوئی زیادہ اثر نہ ہوا۔ انہوں نے عورت کو جیپ میں ڈالا۔ جس کے پاس پستول تھا اور جس نے گلی میں فائر کیا تھا وہ دارا کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

"کون ہو تم؟ بھاگو یہاں سے .....؟" دارا نے بڑی پرسکون آواز میں کہا۔

"اس عورت کو چھوڑ دو۔" ایک بدمعاش چاقو نکال کر دارا کی طرف بڑھا۔

"تم باپ لگتے ہو اس کے .....؟"

جونہی اس نے دارا پر چاقو کا وار کیا دارا نے پستول والا ہاتھ چادر سے باہر نکالا اور بڑے اطمینان سے اس بدمعاش کے سینے میں اوپر تلے دو گولیاں اتار دیں۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ دوسرے بدمعاش دارا پر جھپٹے دارا کے پستول سے نکلی ہوئی دو گولیوں نے ان دونوں کو بھی وہیں ڈھیر کر دیا۔ جس بدمعاش کے پاس پستول تھا اس نے دارا پر فائر کیا دارا اس سے پہلے ہی باخبر تھا وہ بھاگ کر جیپ کے سامنے کی طرف آ گیا۔ جونہی آخری غنڈے نے پستول والا ہاتھ دارا کی طرف اٹھایا دارا کے قیمتی پستول میں سے آخری گولی دھماکے سے نکلی اور آخری بدمعاش کی کھوپڑی کو پھاڑتی ہوئی نکل گئی۔

عورت جیپ کے اندر سہمی بیٹھی یہ سارا خونیں ڈراما دیکھ رہی تھی۔ دارا نے سڑک پر پڑا پستول اٹھا لیا یہ غنڈے کی لاش کے پاس پڑا ہوا تھا اس پستول میں ابھی کچھ گولیاں باقی تھیں۔ دارا کے پستول کا میگزین ختم ہو چکا تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے اپنا پستول جیب میں رکھ لیا بھرا ہوا پستول اپنے ہاتھ میں ہی رکھا اور جیپ کے کھلے دروازے میں آ کر عورت سے کہا

"بی بی! آپ اپنے گھر چلی جائیں۔ اب کوئی آپ کی عزت پر حملہ نہیں کرے گا۔"

جیپ میں جو عورت بیٹھی تھی اب وہ اپنے حواس میں تھی۔ اس نے احسان مند نظروں سے دارا کو دیکھا اور ہاتھ باندھ کر کہا۔

"خدا کے لئے مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ یہاں میرا گھر نہیں ہے۔ یہ لوگ مجھے اغوا کر کے یہاں لائے تھے۔"

دارا نے چوک میں ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ چاروں لاشیں سڑک پر خون میں لت پت پڑی تھیں۔ شریف لوگوں نے ڈر کے مارے مکانوں کی کھڑکیاں بند کر رکھی تھیں مگر درزوں میں سے رات کے نیم اندھیرے میں یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

"تمہارا گھر کہاں ہے بی بی؟ مجھے بتاؤ۔ میں تمہیں وہیں لیے چلتا ہوں۔" عورت نے کہا۔

"مجھے یہاں سے لے چلو۔ میں تمہیں بتا دوں گی۔" دارا جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا۔ جیپ اسٹارٹ کی اور اسے سڑک پر ڈال دیا۔ آگے دوسرا چوک آیا تو اس نے عورت سے پوچھا اب کس طرف چلنا ہے۔ عورت نے ہاتھ سے ایک طرف مڑنے کا اشارہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کیا۔ جیپ پوری رفتار سے جا رہی تھی۔ جب کراچی شہر کی روشنیاں کافی پیچھے رہ گئیں تو دارا نے سڑک کی ایک طرف گاڑی کھڑی کر دی اور عورت سے پوچھا۔

"تم کہاں جانا چاہتی ہو۔" عورت نے ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ عاجزانہ لہجے میں بولی۔

"خدا کے لئے مجھے یہاں راستے میں مت چھوڑنا۔ ان لوگوں کے آدمی مجھے یہاں سے بھی اٹھا کر لے جائیں گے۔" دارا نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

"مگر بی بی تمہیں جانا کہاں ہے۔ ہم تو شہر سے کافی باہر نکل آئے ہیں۔ یہاں تو آگے کوئی آبادی نہیں ہے۔"

تب اس عورت نے ایک شہر کا نام لے کر دارا کو بتایا کہ وہ وہاں کی رہنے والی ہے اور یہ بدمعاش اسے وہیں سے اغوا کر کے کراچی لائے تھے اور اب اسے لانچ میں ڈال کر کویت لے جانے والے تھے شہر کا نام سن کر دارا سوچ میں پڑ گیا۔ (چونکہ ان واقعات کا تعلق حقیقت سے ہے اس لئے ہم اس شہر کا یہاں نام نہیں لکھیں گے) یہ شہر کراچی اور بہاولپور کے درمیان واقع ہے۔ دارا شش و پنج میں پڑ گیا۔ وہ اس مظلوم خاتون کو ویران علاقے میں اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اب ہر حالت میں اسے اس مظلوم عورت کو اس کے گھر پہنچانا تھا۔ عورت نے آنسو بہاتے ہوئے ایک بار پھر دارا کی منت کی اگر اس نے اس کو بدمعاشوں سے نجات دلائی ہے تو اسے اس کی ماں کے پاس بھی پہنچا دے۔ اس کا بھی رو رو کر برا حال ہو رہا ہو گا۔ دارا نے کوئی جواب نہ دیا۔ سڑک پر ٹریفک بالکل نہیں تھی۔ یہ مقتول غنڈوں کی جیپ تھی۔ دارا نے اتر کر پٹرول چیک کیا۔ ٹینکی قریباً بھری ہوئی تھی۔ اس نے جیپ اسٹارٹ کی اور اسے اپنے اندازے سے ایک علاقے سے گزر کر ہائی وے پر لے آیا۔ ہائی وے پر رات کے وقت ٹرکوں اور ٹریلروں کی ٹریفک جاری تھی۔ دارا بھی جیپ کو خاصی رفتار سے لئے جا رہا تھا۔ جس شہر کا مظلوم عورت نے نام لیا تھا وہاں جیپ کو دن نکلنے سے پہلے پہنچنا تھا۔ دارا کو ایک ہی خطرہ تھا کہ کہیں راستے میں وہ پولیس کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ کیونکہ پیچھے وہ مزید چار غنڈوں کو قتل کر آیا تھا جس کی خبر پولیس کو ہو چکی ہو گی اور پولیس نے ہائی وے اسکواڈ کو وائرلیس کے ذریعے خبردار کر دیا ہو گا۔ مگر دارا کا یہ

خدشہ درست نہیں تھا کیونکہ پولیس ابھی جائے واردات پر بھی نہیں پہنچی تھی۔ وہ جیپ کو اڑائے لئے جا رہا تھا۔ وہ مظلوم عورت کو اس کے گھر پہنچانا اپنا انسانی فرض سمجھتا تھا۔ اس نے ایک دفعہ گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ مظلوم عورت جیپ کی سیٹ پر سمٹی شاید سو رہی تھی دارا نے خدا کا شکر ادا کیا کہ خدا نے اسے اتنی توفیق دی کہ وہ ایک مظلوم عورت کی عزت بے رحم درندہ صفت غنڈوں سے بچانے میں کامیاب ہوا۔

دارا کو نیند آنے لگی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے ایک دو بار وہ اونگھ گیا تھا اور اسٹیرنگ اس کی گرفت سے آزاد ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ اس نے ایک جگہ اندھیرے میں درختوں کو دیکھ کر جیپ سڑک سے اتاری اور درختوں کے نیچے کھڑی کر دی۔ عورت کی آنکھ کھل گئی اس نے اپنے شہر کا نام لے کر پوچھا کیا اس کا شہر آگیا؟ دارا نے کہا۔

"نہیں بی بی! یہاں میں تھوڑی دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ تم سو جاؤ۔"

دارا جیپ سے اتر کر ایک جگہ زمین پر لیٹ گیا۔ وہ دیر تک پہلو بدلتا رہا۔ نیند بالکل غائب ہو گئی تھی۔ آخر وہ اٹھا اور جیپ میں آکر بیٹھ گیا۔ عورت جاگ رہی تھی۔ دارا نے کہا۔

"تمہارا شہر یہاں سے ابھی کافی دور ہے۔ فکر نہ کرو۔ تمہیں تمہارے گھر پہنچا کر ہی آؤں گا۔"

عورت نے دارا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کی بہادری کی تعریف کی۔ جیپ ایک بار پھر کراچی سے لاہور جاتی سڑک پر بھاگنے لگی۔ انہیں راستے میں ہی صبح ہو گئی۔ جب دن کی روشنی پھیلنے لگی تو دارا نے سوچا کہ کسی طرح سے اب اس جیپ سے نجات حاصل کرنی ہو گی۔ کیونکہ یہ ان غنڈوں کی جیپ تھی جن کو وہ قتل کر کے آرہا تھا اگر موقع واردات پر کسی نے جیپ کا نمبر دیکھ لیا ہو گا تو پولیس ہائی وے پر اسے پکڑ لے گی کیونکہ اب تک پولیس نے ہائی وے پر گشت کرنے والی پولیس پارٹی کو خبر کر دی ہو گی۔ یہ جیپ گویا قاتل کا سراغ تھا جو دارا کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ وہ جیپ کو ہائی وے سے اتار کر ایک طرف لے آیا۔ یہاں سنگلاخ ریتلے اونچے نیچے بے شمار ٹیلے تھے۔ اس نے جیپ ایک ٹیلے کی

اوٹ میں کھڑی کر دی۔ عورت سیٹ پر سو رہی تھی۔ دارا کچھ حیران ضرور ہوا کہ یہ عورت اتنے اطمینان سے کیسے سو رہی ہے۔ اس نے عورت کو جگا کر ساری بات سمجھائی۔ وہ جیپ سے اتر پڑی۔ دارا نے جیپ کی تلاشی لی اسے ڈیش بورڈ میں سوائے سگریٹ کے ایک بند پیکٹ کے اور کوئی چیز نہ ملی۔ اب سورج طلوع ہونے والا تھا اور آسمان گلابی روشنی میں منور ہو گیا تھا۔ دارا نے جیپ کی ٹینکی کا ڈھکن اتارا اور اس کے اندر چیتھڑا اس طرح ڈال دیا کہ اس کا آدھا حصہ پٹرول کی ٹینکی سے باہر نکلا ہوا تھا۔ کچھ پٹرول اس نے اسی چیتھڑے کی مدد سے جیپ کے انجن اور سیٹوں پر بھی نچوڑ دیا۔ پھر جیپ کو آگ لگائی اور عورت کو ساتھ لے کر وہاں سے دوڑ کر ٹیلے کی دوسری طرف آگیا۔ جیپ نے آگ پکڑ لی تھی۔ مگر ابھی تک دھماکہ نہیں ہوا تھا۔ دونوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے ہائی وے پر آگئے جہاں اب تھوڑی تھوڑی دیر بعد دونوں جانب سے سامان کے لدے ہوئے ٹرک آتے جاتے نظر آنے لگے تھے۔

دارا کی نگاہیں ٹیلے کی طرف لگی تھیں جہاں سے دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔ پھر ایک ہلکا سا دھماکہ ہوا۔ اور جیپ کی ٹینکی پھٹ گئی تھی اور جیپ دھڑا دھڑ جلنے لگی تھی۔ یہاں سے انہوں نے ایک بس کے ذریعے اپنی منزل تک سفر کیا۔ وہ عورت جس نے دارا کو اپنا نام دلشاد بتایا تھا شہر آنے سے پہلے تھوڑا پیچھے بس سے اتر گئی۔ دارا یہی سمجھا کہ اس کا گھر شہر کی کسی مضافاتی بستی میں ہو گا۔ وہ دارا کو ساتھ لئے کھیتوں میں سے گزر رہی تھی۔ یہ چھوٹا شہر تھا۔ زمین زیادہ تر ریتلی تھی۔ کھیتوں میں فصل اگی ہوئی تھی۔ اور ریلوے اسٹیشن پر کھڑی گاڑی کے انجن میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ ابھی کوئلے کے انجن والی گاڑیاں چلا کرتی تھیں۔ سامنے شہر کی ٹوٹی ہوئی دیوار آگئی جہاں سے ایک چڑھائی چڑھ کر وہ شہر کی ایک گلی میں داخل ہو گئے۔ دارا اس شہر میں کئی بار آچکا تھا۔ جب گلی گھوم کر ایک ذرا کشادہ بازار آیا تو دارا کا ماتھا ٹھنکا۔ یہ اس شہر کا بدنام علاقہ تھا۔ یعنی جہاں راتیں جاگتی تھیں اور دن سوتے تھے۔ جہاں رات گئے تک مجرا ہوتا تھا۔ یہ طوائفوں کا بازار تھا۔ دلشاد ایک گلی میں مڑ گئی۔ سامنے ایک دو منزلہ مکان تھا۔ مکان کی ڈیوڑھی میں داخل ہونے کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بعد دلشاد نے دارا کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔

"تم سمجھ گئے ہو گے کہ میں کون ہوں۔ مگر میں تمہیں اپنی ماں سے ملائے بغیر یہاں سے نہیں جانے دوں گی۔"

دارا اب اچھی طرح سے سمجھ گیا تھا کہ یہ عورت دلشاد ایک طوائف ہے جسے بدمعاش اغوا کر کے لے گئے تھے۔ اتنے میں وہاں شور مچ گیا کہ شاداں آگئی شاداں آگئی۔ دارا کے لئے بیٹھک کھول دی گئی جہاں ایک پلنگ اور ایک میلا سا صوفہ پڑا تھا۔ شاداں کی ماں بھی آگئی۔ اس نے دارا کی بلائیں لے کر اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔

"بیٹا تم نے میری بیٹی کو غنڈوں سے بچا کر مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ جسے میں ساری عمر نہیں بھلا سکوں گی۔" دارا نے صوفے پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ مجھے واپس بھی جانا ہے دلشاد کی ماں نے دارا کو بازو سے پکڑ کر صوفے پر زبردستی بٹھا دیا اور کہنے لگی۔ "مجھے اپنے پیر مرشد کی قسم ہے میں تمہیں ایسے نہیں جانے دوں گی۔ تم آج رات ہمارے پاس ہی رہو گے۔ کل بے شک چلے جانا۔ میں تمہارے لئے ناشتا بھجواتی ہوں تم منہ ہاتھ دھو لو۔ یہ ساتھ ہی غسل خانہ ہے۔" یہ کہہ کر دلشاد کی ماں چلی گئی۔

دارا سوچنے لگا کہ دن کی روشنی میں اس کا وہاں سے نکلنا ویسے بھی مناسب نہیں رہے گا۔ بہتر ہے کہ وہ دن اسی مکان میں گزار دے اور جب رات گہری ہو جائے تو وہاں سے کسی طرف کو نکل جائے۔ کراچی جانے میں خطرہ تھا وہ پہلے ہی وہاں تین خون کر چکا تھا۔ اب مزید چار خون ہو گئے تھے۔ اس نے سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ وہ واپس پنجاب میاں خان کے پاس ہی جا کر کچھ وقت گزارے۔ ممکن ہے وہاں بہن روبی بھی آجائے۔ اس کے بعد اور کوئی پروگرام بنائیں گے۔

دارا نے منہ ہاتھ دھویا۔ اس کی جیب میں دو پستول تھے۔ ایک پستول میں صرف چار گولیاں باقی تھیں۔ دارا نے دونوں پستول اپنی صدری کی جیبوں میں ہی رہنے دیے۔ وہ صوفے پر سگریٹ سلگا کر بیٹھ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ قدرت نے اس کے ساتھ کیسا دلچسپ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مذاق کیا ہے۔ جس عورت کو وہ ایک گھریلو عزت دار عورت سمجھ رہا تھا اور اس کی عزت بچانے کی خاطر اس نے چار آدمیوں کو قتل کر دیا وہ ایک طوائف نکلی۔ یعنی اس کی کوئی عزت ہی نہیں تھی۔ پھر دارا نے سوچا کہ چلو وہ ایک مظلوم عورت تو تھی۔ خدا جانے بدمعاش اسے کس ملک میں لے جا کر بیچ دیتے اور آگے اس کے ساتھ کیسا کیسا ظلم ہوتا۔ کم از کم اس نے ایک عورت کی زندگی برباد ہونے سے تو بچالی۔

اتنے میں دلشاد ناشتہ ٹرے میں لے کر آگئی۔ دلشاد نے بھی منہ ہاتھ دھوکر نئے ریشمی کپڑے پہن لئے تھے اور وہ بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ جب وہ ناشتہ رکھنے کے لئے میز پر جھکی تو دارا کو اس کے کپڑوں سے بڑی اعلیٰ قسم کے عطر کی خوشبو آئی۔ اس نے دلشاد سے پوچھا۔ "تم کون سا عطر لگاتی ہو؟" دلشاد نے ایک خاص ادا سے مسکرا کر کہا۔

"تمہیں پسند ہے؟ تم لے لو۔ ابھی لاتی ہو۔" دارا نے اسے وہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔

"نہیں نہیں! میں نے تو یونہی خوشبو کی تعریف کی تھی۔ میں عطر نہیں لگایا کرتا۔" دلشاد اس کے لئے چائے بنانے لگی۔ "ناشتہ کر کے تم ساتھ والے کمرے میں جا کر سو جانا۔ تم ساری رات نہیں سوئے۔"

دارا نے کوئی جواب نہ دیا۔ دلشاد نے چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد کہا۔

"تمہیں یہاں آکر حیرانی تو بہت ہوئی ہو گی۔ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے تھے۔ میں ایک طوائف کی بیٹی ہوں۔ میری ماں اور اس کی ماں بھی اسی شہر کی طوائف تھی۔ ہم مجرا کر کے اپنی روزی کماتے ہیں۔ یہ ایک برا پیشہ ہے۔ مگر میں نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی ہے۔ بچپن میں ہی میرے کان میں طبلے سارنگی کی آواز پڑی اور میں نے اپنی ماں کو مجرا کرتے دیکھا۔ پھر میں بھی بڑی ہو کر مجرا کرنے لگی۔"

دارا خاموشی سے چائے پیتے ہوئے دلشاد کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ اس ماحول کے تمام نشیب و فراز کو جانتا تھا۔ دلشاد کہہ رہی تھی۔

"تم مجھے بری عورت مت سمجھنا۔ ہم اپنی مرضی سے چاہے جو کچھ کریں۔ مگر کوئی ہمارے ساتھ زبردستی کرے تو یہ ہمیں بھی گوارا نہیں۔ آخر ہماری بھی ایک اپنی عزت ہوتی ہے۔" دارا نے دلشاد کی بات کو کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں سے پولیس تھانہ کتنی دور ہے؟" دلشاد نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی اور اپنے ماتھے پر آئی ہوئی بالوں کی لٹ کو جھٹکے سے پیچھے کرتے ہوئے بولی۔

"میں جانتی ہوں تم نے چار خون کیے ہیں۔ مگر یہ خون تم نے میرے واسطے کیے ہیں میں نے ماں کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ یہ بات آگے نہیں جائے گی۔ تم فکر نہ کرو۔ ہمارے ہاں بڑی رازداریوں سے کام لیا جاتا ہے اور تم تو ہمارے محسن ہو ۔ جب تک تمہارا جی چاہے یہاں رہو۔ کوئی تمہاری طرف آنکھ بھی اٹھا کر نہیں دیکھ سکے گا۔ یہاں پولیس کبھی نہیں آتی۔ ہم ان کا ٹیکس ان کے پاس باقاعدگی سے پہنچا دیتے ہیں۔ اور پھر چوک میں ہمیں کسی نے دیکھا بھی تو نہیں تھا۔ رات کا وقت تھا۔"

دارا نے سگریٹ بجھا کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا دی۔ دلشاد اٹھتے ہوئے بولی۔ "ساتھ والے کمرے میں تمہارے لئے کرتا تہمد میں نے رکھ دیا ہے۔ تم یہ کپڑے اتار کر دے دو۔ اور آرام کرو۔"

دارا اٹھ کر دوسرے کمرے میں آگیا جہاں مسہری لگی تھی۔ بڑا آرام دہ بستر بچھا تھا۔ دیواروں پر فلم ایکٹریسوں کی بڑی تصویریں لگی تھیں۔ دارا نے تہمد باندھ کر اپنے کپڑے دروازے کے باہر پھینک دیے۔ سخت تھکا ہوا تھا۔ ساری رات نہیں سویا تھا۔ آرام دہ ریشمی بستر پر گرتے ہی سو گیا۔ جب وہ سو کر اٹھا تو خود کو بے حد تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ سب سے پہلے اس نے سرہانے کے نیچے ہاتھ لے جا کر ٹٹولا۔ اس کے دونوں پستول سرہانے کے نیچے موجود تھے اور وہ رومال بھی وہیں تھا جس میں ..... ہزاروں روپے کے نوٹ بند تھے۔ کمرے کے چھوٹے سے روشندان میں سے دن کی پھیکی پھیکی روشنی آرہی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ دارا سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"آجاؤ بھئی۔" کمرے میں دلشاد داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں دارا کے استری کیے ہوئے کپڑے تھے۔ کہنے لگی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں نے اپنے ہاتھ سے استری کیے ہیں۔ تم انہیں پہن لو۔ میں تمہارے لئے کھانا لاتی ہوں۔ میں نے بھی ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔"

"وہ کیوں؟" دارا نے تعجب سے کہا۔ دلشاد مسکرائی۔ دارا کو پہلی بار اس کی مسکراہٹ بڑی اچھی لگی۔

"تم نے جو نہیں کھایا تھا۔"

دارا ہنسنے لگا۔ وہ ان طوائفوں کی اس قسم کی ناز برداریوں کو بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ دلشاد چلی گئی۔ دارا نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے۔ قمیص کے اندر صدری کی جیبوں میں نوٹوں والا رومال اور دونوں پستول سنبھال کر رکھ لئے اور پلنگ کے سامنے جو صوفہ پڑا تھا وہاں بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ اس کمرے میں کوئی گھڑی نہیں تھی۔ اس نے اپنی گھڑی دیکھی۔ دن کے تین بج رہے تھے۔ اب دلشاد کی ماں بھی دلشاد کے ساتھ ہی آئی۔ ایک بار پھر وہ دارا کی بلائیں لینے لگی۔ ایک ناٹے قد کا پہلوان ٹائپ آدمی کھانے کا طشت لے کر آگیا۔ دارا نے اسے غور سے دیکھا۔ جب وہ کھانا لگا کر چلا گیا تو دارا نے اس کے بارے میں دلشاد کی ماں سے پوچھا۔

"اسے میرے بارے میں کچھ پتا تو نہیں؟" دلشاد کی ماں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"پتر! تم فکر کیوں کرتے ہو۔ یہاں سوائے میرے اور دلشاد کے اصل معاملے کی کسی کو کوئی خبر نہیں ہے۔ ہم نے تو دلشاد کے اغوا کی رپٹ بھی نہیں درج کروائی تھی۔ میں نے تو سب کو یہ بتایا تھا کہ دلشاد اپنی خالہ کے پاس سرگودھا گئی ہوئی ہے۔"

دلشاد کی ماں نے اس طبقے کی روایتی تجربہ کار عورتوں کی طرح کہا تھا۔ اس نے ابھی تک کسی کو خبر نہیں ہونے دی تھی کہ اس کی بیٹی کو کچھ لوگ اغوا کر کے لے گئے ہیں۔ اس گھر کے سوائے اس ناٹے قد کے نوکر اور دلشاد کی ماں کے اس اغوا کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ مگر پولیس کو سراغ مل چکا تھا۔

یوں ہوا کہ جن چار بدمعاشوں کو دارا اپنی طرف سے ہلاک کر کے وہاں سے دلشاد کو

لے کر نکل گیا تھا۔ ان میں سے ایک بدمعاش کا سانس ابھی چل رہا تھا۔ پولیس اسے اٹھا کر اسپتال لے گئی۔ اسپتال میں وہ ساری رات اور اس کے اگلے روز دوپہر تک بے ہوش رہا۔ جب اسے ہوش آیا تو کراچی کے وقوعہ والے علاقے کے سب انسپکٹر مراد نے اس سے پوچھا کہ قاتل کون تھا اور وہ لوگ کہاں سے آئے تھے۔ اور علاقے میں کیا واردات کرنے والے تھے؟ بدمعاش پر نزع کا عالم طاری تھا۔ اکھڑے اکھڑے سانسوں میں پولیس کو صرف اتنا ہی بتا سکا کہ وہ لوگ فلاں شہر سے ایک طوائف شادو کو اٹھا کر لائے تھے۔ اب اسے وہاں سے لے جا رہے تھے کہ شادو کا حمایتی کہیں سے نکل آیا اور پھر اس نے ہمیں بھون ڈالا۔ یہ بات بھی قریب المرگ بدمعاش نے رک رک کر کوئی دس بارہ منٹ لگا کر بتائی۔ سب انسپکٹر نے اس کے کان کے قریب منہ لے جا کر پوچھا۔

"وہ آدمی کون تھا؟ کیا تم اس کا حلیہ بتا سکتے ہو؟" اس کے جواب میں بدمعاش نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر اس کا وقت پورا ہو گیا تھا۔ اس کی روح اس کے جسم سے پرواز کر گئی۔ لیکن پولیس کو طوائف کا نام اور اس کے شہر کا نام معلوم ہو گیا تھا۔ اسی وقت سب انسپکٹر مراد نے ایک پولیس پارٹی ترتیب دی اور ٹرین میں بیٹھ کر دلشاد کے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

چونکہ یہ کہانی جو میں آپ کو سنا رہا ہوں ایک سچی داستان ہے اور اس کے بعض کردار زندہ ہیں اور پاکستان میں ایک ذمے دار شریف شہری کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں اس لئے میں ان سب کے فرضی نام لکھ رہا ہوں اور جہاں کہانی کے واقعات کسی قصبے یا چھوٹے شہر میں داخل ہوتے ہیں تو میں ان چھوٹے شہروں کا نام بھی نہیں لکھتا۔ آپ ضرور دل میں سوچیں گے کہ میں نے پہلے بھی "جبرو" کے نام سے ایک سچی کہانی بیان کی تھی اور اب "شیرنی" کے عنوان سے بھی ایک سچی داستان آپ کو سنا رہا ہوں تو میں یہ سچی کہانیاں کہاں سے نکال لاتا ہوں۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ میرے پڑھنے والوں میں سے بہت ہی کم لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہے کہ میں خود اس ماحول میں زندگی کا بیشتر حصہ گزار چکا ہوں جس ماحول کے بارے میں یہ کہانیاں میں لکھ رہا ہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر خاص کرم تھا کہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں سیرو سیاحت کے لئے نکل کھڑا ہوا اور میں نے بعد میں افسانے ناول اور سفرنامے لکھنے شروع کر دیئے۔ اگر مالک ارض و سما کی نگاہ کرم مجھ پر نہ ہوتی تو یقین کریں آج میں بھی کوئی جبرو یا دارا ہوتا اور کسی جیل میں عمر قید کاٹ رہا ہوتا اور یا کسی دشمن غنڈے کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہوتا۔ یہ قیام پاکستان سے پہلے کی باتیں ہیں۔ پاکستان میں آتے ہی میں نے پہلا افسانہ منزل منزل لکھا اور اسی افسانے سے اپنا ایک الگ مقام بنا لیا اور برے ماحول کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا۔ مگر اس وقت تک میں بہت کچھ دیکھ چکا تھا۔ میں نے نام نہاد شریف لوگوں کو عدالتوں میں جھوٹی گواہیاں دیتے بھی دیکھا تھا اور جن کو معاشرہ بدمعاش کہتا ہے انہیں دوسروں کی جان بچاتے ہوئے اپنی جان دیتے بھی دیکھا تھا۔ مجھے امرتسر میں اپنے محلے کے چوئی بدمعاش کی بات آج بھی یاد ہے۔ وہ ان پڑھ تھا' جواری تھا' شرابی تھا مگر محلے میں سے کوئی عورت گزرتی تو وہ اپنا منہ دوسری طرف کر لیتا تھا۔ اس نے ایک بار مجھے کہا تھا۔

"لوگ کہتے ہیں گام بڑا شریف بدمعاش ہے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ شریف' شریف ہی ہوتا ہے بدمعاش' بدمعاش ہی ہوتا ہے۔ اگر بدمعاش کو شریف ہی ہونا ہے تو پھر وہ بدمعاش کیوں ہے؟ اب میری طرف دیکھ لو۔ میں شریفوں کی بڑی عزت کرتا ہوں۔ مگر جوا کھیلتا ہوں' شراب پیتا ہوں ہر عیب کرتا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہو تا کہ میں شریف آدمی ہوتا۔ جب میں کسی کو یہ کہتے سنتا ہوں کہ فلاں بڑا شریف بدمعاش ہے تو مجھے ایسے لگتا ہے جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ فلاں بڑا اچھا گناہگار ہے۔ نہیں باؤ ..... یہ اچھا ماحول نہیں ہے تم یہاں مت آیا کرو۔ میں تو اب گردن تک پھنس گیا ہوں۔ تم اپنے آپ کو جس طرح بچا سکتے ہو بچا لو۔ تم شریفوں کی اولاد ہو۔"

چوئی بدمعاش اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ مگر اس کی یہ بات اس وقت تک میری راہنمائی کرتی رہے گی جب تک میں اس دنیا میں ہوں۔ دانائی کی یہ باتیں اس نے سقراط یا سیونزا کی کسی کتاب میں نہیں پڑھی تھیں بلکہ یہ باتیں اسے اس میدان کار زار نے سکھائی تھیں جہاں نیکی اور بدی کی قوتوں کے درمیان جنگ ہو رہی تھی اور جہاں چوئی بدمعاش کی

حیثیت نیکی کی قوتوں کے ایک کمزور سے سپاہی کی تھی۔ چوئی بدمعاش برائی کی طاقتوں پر فتح تو حاصل نہیں کر سکا تھا لیکن اتنا مجھے معلوم ہے کہ جب وہ میدان کار زار میں گرا تو اس کے ہاتھ میں نیکی کا پرچم تھا۔

معذرت چاہوں گا۔ داستان بیان کرتے کرتے کہیں کا کہیں نکل گیا۔ جذباتی آدمی ہوں۔ میرے ساتھ اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے اب میں واپس داستان پر آتا ہوں۔

روبی کو ہم نے لاہور سے کراچی جانے والی ٹرین میں چھوڑا تھا اور میں دارا کے ساتھ گزرے واقعات بیان کرنے میں لگ گیا۔ بہرحال ابھی میں چاہوں گا کہ ابھی کچھ واقعات دارا کے بیان کروں۔ روبی کراچی پہنچ کر کہاں گئی اور اس کے ساتھ کیا بیتی؟ یہ میں اس کے بعد بیان کروں گا۔

دارا پنجاب کے ایک چھوٹے شہر کے بدنام محلے میں دلشاد طوائف کے مکان میں چھپا ہوا تھا اور دم توڑتے مقتول کی مخبری پر ایک پولیس پارٹی سب انسپکٹر مراد کی قیادت میں دارا کو گرفتار کرنے کراچی سے اس چھوٹے شہر کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔ بیچ میں صرف ایک رات تھی۔ پولیس پارٹی کو اس رات کا زیادہ حصہ ٹرین میں بسر کرنا تھا اور دارا دلشاد طوائف کے مکان پر یہ رات بسر کرنے کے بعد پنجاب کی طرف فرار ہو جانے کا پروگرام بنا چکا تھا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد دارا اسی بیڈ روم میں لیٹ گیا۔ ابھی طوائفوں کے گانے بجانے پر حکومت کی طرف سے پابندیاں نہیں لگی تھیں۔ اوپر والی بیٹھک میں مجرا شروع ہو گیا۔ گھنگھرو کی آواز اور طبلے کی تھاپ کے ساتھ دارا کو دلشاد کے گانے کی ہلکی ہلکی آواز بھی آ رہی تھی۔ ایسی آوازیں اسے پریشان نہیں کرتی تھیں۔ وہ ان آوازوں میں بھی سو جانے کا عادی تھا۔ وہ سگریٹ پیتا اور سوچتا رہا کہ منہ اندھیرے وہ وہاں سے نکل جائے گا اور لاہور جانے والی کوئی بھی بس پکڑ کر اپنے دوست میاں خان کے فارم پر پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ پھر اس نے سگریٹ بجھا دیا اور آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ بتی اس نے پہلے ہی بجھا دی تھی۔ رقص کرتے ہوئے دلشاد کے پاؤں کی تھاپ سے دھم دھم کی آواز پیدا ہو رہی تھی مگر دارا اس کے باوجود سو گیا۔ پھر اسے یوں لگا جیسے کوئی اسے ہلا رہا ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں اور اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر تکیے کے نیچے چلا گیا جہاں بھرا ہوا پستول پڑا تھا۔

کمرے میں بتی روشن تھی۔ اس روشنی میں اس نے دلشاد کا چہرہ دیکھا جو اس کے اوپر جھکی ہوئی تھی اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کو کہہ رہی تھی۔ دارا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دلشاد طوائفوں والے میک اپ میں تھی اور اس کے لباس سے عطر کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ اس کے پاس ہی پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ دارا نے تجسس کے ساتھ پوچھا۔

"خیر ہے پولیس کا چھاپہ تو نہیں پڑ گیا؟" دلشاد مسکرائی۔ اس دفعہ بھی دارا کو اس کی مسکراہٹ بڑی بھلی لگی۔ خدا جانے کیوں اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ دلشاد اس کے سامنے بیٹھی اسی طرح مسکراتی رہے۔ دلشاد نے دوپٹہ اپنے سر پر کیا تو اس کی چوڑیاں کھنک اٹھیں۔

"پولیس یہاں نہیں آتی۔"

"کیا ٹائم ہوا ہے؟" دارا نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا دلشاد نے کہا۔

"رات کے دو بجے ہیں۔"

"تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟" دارا کے اس سوال پر دلشاد بولی۔

"طوائف کا تو کام ہی راتوں کو جاگنا ہے۔" دارا نے پوچھا۔

"مگر تم اس وقت یہاں کیوں آئی ہو۔" دلشاد نے ہلکا سا سانس بھرا اور بولی۔

"تماش بین جا چکے ہیں۔ گھر کے سب لوگ سو رہے ہیں اور میں تمہارے پاس اس لئے آئی ہوں کہ مجھے یہاں سے نکال کر لے جاؤ۔"

دارا اس کا منہ تکنے لگا۔ اس نے تکیے کے نیچے سے سگریٹوں کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگا لیا۔ دلشاد اس کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ بلب کی روشنی میں اس کی نتھنی کا نگینہ کسی وقت چمک اٹھتا تھا۔ دارا نے پوچھا۔

"یہ خیال تمہیں پہلے کیوں نہیں آیا؟" دلشاد نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

"پہلے کوئی مرد کا بچہ نہیں ملا تھا۔ اب تم مل گئے ہو تو تمہیں دل کا حال بیان کر دیا

ہے۔"

دارا نے بھی زندگی میں پہلی بار اس عورت کی شکل میں محبت کے ان دبے ہوئے جذبوں کو سر اٹھاتے دیکھا تھا جن کا کوئی نام دارا کے پاس نہیں تھا۔ اس کو یہ عورت شروع ہی سے اچھی لگی تھی۔ اگر دلشاد کا تعلق کسی شریف گھرانے سے ہوتا تو وہ اسی رات اسے اس کے گھر پہنچا کر بھول جاتا۔ مگر اتفاق سے دلشاد کا تعلق ایک طوائف گھرانے سے نکل آیا اور دارا کو دلشاد کے قریب ہونے کا موقع مل گیا۔ اس کے دل میں اول تو کسی عورت کو اپنی بیوی بنانے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اگر کبھی خیال آیا بھی تو وہ یہ سوچ کر اس خیال کو دل سے نکال دیتا کہ وہ بدمعاش ٹائپ آدمی ہے۔ وہ کسی شریف عورت کے لائق نہیں۔ ویسے بھی کوئی شریف آدمی اسے اپنی بیٹی کا رشتہ دینے کو تیار نہیں ہو گا۔ جب دلشاد نے اسے پہلی بار بتایا کہ وہ ایک طوائف کی بیٹی ہے تو اسی لمحے اس کے دل میں امید کی کرن پھوٹی تھی مگر اس نے دلشاد پر اپنے دل کے حال کو ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ اور کچھ دارا بھی ابھی اس معاملے میں اتنا سنجیدہ نہیں تھا۔ لیکن اب جب دلشاد رات کے دو بجے اس کے پاس یہ کہنے آئی کہ مجھے یہاں سے نکال کر لے چلو تو اس کو یقین ہو گیا کہ یہی عورت اب اس کی بیوی بنے گی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے جذبات قابو میں رکھے۔ وہ دلشاد کے دل کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے سوال کیا۔

"میرے ساتھ بھاگ کر کہاں جاؤ گی؟ میں تو ایک مفرور قاتل ہوں۔ کسی وقت بھی پکڑا جا سکتا ہوں۔" دلشاد نے جواب دیا۔

"مجھ سے زیادہ اس حقیقت سے کون واقف ہو گا کہ تم قاتل ہو۔ اس کے باوجود میں تمہارے ساتھ یہاں سے بھاگ جانا چاہتی ہوں کیونکہ تم مرد ہو۔ تماش بین نہیں ہو۔ تمہارے دل میں عورت کی عزت ہے اور طوائف کتنی بری سے بری طوائف کیوں نہ ہو اس کی بھی ایک اپنی عزت ہوتی ہے۔ میں اس عزت کا مقابلہ کسی پاکباز شریف عورت کی عزت سے نہیں کر سکتی۔ میں اس قابل نہیں رہی ہوں۔ میری عزت کے سونے میں اتنا کھوٹ شامل ہو گیا ہے کہ اصلی غائب ہو گیا ہے۔ میں تو کسی شریف عورت کی خدمت

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کرنے کے بھی لائق نہیں ہوں پھر بھی جب تک ایک عورت کا عورت پن قائم ہے جب تک اس کے دل میں گناہ کا احساس زندہ ہے اس کی تھوڑی بہت عزت اپنی آنکھوں میں ضرور باقی رہتی ہے۔ میرے پاس صرف یہی ایک احساس گناہ اور اچھی زندگی گزارنے کی ایک خواہش ہے جس کو لے کر میں تیرے پاس آگئی ہوں۔ اب فیصلہ تجھے کرنا ہے۔ اگر میں نے تیرے اندر مردانگی کا جوہر نہ دیکھا ہوتا تو یقین کرنا میں اس وقت مجرا ختم کرنے کے بعد گہری نیند سو رہی ہوتی۔ اب تو مجھے بتا' کیا مجھے اس دلدل سے نکال کر لے جائے گا؟"

دارا نے تکیے کے نیچے سے اپنی رسٹ واچ نکالی اور اسے دیکھ کر بولا۔

"یہاں سے لاہور کی طرف ریل گاڑی کس وقت چلتی ہے؟" دلشاد نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"کیا تو میرے بغیر چلا جائے گا؟" دارا نے دلشاد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بولا۔

"تو میرے ساتھ جائے گی۔"

دلشاد کا دل چاہا کہ وہ دارا سے لپٹ جائے مگر وہ اس کے اکھڑپن سے بہت حد تک واقف ہو چکی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ وہ اسے جھٹک دے گا۔ مگر وہ اپنی خوشی کو چھپا نہ سکی۔ اس نے دارا کا ہاتھ چوم لیا۔

"تو مرد ہے دارا۔ مجھے تیری ہی تلاش تھی۔"

دلشاد نے اسے بتایا کہ اس وقت نہ کوئی ریل گاڑی جاتی ہے اور نہ لاری اڈے پر کوئی لاری ہی ملے گی۔ ٹرین صبح چار بجے کراچی سے یہاں پہنچتی ہے اور پہلی لاری بھی اسی ٹائم یہاں سے ملتان کی طرف روانہ ہوتی ہے۔ دارا کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے ہم چار بجے یہاں سے نکلیں گے۔ ہم لاری میں بیٹھ کر ملتان جائیں گے۔ وہاں سے لاہور والی بس پکڑ لیں گے۔ ٹرین میں جانا ٹھیک نہیں۔ تمہارے یہ گھر والے کس وقت اٹھتے ہیں؟" دلشاد نے مسکرا کر کہا۔

"یہاں دن کے گیارہ بجے سے پہلے کسی کی آنکھ نہیں کھلتی۔ اب تم آرام کرو۔ میں

ٹھیک پونے چار بجے تمہارے پاس آجاؤں گی۔" پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "اس وقت نکل جانے میں کیا حرج ہے۔" دارا نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"ہم دونوں کا لاری اڈے پر بیٹھ کر لاری کا انتظار کرنا ٹھیک نہیں۔ اس طرح ہمیں دیکھا جا سکتا ہے اور کیا خبر کوئی پولیس والا ہی ادھر آنکلے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں پونے چار بجے آجاؤں گی۔ میں اپنا کوئی زیور ساتھ نہیں لاؤں گی۔ یہ حرام کی کمائی کا بنا ہوا ہے۔ میں حرام کی کمائی کی کوئی شے اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتی۔" دلشاد کی اس بات کے جواب میں دارا نے کہا۔

"بے شک یہ کپڑے بھی یہیں اتار کر پھینک دینا میں تمہیں نئے کپڑے بنوا دوں گا۔"

دلشاد نے کہا۔

"جب تم مجھے اپنی کمائی سے کپڑے بنوا دو گے تو میں ان کپڑوں کو آگ لگا دوں گی۔" دلشاد اتنا کہہ کر کمرے سے چلی گئی۔ جاتے ہوئے وہ بتی بجھا گئی تھی۔

دارا پلنگ پر نیم دراز تھا۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ دارا ایک سیدھا سادا بے باک جذباتی والا ان پڑھ آدمی تھا۔ وہ شعور' لاشعور اور تحت الشعور کی بھول بھلیوں سے ناواقف تھا۔ اسے دلشاد پسند آئی تھی۔ اسے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ دلشاد کا تعلق کسی شریف گھرانے سے نہیں ہے۔ وہ دلشاد کو وہاں سے نکال کر اپنی بیوی بنانے لے جا رہا تھا۔ بس اس کے واسطے اتنا ہی کافی تھا۔ دارا نے پلنگ سے اٹھ کر وہ شلوار قمیص پہن لی جو دلشاد اس کے لئے استری کر کے لائی تھی۔ صدری کی جیبوں میں نوٹوں کی گڈی اور پستول بھی رکھ لئے۔ وہ خالی پستول سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ راستے میں کسی جگہ خالی پستول پھینک دے گا۔ اور بھرا ہوا پستول اپنے پاس رکھے گا۔ ابھی چار بجنے میں سوا گھنٹہ باقی تھا۔ دارا پلنگ پر نیم دراز ہو گیا اور سگریٹ پینے لگا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دوسری طرف کراچی کی پولیس پارٹی سب انسپکٹر مراد علی کی قیادت میں اسی شہر کے اسٹیشن پر پہنچ گئی تھی۔ یہ لوگ سیدھا متعلقہ علاقے کے تھانے میں آئے۔ وہاں کے ایس ایچ او کو ساری بات بتائی۔ اسے بھی ساتھ لیا اور شہر کے بازار حسن کی طرف چل پڑے۔ ایس ایچ او نے سب انسپکٹر مراد علی کو بتایا کہ دلشاد کو اغوا یا بھاگ جانے کی تھانے میں کوئی رپٹ درج نہیں ہوئی ہے۔ سب انسپکٹر بولا۔

"ہو سکتا ہے اس کی ماں نے اس خبر کو خفیہ رکھنا چاہا ہو۔ بہر حال مجھے یقین ہے کہ لڑکی اپنے گھر پہنچ چکی ہے۔"

پولیس کی جیپ دلشاد طوائف کے مکان کے سامنے آکر رکی اس وقت مکان میں صرف دلشاد اور دارا ہی جاگ رہے تھے۔ دارا نچلے کمرے میں تھا اور دلشاد دوسری منزل میں مجرا کرنے والی بیٹھک میں تکیون سے ٹیک لگائے بیٹھی دن کے پونے چار بجنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اچانک دروازہ زور زور سے بجا۔ دلشاد گھبرا کر کھڑکی کی طرف آئی۔ اس نے چق ذرا سی اٹھا کر گلی میں جھانکا۔ بجلی کے کھمبے کی روشنی میں اسے پولیس کے سپاہی جیپ سے نکلتے نظر آئے تو وہ گھبرا کر نیچے کو بھاگی۔ دارا بستر پر بیٹھا تھا۔ دلشاد نے اندر آتے ہی کہا۔

"باہر پولیس آگئی ہے۔ جلدی سے میرے ساتھ آؤ۔" ان لوگوں نے اس قسم کے ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لئے گھروں میں خفیہ ٹھکانے ضرور بنائے ہوتے ہیں۔ دلشاد کے مکان میں بھی ایک چھوٹا سا تہہ خانہ تھا جہاں ٹوٹی پھوٹی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ یہ تہہ خانہ دیوان خانے کے پیچھے ایک کوٹھری کے نیچے تھا۔ دلشاد نے دارا کو تہہ خانے میں چھپا دیا اور تاکید کی کہ وہ کوئی آواز نہ نکالے۔ تہہ خانے کا چھوٹا دروازہ بند کرکے اس کے آگے تانبے

کی پرانی مٹکی رکھ دی اور خود تیزی سے اوپر والی منزل میں چلی آئی۔ اس دوران گھر کے سب لوگ جاگ پڑے تھے۔ نوکر چاکر اور دلشاد کی ماں بھی جاگ چکی تھی۔ اس نے بڑے ٹھنڈے دل اور خندہ پیشانی سے پولیس پارٹی کا خیر مقدم کیا تھا اور ان سب کو دیوان خانے میں بٹھا کر چائے پانی کا پوچھ رہی تھی۔ ایس ایچ او کا وہاں ماہانہ لگا ہوا تھا۔ اس نے سرسری طور پر دلشاد کا پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ دلشاد کی تجربہ کار ماں نے کہا۔

"اوپر سو رہی ہے کیوں کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے میاں جی؟"

تب کراچی والے سب انسپکٹر نے صاف سوال کر دیا۔

"تمہاری بیٹی دلشاد کو کراچی سے کون لایا ہے؟" دلشاد کی ماں کو سب معلوم تھا کہ پولیس کیوں آئی ہے اور اسے کیا جواب دینا ہے۔ اس نے چہرے پر حیرانی اور تعجب کے تاثرات پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی! میری بیٹی کراچی کب گئی تھی کہ اسے کوئی وہاں سے لاتا۔ وہ تو تین دن سے بیمار گھر پر پڑی رہی۔ آج خیر سے آرام آیا تو تھوڑا سا مجرا کیا اور اب سو رہی ہے۔" ایس ایچ او نے سب انسپکٹر سے کہا۔

"میں تو پہلے ہی آپ سے کہہ رہا تھا کہ لڑکی اسی شہر میں تھی۔" سب انسپکٹر نے ایس ایچ او کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ دلشاد کی حمایت کس لئے کر رہا ہے۔ اس نے دلشاد کی ماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور بولا۔

"بی بی! تمہاری بیٹی کو چار آدمی یہاں سے اغوا کر کے کراچی لے گئے تھے۔ وہاں ان چاروں کا خون ہو گیا ہے اور تمہاری بیٹی بھاگ کر واپس آگئی ہے۔ اسے معلوم ہے کہ قاتل کون ہے۔ اپنی لڑکی کو بلاؤ۔" دلشاد کی ماں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر انتہائی حیرانی کا اظہار کیا۔

"ہائے میں مر گئی؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں شاہ جی! وہ میری بیٹی نہیں کوئی دوسری لڑکی ہو گی۔ یا کسی نے دشمنی میں میری بیٹی کا نام لیا ہو گا۔ میری بیٹی تو خیر سے اپنے گھر میں ہی تھی۔" پھر اس نے نوکر سے کہا کہ جا کر دلشاد کو بلا لا۔ دلشاد نے یہ ساری گفتگو دروازے کے پیچھے سن لی تھی۔ وہ بھاگ کر اوپر چلی گئی۔ اپنے بالوں کو ذرا الجھایا اور ایسا حلیہ بنا کر نیچے آئی جیسے گہری نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ سب انسپکٹر نے اسے غور سے گھورا۔ دلشاد نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ادب سے سلام کیا اور بیٹھ گئی۔ سب انسپکٹر نے پوچھا۔

"تمہارا ہی نام دلشاد ہے؟" دلشاد نے کہا۔

"جی ہاں جناب۔ میں ہی دلشاد ہوں۔ حکم کریں۔" سب انسپکٹر نے کہا۔

"دیکھو دلشاد! جھوٹ بولنے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ الٹا کیس خراب ہو جائے گا۔ تم ہمیں صرف یہ بتا دو کہ کراچی میں جس آدمی نے چاروں بدمعاشوں کو گولیاں مار کر ہلاک کیا تھا وہ کون ہے؟ اگر تم نے انہیں قتل کیا ہے تب بھی صاف صاف بتا دو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں صاف بری کرا لوں گا۔" دلشاد بھی اپنی ماں کی تربیت یافتہ تھی۔ وہ صاف مکر گئی اور قسم کھا کر کہنے لگی۔

"شاہ جی! میں تو بیمار ہو کر گھر پڑی تھی۔ مجھے کسی نے اغوا نہیں کیا اور نہ میں کراچی گئی ہوں۔ پتا نہیں کسی دشمن نے میرا نام آپ کے آگے لے دیا ہے۔ اگر کراچی میں ہوتی یا مجھے کوئی اٹھا کر لے گیا ہوتا تو یہاں تو کسی نہ کسی کو ضرور خبر ہوتی اور میری ماں تو اسی وقت تھانے میں رپٹ درج کراتی۔"

سب انسپکٹر مراد کی نگاہیں دلشاد کے چہرے کو تک رہی تھیں۔ وہ اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بڑے غور سے سن رہا تھا۔ جب دلشاد نے اپنا بیان ختم کر دیا تو انسپکٹر نے بڑے آرام سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بی بی! تمہیں میرے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے تھانے چلنا ہو گا۔"

اس پر دلشاد کی ماں نے زبردست احتجاج کیا کہ میری بچی کو ناحق تھانے کیوں بلایا جا رہا ہے۔ اس نے کوئی جرم نہیں کیا یہ سراسر ظلم ہے۔ سب انسپکٹر مراد نے دلشاد کی ماں کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"تمہاری بیٹی پر چار آدمیوں کے قتل کا الزام ہے۔ اب تم سمجھیں کہ تمہاری بیٹی کو تھانے کیوں بلایا جا رہا ہے؟"

دلشاد کی ماں وہیں جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے علاقہ کے ایس ایچ او کی طرف دیکھا جو اس سے باقاعدہ ماہانہ وصول کرتا تھا۔ اس نے آہستہ سے آنکھ کا اشارہ کیا۔ کہ تم گھبراؤ نہیں لڑکی کو لے جانے دو۔ میں جو وہاں موجود ہوں۔

دلشاد کو پولیس اپنے ساتھ تھانے لے گئی۔ جانے سے پہلے دلشاد نے اپنی ماں کو ایک طرف جا کر بتا دیا کہ دارا مکان کے تہہ خانے میں ہے۔ دلشاد کے جاتے ہی دلشاد کی ماں مکان کے تہہ خانے میں گئی اور دارا کو سارا واقعہ بیان کیا۔ دارا تو ہکا بکا ہو کر رہ گیا۔ کہ پولیس کو کیسے پتا چلا؟ وہ کہنے لگا۔

"وہاں تو کوئی بھی ایسا آدمی نہیں تھا جس کے مخبری کرنے کا امکان ہو۔ چاروں بدمعاشوں کی لاشیں ہی تھیں۔" پھر خود ہی کچھ سوچ کر بولا۔ "کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی بدمعاش میں ابھی جان باقی ہو اور اس نے دلشاد کا نام بتا دیا ہو؟ پولیس نے یہ نہیں بتایا کہ مخبری کس نے کی ہے۔" دلشاد کی ماں غم سے نڈھال آواز میں بولی۔

"نہیں بیٹا۔ پولیس کو یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ اب تو تم ہی کچھ کرو۔ مگر تم کیا کر سکتے ہو۔ تم تھانے گئے تو پولیس اسی وقت تمہیں پکڑ لے گی ہو سکتا ہے پولیس کو پتا چل گیا ہو کہ قتل تم نے کئے ہیں اور وہ دلشاد کے ذریعے تمہارا سراغ لگانا چاہتی ہو۔"

"وہ بدمعاش جو دلشاد کو یہاں سے اغوا کر کے لے گئے تھے وہ دلشاد کو جانتے تھے کیا؟" دارا نے پوچھا۔ دلشاد کی ماں نے اثبات میں سر ہلا کر جواب دیا۔

"ہاں بیٹا! وہ ساتھ والے گاؤں کے بدمعاش تھے یہاں مجرے پر ایک بار ان کا ہم سے جھگڑا بھی ہوا تھا۔"

دارا اس معاملے میں جذباتی طور پر الجھ گیا تھا۔ اب یہ حقیقت اس پر کھل کر سامنے آ گئی تھی کہ دلشاد اس کی زندگی سے بچھڑا ہوا ایک ٹکڑا ہے اور اس کے بغیر اس کی زندگی نامکمل ہے۔ لیکن دلشاد کو تھانے سے نکالنا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ سوائے انتظار کے کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے دلشاد کی ماں سے کہا۔

"پولیس کے پاس دلشاد کی گرفتاری کا کوئی وارنٹ نہیں ہے۔ آپ لوگ تھانے جائیں اور ایس ایچ او سے بات کریں۔ وہ دلشاد کو زیادہ دیر وہاں نہیں رکھ سکیں گے۔"

دلشاد کی ماں جانتی تھی کہ ایس۔ ایچ۔ او اگرچہ اس سے پیسے لیتا ہے مگر جب باہر سے کوئی افسر آتا ہے تو وہ ہتھیار ڈال دیتا ہے اور طوطا چشم بن جاتا ہے۔ پھر بھی وہ اپنی برادری کے چار آدمیوں کو ساتھ لے کر تھانے جا کر بیٹھ گئی۔ کراچی والے سب انسپکٹر کے پاس بھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دلشاد کیخلاف کوئی حتمی ثبوت نہیں تھا کہ چاروں قتل اسی نے کئے ہیں۔ وہ یہ بھی ثابت نہیں کر سکتا تھا دلشاد اغوا کر کے کراچی..... لے جائی گئی تھی۔ کیونکہ جو اس واقعے کا عینی گواہ تھا وہ بھی مر چکا تھا۔ تھانے لے جا کر انسپکٹر نے دلشاد کو کافی ڈرایا دھمکایا مگر دلشاد کوئی بچی نہیں تھی اور تھانہ اس کے لئے واقعی خالہ جی کا گھر ہی تھا وہ اپنے بیان پر ڈٹی رہی۔ سب انسپکٹر نے جب دیکھا کہ اس کے لواحقین باہر آئے ہوئے ہیں اور ہنگامہ کھڑا ہونے کا ڈر ہے تو اس نے دلشاد کو اس کی ماں کے ساتھ کر دیا۔ مگر علاقے کے تھانے دار سے رازداری کے ساتھ کہا کہ۔

"مجھے یقین ہے کہ جس بدمعاش نے چار آدمیوں کو قتل کیا ہے وہی دلشاد کو ساتھ لے کر یہاں آیا ہے اور وہ ضرور اسی شہر میں کسی جگہ روپوش ہے۔ تمہیں اس کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہئے۔ اپنا آدمی دلشاد کے گھر کی نگرانی پر لگا دو۔ اور ذرا کوئی سراغ ملے تو مجھے فوراً کراچی اطلاع کرو۔"

دلشاد گھر واپس آگئی۔ اس کی ماں نے آتے ہی اسے ہدایت کی کہ جتنی جلدی ہو سکے اس آدمی کو گھر سے روانہ کر دو۔ کہیں یہ ہم پر کوئی آفت نہ لے آئے۔ آخر وہ چار آدمیوں کو قتل کر کے آیا ہے۔ دلشاد اپنی ماں کی خود غرضیوں کو اچھی طرح جانتی تھی۔ مگر وہ بھی اس کی بیٹی تھی۔ وہ جو فیصلہ کر چکی تھی اس کی ماں کے فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہ تھی۔ دلشاد نے کہا۔

"اچھا ماں۔ کسی بہانے اسے رخصت کرتی ہوں۔"

دلشاد ناشتہ لے کر دارا کے پاس آئی۔ اس وقت صبح کے نو بج رہے تھے۔ آج نہ جانے کتنی مدت بعد دلشاد صبح کے نو بجے ناشتا کر رہی تھی۔ ورنہ رات کو مجرا کر کے وہ سو جاتی تو دن کے گیارہ بارہ بجے ہی اٹھتی تھی۔ جلدی ناشتا کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دلشاد نے اسی وقت دارا کے ساتھ وہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کیونکہ محلے کے لوگ ابھی تک سو رہے تھے اور دلشاد کی ماں بھی تھانے سے واپس آنے کے بعد دودھ کا گلاس پی کر فوراً سو گئی تھی۔ نوکر بھی جو رات بھر کے جاگے تھے ادھر ادھر پڑ گئے تھے۔ دلشاد نے ساری بات دارا کو بیان کر دی۔ دارا کہنے لگا۔

"مگر شادو پولیس نے اپنا کوئی آدمی سادہ کپڑوں میں تمہارے گھر کے باہر ضرور بٹھا دیا ہو گا۔ ہمیں اس سے بھی بچنا ہے۔" دلشا بولی۔

تم جلدی جلدی ناشتہ کرو میں کچھ سوچتی ہوں۔" دارا کے دل میں یونہی ایک خیال سا آگیا اس نے دلشاد سے پوچھا۔

"تمہارے یوں بھاگ جانے سے تمہاری ماں کو تو بڑا صدمہ ہو گا۔" دلشاد نے کندھوں کو جھٹک کر کہا۔

"وہ مجھ سے کافی فائدہ اٹھا چکی ہے۔ اور پھر اس نے اتنا پیسہ جمع کر لیا ہے کہ سو سال تک آرام سے بیٹھ کر کھا پی سکے گی۔" دارا کہنے لگا۔

"کیا خیال ہے میں تمہاری ماں سے بات نہ کروں کہ میں تمہاری بیٹی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے وہ مان جائے گی۔" دلشاد ہنس پڑی۔

تم بڑے سیدھے مرد ہو۔ کسی نائیکہ سے اس کی ایسی بیٹی کا رشتہ مانگ رہے ہو جو اسے ہر رات مجرا کر کے ہزار بارہ سو روپیہ کما کر دیتی ہو یہ تو ایسا ہی ہے جیسے الہ دین کو یہ کہنا کہ بھائی اپنا جادوئی چراغ مجھے دے دو۔ اگر تم نے میری ماں سے میرے رشتے کی بات کی تو یاد رکھو دوسرے لمحے پولیس کو خبر کر کے تمہیں گرفتار کرا دے گی۔ میں اپنی ماں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ مگر ہمارا تو کاروبار ہی ایسا ہے۔ اس کی جگہ اگر میں ہوتی تو میں بھی ایسا ہی کرتی۔"

دلشاد نے ڈیوڑھی میں جا کر تھوڑا سا پٹ کھول کر گلی میں دیکھا۔ گلی میں دو بچے کھیل رہے تھے۔ اسے خفیہ پولیس کا کوئی آدمی وہاں بظاہر نظر نہ آیا۔ دارا کے پاس واپس آکر کہنے لگی۔

"یہاں کے کچھ خفیہ پولیس والوں کو میں شکل سے پہچانتی ہوں۔ ابھی تک تو ان میں سے کوئی باہر نہیں ہے۔" دارا نے کہا۔

"ہمیں مکان کے ڈیوڑھی والے دروازے سے نہیں نکلنا چاہیے۔ کیا کوئی دوسرا راستہ ہے یہاں؟" دلشاد نے نفی میں سر ہلایا۔ کہنے لگی۔

"ہمیں اسی دروازے سے نکلنا ہو گا۔ میں اپنی اماں کا سفید برقع پہن لوں گی۔ تم پہلے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تک کراری اڈے پر پہنچ جانا لاری اڈہ دیکھا ہے تم نے؟" دارا نے کہا۔

"ہاں۔ میں نے دیکھا ہے۔ تم دیر نہ کرنا۔ میں لاری اڈے پر ہی کسی جگہ چھپ کر تمہارا انتظار کروں گا۔ تم مجھے تلاش نہ کرنا۔ میں تمہیں دیکھ کر خود تمہارے پاس آجاؤں گا۔" اس کے ساتھ ہی دارا بیڈ روم سے نکل کر ڈیوڑھی میں آیا اور پھر دروازہ کھولا اور گلی میں پرانے نانے والی ڈھلان کی طرف چل دیا۔ وہ اسی طرف سے اس گلی میں داخل ہوا تھا۔ وہ شہر کی بارونق سڑکوں کی طرف سے نہیں گزرنا چاہتا تھا۔

لاہور جانے والی سڑک پر بھاری ٹریفک رواں تھا لاری اڈے پر چند ایک مسافر ہی تھے۔ ایک لاری مسافروں سے بھری جا چکی تھی۔ دارا کے سامنے وہ لاہور کی طرف روانہ ہو گئی۔ اگلی اس شہر میں ٹیکسی رکشا نہیں چلا تھا۔ ورنہ دارا ٹیکسی کر لیتا۔ اسے لا محالہ لاری میں ہی سفر کرنا تھا۔ وہ اڈے کے بکنگ آفس کے پیچھے برگد کے درخت کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں شہر سے آتی سڑک پر لگی تھیں۔ کچھ دیر بعد اسے سڑک پر شہر کی جانب سے ایک عورت آتی دکھائی دی جس نے معمر عورتوں والا سفید برقع پہن رکھا تھا یہ دلشاد تھی۔ وہ ذرا سڑک کے پار چلا آیا۔ اس نے دلشاد کو وہیں سے اپنے ساتھ لیا اور اڈے کے پیچھے برگد کے درخت تلے بیٹھ گیا۔

"تمہیں کسی نے دیکھا تو نہیں؟" دارا نے دلشاد سے پوچھا۔ دلشاد نے نقاب ذرا سا ہٹا کر دارا کو مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہا۔

"دیکھ بھی لیا ہو گا تو پھر کیا ہوا۔ اب واپس نہیں جاؤں گی۔ اپنے مرد کے واسطے ساری دنیا چھوڑ دی ہے۔"

دارا کو دلشاد کی اس قسم کی ٹھیٹھ اور دیہاتی باتیں بڑی اچھی لگ رہی تھیں۔ اس نے بھی دلشاد کا ہاتھ برقعے کے اندر تھام کر کہا۔

"ہم بھی یاری نبھائیں گے شادو۔" قصہ مختصر دارا اپنی محبوبہ دلشاد کو لے کر کسی نہ کسی طرح اپنے پرانے دوست میاں خان کے فارم میں پہنچ گیا۔ میاں خان نے اس بار دارا کے ساتھ ایک نئی عورت کو دیکھا تو اسے ایک طرف لے جا کر پوچھا۔

"یہ کون ہے دارا؟" اس نے سارا واقعہ بیان کر دیا اور کہا میں دلشاد سے شادی کرنا

چاہتا ہوں۔ میاں خان سوچ میں پڑ گیا۔ کہنے لگا۔

"شادی کے لئے ایک مولوی صاحب اور دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔ خیر تم فکر نہ کرو۔ یہ نیک کام ہے۔ میں اس کا بندوبست کر دوں گا۔"

دارا نے روبی کے بارے میں پوچھا تو میاں خان بولا۔

"وہ آئی تھی مگر تمہیں یہاں نہ پا کر کسی طرف نکل گئی' شاید وہ کراچی چلی گئی ہے۔ وہ اپنی بچی سے ملنا چاہتی تھی۔"

دارا خاموش رہا۔ اگلے روز میاں خان ایک مولوی صاحب۔ اور دو گواہوں کو ساتھ لے آیا۔ فارم میں ہی دارا کا نکاح دلشاد کے ساتھ پڑھا دیا گیا۔

میاں خان نے دارا کو حالات کی نزاکت کا احساس دلاتے ہوئے بتایا کہ نادر اور اس کے ساتھیوں کے قتل کے بعد یہ علاقہ پولیس کی مسلسل نگرانی میں ہے۔

دارا بولا" مجھے معلوم ہے میاں خان۔ مگر میں کچھ وقت یہاں گزارنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ ہو سکتا ہے روبی یہاں واپس آجائے" میاں خان کہنے لگا۔

"تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ تم یہاں سے میرے پرانے ڈیرے پر چلے جاؤ۔ وہاں تم محفوظ ہو گے۔ کیونکہ اب ادھر کوئی نہیں جاتا۔ کبھی میں وہاں اسمگلنگ کا مال چھپایا کرتا تھا۔ اب وہ ڈیرہ مدت سے خالی پڑا ہے اور پولیس بھی ادھر کا رخ نہیں کرتی۔ تمہیں راشن پانی وہاں پہنچتا رہے گا۔"

میاں خان کا یہ ویران ڈیرہ اس کے فارم کے جنوب میں ایک چھوٹے سے ٹیلے کے دامن میں تھا۔ یہ شور زدہ زمین تھی۔ آس پاس کوئی دیہات بھی نہیں تھا۔ میاں خان کا فارم وہاں سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ دلشاد اور دارا یہاں آگئے۔ میاں خان نے وہاں دو چارپائیاں اور بستر اور کچھ ضروری برتن بھجوا دیئے۔ کھانا وغیرہ دن میں دو بار اعتباری نوکر لے کر آجاتا تھا دارا نے میاں خان سے پستول کی گولیاں کافی تعداد میں لے کر اپنے پاس رکھ لی تھیں۔ ابھی دستی بموں اور کلاشنکوفوں کا دور شروع نہیں ہوا تھا۔ پستولوں کی فائرنگ بھی کہیں کہیں ہوتی تھی اور اس کی بڑی دہشت تھی۔ دارا نے دلشاد کو روبی کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا اور کہا تھا کہ میری یہ بہن بڑی دلیر اور جانباز ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اگر وہ یہاں آگئی تم اس سے مل کر بڑی خوش ہو گی۔ دلشاد نے دارا سے کہا۔

"یہاں ہم کچھ دن ہی ٹھہر سکتے ہیں۔ ہمیں کہیں اپنا مستقل گھر بنانا چاہئے۔ جہاں میں تمہارے ساتھ سکون و اطمینان سے باقی زندگی بسر کر سکوں۔" دارا بولا۔

"یہ بھی ہو جائے گا میری جان! آخر ہمیں اپنا گھر بنانا ہی ہے۔ مگر میں اپنی بہن روبی کو بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ اس کا سوائے میرے اور کوئی نہیں ہے۔ شیر خان اس کا خاوند ضرور ہے مگر وہ خود مشکل میں پھنسا ہوا ہے۔ اپنی معصوم بچی کی وجہ سے وہ اپنی بیوی روبی کے ساتھ بھی نہیں جا سکتا اور اسے اپنے گھر میں بھی نہیں رکھ سکتا۔ میری طرح روبی نے بھی بڑے خون کیے ہیں اور پولیس اس کے پیچھے لگی ہے۔" دلشاد نے کہا۔

"دارا وعدہ کرو کہ روبی سے ملنے کے بعد تم میرے ساتھ شریفانہ زندگی بسر کرو گے۔ یہ پستولوں اور بدمعاشوں کی دنیا سے نکل آؤ گے۔" دارا مسکرایا۔

"دلشاد! میری جان! اگر ایسی بات نہ ہوتی تو میں تم سے کبھی شادی نہ کرتا۔ میں نے تو تم سے شادی ہی اس لئے کی ہے کہ ایک نئی زندگی شروع کر سکوں۔"

"مگر ہم جائیں گے کہاں؟" دلشاد نے فکر مندی سے پوچھا۔ دارا کہنے لگا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں نے سوچ لیا ہے کہ ہم یہاں سے کسی طرح کویت یا دوبئی چلے جائیں گے۔ وہاں ہم اپنی ایک نئی صاف ستھری زندگی شروع کریں گے۔ ہمارے پاس کافی روپے ہیں۔ ہم لانچ میں بیٹھ کر جائیں گے۔ وہ لوگ میرے جاننے والے ہیں۔ میں ایک پوری لانچ لے لوں گا۔ تم بالکل مطمئن رہو۔" دلشاد خوش ہو گئی۔

میاں خان کے ڈیرے میں دارا اور دلشاد چار پانچ دن رہے اور اس دوران روبی نہ آئی تو دارا نے کراچی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ وہاں سے اپنی بیوی دلشاد کو ساتھ لے کر کویت کی طرف نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ اسمگلر جو غیر قانونی طور پر لوگوں کو لانچوں کے ذریعے خلیج کے ملکوں میں پہنچاتے تھے دارا کے واقف بلکہ دوست تھے۔ وہ خود ایک مدت تک انکے ساتھ مل کر اسمگلنگ کا دھندا کرتا رہا تھا۔ دارا کے پاس اچھی خاصی رقم تھی۔ وہ پوری کی پوری لانچ خرید کر بھی جا سکتا تھا۔ ایک روز شروع رات میں دارا نے میاں خان کو گلے لگا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور دلشاد کو لے کر لائل پور کی جانب چل پڑا۔ وہاں سے وہ کراچی کی گاڑی

میں سوار ہو گئے اور کراچی جا پہنچے۔ کراچی پہنچنے کے بعد دارا دلشاد کو لے کر شہر سے دور سمندر کے کنارے اسمگلروں کے اڈے پر آگیا۔ یہاں حاتم نامی اسمگلر اس کا بڑا گہرا اور راز دار دوست تھا۔ اسے دارا نے ساری بات بتا دی اور کافی رقم دے کر کہا کہ ہمارے لئے ایک پوری لانچ کا بندوبست کر دو۔ حاتم بولا۔

"دارا! پوری لانچ لے کر کیا کرو گے؟ کچھ روز ٹھہرو۔ قطر سے ہمارا مال آرہا ہے وہ لانچ بالکل نئی ہے۔ ابھی میں یہاں سے مال بھر کر واپس جائے گا۔ تم اس میں سوار ہو کر بحرین اتر جانا۔"

دارا چونکہ وہاں کافی حد تک محفوظ تھا اس لئے راضی ہو گیا دلشاد کو اس نے سمندر کے کنارے والی جھونپڑی میں چھوڑا اور خود شہر آکر اپنے پرانے نوکر بخشو سے ملا اور اسے کہا کہ میں سمندر والے پرانے اڈے پر ہوں۔ اگر روبی کا ادھر آنا ہو تو اسے لے کر وہاں پہنچ جانا۔ میں یہ ملک چھوڑنے سے پہلے اپنی بہن کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔ بخشو بولا۔

"تم کب تک وہاں ہو بیٹا" دارا نے کہا۔ "زیادہ سے زیادہ ہفتہ دس دن لگ جائیں گے۔ اب میں وہاں سے شہر تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔ روبی بہن آئے تو تم خود اسے لے کر میرے پاس آجانا۔" بخشو کو یہ پیغام دے کر دارا واپس چلا گیا۔

اب ہم روبی کی طرف آتے ہیں۔ اس دوران روبی کراچی پہنچ چکی تھی اور ایک ہفتے سے اپنے گھر میں شیر خان اور اپنی پیاری بچی عائشہ کے ساتھ رہ رہی تھی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ جب وہ لاہور سے چلی تھی تو مردانہ لباس میں تھی۔ یعنی اس نے ملیشئے کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر کے بار لڑکوں کی طرح چھوٹے چھوٹے کٹے ہوئے تھے۔ جسم کے گرد موٹی چادر لپیٹ رکھی تھی۔ چاقو اور پستول قمیص کے اندر چھپا رکھا تھا۔ اس حلئے میں اسے اتنی جلدی کوئی نہ تو پہچان سکتا تھا اور نہ کسی کی مشتبہ نگاہ ہی اس پر پڑ سکتی تھی۔ پھر بھی روبی اپنی طرف سے بڑی احتیاط سے کام لے رہی تھی۔ کراچی ریلوے اسٹیشن پر اترنے کے بعد وہ تھرڈ کلاس کے کھلے ویٹنگ روم میں جا کر ایک بنچ پر بیٹھ گئی اور رات کا اندھیرا ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ وہ شام کو پہنچی تھی۔ جب رات کچھ گہری ہو گئی تو اس نے رکشہ لیا اور اپنے محلے سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر رکشا چھوڑ دیا۔ یہ بات اسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

معلوم تھی کہ پولیس وہاں نگرانی کر رہی ہو گی۔ لیکن اتنے دن گزر جانے پر پولیس کی طرف سے کچھ سستی آسکتی تھی چنا ں وہ مکانوں کے ساتھ ساتھ اندھیرے میں چلتی اپنی گلی میں آگئی۔ مکان کا دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہو گئی۔ اس وقت شیر خان باہر چھوٹے سے صحن میں نلکے کے پاس بیٹھا چاول دھو رہا تھا۔ اس نے مڑ کر دیکھا کہ ایک لڑکا سامنے کھڑا ہے۔ پہلی نظر میں وہ روبی کو نہ پہچان سکا۔ جب روبی قریب آئی تو وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے اپنی بچھڑی ہوئی محبوبہ اور بیوی کو گلے سے لگا لیا اور اندر کوٹھری میں لے گیا۔ شیر خان کے ہونٹ جذبات کی شدت سے کپکپا رہے تھے۔ اس نے روبی کو بازو سے پکڑ لیا اور بولا۔

"اب میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔ جئیں گے اکٹھے۔ مریں گے تو اکٹھے مریں گے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔" روبی نے عائشہ کا پوچھا۔ شیر خان بولا۔" وہ مریم کے پاس ہے وہی اس کی دیکھ بھال کرتی ہے تم بیٹھو۔ میں اسے لاتا ہوں۔"

"کیا کہہ کر بچی کو لاؤ گے؟" روبی نے تشویش کے ساتھ کہا۔" کہیں اسے شک نہ پڑ جائے۔ میرے یہاں آنے کا کسی کو علم نہیں ہونا چاہئے۔" شیر خان نے جھنجھلا کر کہا۔

"پتا لگتا ہے تو لگ جائے۔ اب میں کسی سے نہیں ڈرتا ہم دونوں اپنی بچی کے ساتھ مل کر رہیں گے۔" روبی نے جلدی سے اٹھ کر شیر خان کا بازو تھام لیا اور بولی۔

"شیر خان! ہوش سے کام لو۔ میں جیل سے بھاگی ہوئی مفرور قاتلہ ہوں۔ یہاں اگر کسی کے کان میں میرے آنے کی بھنک بھی پڑ گئی تو صبح ہونے سے پہلے پہلے میں گرفتار کر لی جاؤں گی اور پھر عمر قید یا پھانسی کا پھندا میرا مقدر ہو گا۔"

شیر خان نے روبی کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"مگر یہ بھی کوئی زندگی نہیں ہے روبی تم کہیں دربدر پھر رہی ہو۔ میں یہاں اکیلا سہا بیٹھا ہوں۔ ہماری بچی کہاں پرورش پا رہی ہے۔ ایسی زندگی سے تو بہتر ہے کہ ہم ایک بار مل کر رہ لیں۔ اس کے بعد چاہے مجھے موت آجائے۔" روبی نے شیر خان کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"نہیں شیر خان ایسی بات زبان سے مت نکالو۔

تمہیں زندہ رہنا ہے۔ بہت دیر تک زندہ رہنا ہے۔ میری بیٹی کو شیرنی بنانا ہے۔ اس کی اسی طرح پرورش کرنی ہے جس طرح میں تمہیں کہہ چکی ہوں۔ جیسے میں کہتی ہوں ویسے ہی کرو۔ ابھی میں تمہارے پاس ہی ہوں۔ اپنی بچی کے پاس ہی ہوں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ جتنی دیر یہاں رہ سکی رہوں گی۔ تم میری بچی کو جا کر لے آؤ۔ مریم کو کہنا کہ تم بچی کے بغیر اداس ہو گئے ہو اور آج رات وہ تمہارے پاس رہے گی۔ جاؤ۔ خبردار! تمہاری زبان سے کوئی غیر ذمے داری کی بات نہ نکلے۔" شیر خان سر جھکائے کوٹھری سے نکل گیا۔

روبی نے دروازہ بند کر دیا اور اپنے اس گھر کو حسرت بھری نظروں سے دیکھنے لگی جہاں اس نے اپنی زندگی کے بڑے یادگار دن گزارے تھے۔ تھوڑی دیر بعد شیر خان واپس آگیا۔ ننھی سی عائشہ اس کی گود میں سو رہی تھی۔ روبی نے اپنی بچی کو لے کر اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کی آنکھوں میں ممتا کے آنسو آگئے۔ مگر اس نے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے اور شیر خان کی طرف دیکھ کر کہا۔

"شیرنی کبھی نہیں روتی۔ میری بچی کو بھی بڑے ہو کر کبھی مت رونے دینا۔ اسے کہنا کہ اس ملک کی عورتوں نے بہت آنسو بہا لیے ہیں۔ آنسو بہانے کا زمانہ گزر گیا ہے اب اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا حق منوانے کا زمانہ ہے۔"

روبی نے اپنی بچی کا ماتھا چوم لیا۔ بچی جاگ پڑی اور نیند بھری آنکھیں کھول کر اپنی ماں کو تکنے لگی۔ اس نے اپنے ننھے ہاتھوں سے ماں کی ناک پکڑ لی۔ روبی ہنس کر بولی۔

"دیکھو شیرے؟ اس نے مجھے مردانہ حلیئے میں بھی پہچان لیا ہے یہ میری بیٹی ہے۔ شیرنی کی بیٹی ہے۔ یہ بھی بڑی ہو کر شیرنی بنے گی۔"

روبی اپنی بچی کو ساتھ لا کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ شیر خان بولا۔" میں چاول پکانے لگا تھا۔" روبی نے کہا۔

"میں اسٹیشن سے جو کھانا تھا کھا آئی ہوں صرف اپنے لئے بنانا۔" شیر خان ذرا سا مسکرا کر کہنے لگا۔

کیا تم مجھے چاول نہیں بنا دو گی" روبی نے کہا۔

"کیوں؟ کیا تم نہیں پکا سکتے۔؟ اب تک تمہیں کھانا پکانا آ جانا چاہئے تھا۔ عورتیں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صرف کھانا پکانے کے لئے نہیں ہوتیں۔ جو مرد ایسا سمجھتے ہیں میں ان کی جانی دشمن ہوں۔" شیر خان مسکراتے ہوئے بولا۔

"وہ تو میں جانتا ہوں۔" روبی نے شیر خان کے ساتھ ہی کوٹھری میں رہنا شروع کر دیا۔ وہ سارا دن کوٹھری میں رہتی۔ ایک پل کے لئے بھی باہر نہ نکلتی تھی۔ شیر خان کام پر جاتا تو مکان کو باہر سے تالا لگا جاتا۔ روبی کوٹھری سے نکل کر صحن میں بھی بڑی احتیاط سے آتی۔ اس کی بچی سارا دن اور رات کو ہمسائی مریم کے پاس ہی رہتی تھی۔ صرف شام کے وقت معمول کے مطابق شیر خان بچی کو اپنے گھر لے آتا تھا۔ وہ پہلے بھی ایسا ہی کیا کرتا تھا۔ دونوں میاں بیوی بچی سے کھیلتے۔ روبی جی بھر کر اسے پیار کرتی اور عشاء کی اذان کے بعد شیر خان بچی کو واپس مریم کے پاس چھوڑ آتا۔ کبھی مریم خود بچی کو لینے آجاتی اس وقت روبی مکان میں کسی جگہ چھپ جاتی۔ روبی کے پاس جو رقم تھی وہ اس نے شیر خان کے حوالے کر دی تھی۔ اس نے اپنی ساری کہانی اسے سنا دی تھی اور کہا۔

"دارا نے اس کا بڑا ساتھ دیا ہے۔ وہ تو حقیقی بھائیوں سے بھی بڑھ کر نکلا۔" شیر خان کہتا۔

"وہ مرد کی اولاد ہے اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔"

شیر خان نے بھی روبی کو بتایا کہ سہراب کے قتل کے بعد اس کا غنڈہ بھائی ہاشم اسے طرح طرح سے پریشان کرتا رہتا ہے۔ مگر میں مجبور ہوں۔ عائشہ کی وجہ سے میرے پاؤں میں زنجیر پڑ گئی ہے۔ وگرنہ اب تک ہاشم کی لاش بھی غائب کر چکا ہوتا۔ روبی غور سے سنتی رہی۔ پھر اس نے باتوں ہی باتوں میں شیر خان سے ہاشم بدمعاش کے ٹھکانے کا پتا معلوم کر لیا اور خاموش رہی۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ روبی کو اپنے گھر میں چھپے ہوئے ہفتے سے زیادہ دن ہو گئے تھے مگر ابھی تک محلے میں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دونوں بڑی احتیاط اور رازداری سے کام لے رہے تھے۔ لیکن دل میں روبی کو احساس تھا کہ وہ زیادہ دن اپنے خاوند اور اپنی پیاری بچی کے پاس نہیں رہ سکے گی۔ کیونکہ اس نے اپنی موجودگی سے ان دونوں کی زندگیوں کو مسلسل خطرے میں ڈال رکھا تھا۔ کسی

روز بھی مخبری ہو گئی تو پولیس وہاں چھاپہ مارے گی اور دونوں طرف سے گولیاں چلنی شروع ہو جائیں گی اور پھر کچھ پتا نہیں کہ کون زندہ رہتا ہے۔ یہ وہ دن تھے جب دارا بھی اپنی نو بیاہتا دلہن دلشاد کو لے کر کراچی پہنچ چکا تھا اور ساحل سمندر والی اسمگلروں کی بستی میں اپنے اسمگلر دوست حاتم کی جھونپڑی میں مقیم تھا اور قطر دوبئی سے لانچ کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب تین چار روز گزر گئے اور دوبئی قطر سے وہ اسمگلنگ کا مال کے کر لانچ نہ آئی تو دارا بے چین ہو گیا۔ دلشاد بھی بے چین تھی وہاں اس کا دل ذرا نہ لگتا تھا۔ دارا نے ایک شام حاتم سے کہا۔ "حاتم میرے پاس کافی رقم ہے۔ تم مجھے پوری لانچ دلوا دو۔ میں سمندری راستے سے واقف ہوں۔ دلشاد کو لے کر نکل جاؤں گا۔ مگر حاتم نہیں چاہتا تھا کہ وہ اتنے خطرناک سمندر میں اکیلا سفر کرے۔ یہ تجربہ کار اسٹیمر چلانے والوں کا ہی کام تھا جو سمندر کے مزاج سے واقف تھے۔ اس نے یہ کہہ کر روک دیا کہ وہ دو دن مزید دیکھ لے۔

دارا اور دلشاد ساحل سمندر سے ذرا ہٹ کر ایک جھونپڑا نما کیبن میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہاں ان دونوں کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ صرف لانچ کے انتظار کی کوفت اٹھانی پڑ رہی تھی۔ یہ تھی تو ملاحوں کی بستی مگر وہاں' اسمگلروں نے بھی اپنے خفیہ اڈے قائم کر رکھے تھے۔ پولیس کے چھاپے بھی پڑتے رہتے تھے۔ اسمگلنگ کا ناپاک کام بھی ہو رہا تھا۔ مال سے لدی ہوئی لانچیں پکڑی بھی جاتی تھیں۔ جرائم پیشہ اسمگلر گرفتار بھی ہوتے لیکن جلد ہی ان کی جگہ دوسرے اسمگلر لے لیتے۔ بہرحال پولیس اور کوسٹل سیکورٹی گارڈز ان لوگوں سے غافل نہیں تھے۔ پولیس نے تو خاص طور پر یہاں اپنے مخبر چھوڑ رکھے تھے جن میں سے کچھ اسمگلروں سے بھی ملے ہوئے تھے اور پولیس کا نام رکھنے کے لئے کبھی کبھی معمولی سامان سے بھری ہوئی لانچ پکڑوا بھی دیتے تھے جن پر کوئی اسمگلر سوار نہیں ہوتا تھا۔ لیکن کچھ دیانت دار بھی تھے اور وہ پولیس کو رتی رتی کی خبر پہنچا دیتے تھے۔ ان میں سے ایک مخبر ایسا بھی تھا جو دارا کو جانتا تھا اور اسے معلوم تھا کہ دارا ایک مفرور قاتل ہے اور پولیس کو اس کی تلاش ہے۔ جب دارا اور دلشاد وہاں آکر ٹھہرے تو یہ مخبر چھٹی لے کر اپنی بیمار ماں کے پاس گاؤں گیا ہوا تھا۔ تین چار دن بعد واپس آیا تو حاتم کے ساتھ دارا کو باتیں کرتا دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس نے دارا کو پہچان لیا تھا۔ دارا ایک عرصے تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اسی جگہ اسمگلنگ کا کام چلاتا رہا تھا۔ مخبر نے بہت جلد پتا چلا لیا کہ دارا دلشاد نامی ایک عورت کے ساتھ وہاں ٹھہرا ہوا ہے اور دبئی سے آنے والی اسمگلنگ لانچ کا انتظار کر رہا ہے۔

مخبر نے جب پوری معلومات حاصل کر لیں تو پولیس کو اطلاع کر دی۔ پولیس کو قاتل دارا کی پہلے ہی سے تلاش تھی۔ انسپکٹر شہباز نے پولیس کمانڈوز کی ایک پارٹی ساتھ لی اور حاتم کے ساحل سمندر والے ٹھکانے کی طرف تیزی سے روانہ ہوا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ آسمان پر سنہری روشنی کا غبار پھیلا ہوا تھا جو سرِ شام کراچی کی خاص روشنی ہوتی ہے اور جسے انگریزی میں ٹوئی لائٹ کہتے ہیں اور یہ روشنی ساحلی علاقوں میں بڑی دیر تک قائم رہتی ہے۔ پولیس پارٹی مچھیروں اور اسمگلروں کی بستی سے تھوڑی دور پیچھے ہی رک گئی۔ مخبر وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس نے انسپکٹر شہباز کو بتایا کہ مفرور قاتل دارا اس وقت اپنی عورت کے ساتھ تلائی والے جھونپڑے میں موجود ہے۔ پولیس کمانڈوز نے خاموشی سے شام کے جھٹپٹے میں جھونپڑے کا محاصرہ کر لیا۔ دارا جھونپڑے کے شکستہ کیبن میں دلشاد کے پاس بیٹھا اس سے کہہ رہا تھا کہ اگر کل تک لانچ نہ آئی تو ہم اپنی لانچ لے کر وہاں سے نکل جائیں گے۔

اچانک دارا کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا کہ کوئی خطرہ ہے۔ اس نے گردن گھما کر جھونپڑے کے ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے میری جان؟" دلشاد نے دارا کو اچانک چوکس ہوتے دیکھ کر پوچھا۔ دارا نے فوراً لالٹین بجھا دی اور جیب سے پستول نکال کر کہا۔

"شادو! سمندری چٹانوں کی طرف بھاگ جاؤ۔"

مگر اس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔ پولیس نے انہیں گھیر لیا تھا۔ ایک دم سے جھونپڑے کی خستہ لکڑی کی دیواروں پر تھری ناٹ تھری رائفلوں کی گولیاں برسنے لگیں۔ دلشاد اور دارا فرش پر لیٹ گئے۔ دارا نے بھی پستول سے فائرنگ شروع کر دی اور دلشاد کو لے کر اندھیرے میں باہر کی طرف کھسکنے لگا۔ ادھ کھلے دروازے پر گولیاں برس رہی تھیں۔ پھر فائرنگ رک گئی اور انسپکٹر شہباز نے بلند آواز سے دارا کو حکم دیا۔

"ہتھیار پھینک کر باہر نکل آؤ۔ مقابلہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تم اپنی عورت کے ساتھ مارے جاؤ گے۔" اس دوران دلشاد رینگ کر جھونپڑے سے باہر نکل چکی تھی۔ دارا جانتا تھا کہ اس کے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے اس نے چیخ کر کہا۔

"شادو! کہاں جا رہی ہو؟" مگر شادو شام کے سرمئی دھندلکے میں اس کی نظروں سے غائب ہو چکی تھی۔ انسپکٹر شہباز نے ایک بار پھر پکار کر دارا کو ہاتھ کھڑے کر کے باہر نکل آنے کا حکم دیا۔ دارا نے پستول میں نیا میگزین بھرا اور کہنیوں کے بل رینگتا جھونپڑے کے دروازے تک آ گیا۔ اس نے ذرا سی گردن باہر نکال کر دیکھا۔ اسے اردگرد چھوٹی چھوٹی سمندری چٹانوں کے اوپر کچھ دکھائی نہ دیا۔ پولیس ان چٹانوں کے پیچھے تھی اس نے چلا کر شادو کو آواز دی۔ جب شادو کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو وہ اٹھ کر چٹانوں کی طرف دوڑا۔ دائیں اور بائیں پہلو سے اس پر گولیوں کی بوچھاڑ پڑی دو گولیاں دارا کی ٹانگ میں سے گزر گئیں۔ وہ گر پڑا مگر خون کی گرمی سے اٹھا اور دلشاد کو آواز دی۔ وہ اس وقت پولیس کو بھول چکا تھا۔ اور صرف اسے دلشاد اپنی پہلی اور آخری محبت ہی یاد تھی۔ دلشاد اس وقت ریت پر رینگتی ہوئی اندھیرے میں ایک کانٹیبل کے پیچھے آ گئی تھی۔ بھروسہ اچھل کر اس پر گرنی اور جذبات کی گرمی اور جوش میں اس نے سپاہی سے رائفل چھین کر اس پر فائر کر دیا۔ سپاہی گولی کھا کر پیچھے گرا۔ عین اس وقت دارا نے اسے پکارا۔ دلشاد نے چلا کر جواب دیا۔

"ڈٹے رہو میری جان! زندہ رہے تو مل جائیں گے۔ نہیں تو اگلے جہان میں اب میل ہوں گے۔"

دلشاد کی آواز نے دارا کے خون میں جیسے شعلے بھر دیے اس کے حلق سے ایک بھیانک آواز بلند ہوئی اور وہ کھڑے ہو کر دائیں بائیں آگے پیچھے پستول سے فائر کرنے لگا۔ اس کی ٹانگ سے خون کا پرنالہ بہہ رہا تھا۔ تھری ناٹ تھری کی گولیوں نے ٹانگ کا ایک جگہ سے گوشت اور ہڈی اڑا دی تھی۔ انسپکٹر شہباز اور اس کے سپاہیوں نے دارا کو دیکھ لیا تھا۔ اس کی فائرنگ سے دو سپاہی جھاڑے نکل کر دوسری طرف گئے تھے گولی کھا کر وہیں ڈھیر ہو گئے۔ ایک گولی انسپکٹر کے چہرے کے قریب سے ہو کر نکل گئی۔ وہ ہر حالت میں دارا کو زندہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گرفتار کرنا چاہتا تھا مگر وہاں افراتفری میں فائر ہو رہے تھے۔ ایک گولی دارا کی گردن میں لگی۔ خون کا فوارا سا اڑا اور دارا لڑکھڑا کر گر گیا۔ انسپکٹر نے چیخ کر کہا۔

"فائر بند کر دو۔" فائرنگ بند ہو گئی۔ انسپکٹر شہباز دوڑ کر دارا کے قریب گیا۔ اس کی آدھی گردن تھری ناٹ تھری کی گولی لگنے سے اڑ چکی تھی اور خون نکل نکل کر ساحل کی ریت میں جذب ہو رہا تھا۔ اس کا پستول اس کی بے جان انگلیوں میں ڈھلک گیا تھا۔ دارا مر چکا تھا۔

انسپکٹر شہباز نے اس کا پستول قبضے میں لے لیا اور سپاہیوں کی لاشوں کو بھی ایک جگہ رکھ دیا۔ تین سپاہی مر گئے تھے۔ چار زخمی ہوئے تھے۔ زخمیوں کو اسی وقت جیپ میں ڈال کر ہسپتال کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ انسپکٹر نے کہا۔

"وہ عورت کہاں ہے۔ اسے تلاش کرو۔"

وہ عورت یعنی دارا کی نوبیاہتا بیوی اور گھر سے بھاگی ہوئی طوائف دلشاد بھی پولیس کو مل گئی۔ لیکن اس حالت میں کہ گولیوں نے اس کے سینے میں دو شگاف ڈالے ہوئے تھے۔ وہ خون میں لت پت سمندری سنگ ریزوں پر پڑی تھی اور اس کی روح اس کے جسم سے پرواز کر چکی تھی۔ جس طوائف کو ہم ہرجائی کہتے آئے ہیں اور نہ جانے کب تک کہتے چلے جائیں گے اسی نے اپنی جان دے کر وفا کی لاج رکھ لی تھی۔ مچھیروں کی اس گمنام بستی میں رہنے والوں کا کہنا ہے کہ آج بھی پورے چاند کی رات کو سمندری چٹانوں میں کسی عورت کی آواز سنائی دیتی ہے جو بڑے حسرت بھرے انداز میں کسی کو اپنی طرف بلاتی ہے اور پھر کھلے سمندر کی طرف غائب ہو جاتی ہے۔ عورت کبھی طوائف نہیں ہوتی۔ مرد اسے طوائف بناتے ہیں۔ ایک مرد نے جس کا نام دارا تھا اور جسے بدمعاش کہہ کر ہمارے معاشرے نے ٹھکرا دیا تھا ایک ٹھکرائی ہوئی طوائف کو اپنی بیوی بنا کر بھرے معاشرے میں باعزت مقام دینا چاہا لیکن سماج نے دارا کو معاف نہ کیا اور پولیس کی گولیوں نے ان دونوں کے سینے چھلنی کر دیے اور دونوں دھتکارے ہوئے انسان ایک چھوٹے سے گھر میں ہنستے کھیلتے بچوں کا خواب اپنے ساتھ ہی لے کر قبروں میں اتر گئے۔

روبی کو دارا کی پولیس مقابلے میں موت کی خبر شیر خان نے سنائی۔ روبی کو اس کی

موت کا بڑا صدمہ ہوا۔ اس سے ملنے کی آس اب ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گئی تھی۔ اسے شدت سے احساس ہوا کہ وہ اکیلی رہ گئی ہے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے خاوند اور بچی عائشہ سے الگ نہیں ہو گی چاہے اسے اپنی جان کی قربانی کیوں نہ دینی پڑے۔ شیر خان اس کے اس فیصلے سے بڑا خوش ہوا۔ وہ تو شروع ہی سے روبی کے پولیس سے چھپ کر مارے مارے پھرنے کے خلاف تھا۔ خطرہ صرف یہ تھا کہ اگر پولیس نے ان کے ہاں اچانک چھاپہ مارا تو روبی کے ساتھ شیر خان بھی پکڑ لیا جائے گا۔ اس پر ایک مفرور قاتلہ کو اپنے ہاں چھپائے رکھنے کے جرم میں مقدمہ چل سکتا تھا۔ اسی روز رات کو روبی نے اپنی پیاری بچی عائشہ کو تھپک تھپک کر سلانے کے بعد شیر خان سے کہا۔

"آج رات بچی ہم نے اپنے پاس ہی رکھی ہے۔ مریم کو کہیں شک تو نہیں پڑے گا؟" شیر خان بولا۔

"نہیں اس لئے کہ ایک دو بار پہلے بھی میں بچی کو رات کے وقت اپنے پاس لے آیا تھا۔"

روبی ابھی تک مردانہ شلوار قمیص میں ہی تھی۔ اس کے سر کے بال بڑھ رہے تھے۔ اس نے ایک نظر سوئی ہوئی معصوم بچی پر ڈالی اور شیر خان سے کہا

"شیرے! میرا خیال ہے ہم یہاں سے نکل کر کسی دور دراز پہاڑی علاقے میں جا کر آباد ہو جاتے ہیں۔ کسی ایسی جگہ جہاں پولیس ہمارا تعاقب نہ کر سکے۔" شیر خان خوش ہو کر بولا۔

"یہ بات تو میں پہلے بھی تمہیں کئی بار کہہ چکا ہوں۔ پاکستان بہت بڑا ملک ہے۔ ہم ہنزہ کاغان کی وادیوں میں کسی جگہ چلے جائیں گے۔ وہاں کوئی بھی ہمیں نہیں پہچانے گا۔ مجھے کوئی نہ کوئی محنت مزدوری کا کام مل جائے گا۔"

روبی اپنی بچی کو اپنے ساتھ رکھنے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھنے کی خاطر یہ سب کچھ کر رہی تھی۔ اس کے سینے میں ممتا کے جذبات پوری شدت سے بیدار ہو گئے تھے۔ وہ کہنے لگی۔

"میرے پاس اتنے پیسے ہیں کہ ہم وہاں جا کر کچھ وقت سکون سے گزار سکتے ہیں۔ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے بعد دیکھا جائے گا۔ کم از کم ہم تینوں ایک دوسرے کی آنکھوں کے سامنے تو رہیں گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" شیر خان خوش ہو کر بولا۔

"ہم کل ہی کراچی سے کاغان کی طرف روانہ ہو جائیں گے۔ مگر لاہور تک ہمیں الگ الگ سفر کرنا ہو گا۔ بچی کو میں اپنے پاس ہی رکھوں گا۔ تم اسی ٹرین کے زنانہ ڈبے میں سفر کرو گی۔ میں صبح ہی معلوم کرتا ہوں کہ رات کے وقت کراچی سے کونسی گاڑی پنجاب کو جاتی ہے۔"

اس زمانے میں ایک ریل گاڑی کراچی سے لاہور رات کے پچھلے پہر چلا کرتی تھی۔ یہی گاڑی ان کے لئے مناسب تھی۔ روبی اور شیر خان نے اگلے روز سارا پروگرام طے کر لیا۔ شیر خان اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا۔ جاتے ہوئے بچی کو وہ حسب معمول ہمسائی مریم کے حوالے کر گیا اور یہ بھی کہہ گیا کہ رات کو بچی میرے پاس بڑے سکون کے ساتھ سوئی تھی۔ اس لئے آج کی رات بھی میں اپنی بچی کو اپنے پاس ہی رکھوں گا۔ مریم کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ شیر خان مکان کو تالا لگا گیا تھا۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ گھر میں کوئی نہیں ہے۔ حالانکہ گھر میں روبی موجود تھی۔

دوسری طرف بدمعاش ہاشم شیر خان سے اپنے بھائی سہراب کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ اس سے کچھ اس طریقے سے اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لینا چاہتا تھا کہ شیر خان اور اس کی مغرور بیوی کی آنے والی نسلیں بھی اسے یاد کر کے آنسو بہاتی رہیں۔ ورنہ اگر شیر خان کو قتل کرنا ہوتا تو یہ کام ہاشم جیسا بدمعاش اب تک سرانجام دے چکا ہوتا۔ اسے یہی خبر تھی کہ شیر خان کی بیوی روبی مغرور ہے اور شیر خان اپنی بچی کے ساتھ گھر میں اکیلا ہی رہتا ہے اور بچی کی دیکھ بھال ہمسائے میں مریم نام کی ایک عورت کر رہی ہے۔ ہاشم بدمعاش نے شیر خان سے اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لینے کا باقاعدہ ایک منصوبہ تیار کیا اور جس روز روبی اور شیر خان اپنی بچی کو لے کر کراچی سے کاغان کی طرف فرار ہونے والے تھے اسی روز ہاشم نے بھی اپنے انتقامی منصوبے پر عمل درآمد کا پروگرام طے کر رکھا تھا۔ ہاشم نے اپنے آدمیوں کی مدد سے یہ پتا کروا لیا تھا کہ شیر خان کی بچی صبح

سے شام تک ہمسائی مریم کے پاس رہتی ہے۔ شیر خان رات کو سینما سے واپس آتا ہے تو بچی کو تھوڑی دیر کے لئے گھر لے آتا ہے اور دوبارہ مریم کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ اسی روز شام ہوتے ہی ہاشم نے اپنے آدمیوں کو تیار کر کے جیپ میں شیر خان کے محلے کی طرف روانہ کر دیا۔ یہ کل چار آدمی تھے۔ انہوں نے گاڑی محلے کے باہر ایک طرف ویران جگہ پر کھڑی کر دی۔ دو آدمی گاڑی میں ہی بیٹھے رہے۔ دو غنڈے مریم کے مکان کی طرف روانہ ہو گئے۔ ان میں سے ایک غنڈہ گلی کے نکڑ پر ہی پستول لے کر نیم تاریکی میں کھڑا ہو گیا۔ دوسرا غنڈہ گلی میں آ گیا گلی اس وقت خالی تھی۔ شیر خان کی ہمسائی مریم کے مکان کی نشان دہی ہو چکی تھی۔ غنڈے کا ایک ہاتھ جیکٹ کی جیب میں تھا۔ اسی جیب میں پلاسٹک کی ایک تھیلی تھی۔ تھیلی کے اندر کلوروفارم سے بھیگا ہوا تر بتر رومال بند تھا۔ جب یہ غنڈہ مریم کے مکان کے سامنے آیا تو اس نے جیب کے اندر ہی پلاسٹک کی تھیلی میں ہاتھ ڈال کر کلوروفارم میں بھیگا ہوا رومال مٹھی میں لے لیا۔

مریم کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ اس نے دروازے کو دھکیلا۔ وہ کھل گیا۔ کواڑ کا چھوٹا سا صحن خالی تھا۔ غنڈہ لپک کر کوٹھری والے دروازے پر آ گیا۔ یہ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اس نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے مریم نے پوچھا۔

"کون ہے۔" غنڈے نے بڑی نرم آواز بنا کر کہا۔

"بہن جی! میں ہوں حکیم دین۔ شیر خان کے ساتھ سینما میں کام کرتا ہوں۔ شیر خان نے اپنی بچی کے واسطے یہ کھلونا بھیجا ہے۔ لے لیں۔" مریم نے آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔

جونہی اس نے دروازہ کھولا غنڈے نے جھپٹا مار کر مریم کو گردن سے دبوچا اور نیچے گرا لیا۔ ساتھ ہی اس کے منہ میں کلوروفارم والا رومال ٹھونس دیا۔ مریم کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔ اسنے دو چار لمبے لمبے سانس لیے اور بے ہوش ہو گئی۔ غنڈے کو جب اطمینان ہو گیا کہ مریم بالکل بے ہوش ہو چکی ہے تو وہ شیر خان کی بچی کی طرف متوجہ ہوا جو چھوٹی سی پلنگڑی پر بڑے معصوم انداز میں اپنے ننھے ننھے ہاتھ پاؤں چلا رہی تھی۔ غنڈے نے اسے اٹھا کر چادر میں لپیٹا اور بڑے اطمینان سے گلی سے گزرتا جیپ کی طرف آ گیا۔ اس کا ساتھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

غنڈہ جو گلی کی نکڑ پر پہرہ دے رہا تھا اب اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ بچی کو جیپ میں ڈالتے ہی جیپ وہاں سے تیزی سے نکلی اور بڑی سڑک پر آتے ہی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

شیر خان کے گھر میں اس وقت روبی موجود تھی اور پلنگ پر لیٹی سوچ رہی تھی کہ وہ رات کے بارہ بجے گھر سے نکل کر ریلوے اسٹیشن پہنچ جائے گی۔ شیر خان کو رات تین بجے نکلنا ہو گا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ سر پر صافہ باندھ لے گی۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ مریم کے ہاں سے ہاشم کے آدمی اس کی بچی کو اغوا کر کے لے جا چکے ہیں مریم کوٹھری کے فرش پر بے ہوش پڑی تھی۔ ہاشم بدمعاش کے آدمی کوئی ڈاکٹر تو تھے نہیں۔ انہیں کیا پتا تھا کہ مریم کو کتنا کلوروفارم سنگھانا ہے انہوں نے رومال تر کر کے دیر تک اس کی ناک اور منہ پر دبائے رکھا تھا جس کی وجہ سے مریم ضرورت سے زیادہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ وہ نیم مردہ حالت میں تھی۔ گلی میں باہر خاموشی تھی۔ شیر خان سینما ہاؤس میں نو بجے والا شو چلا کر پیٹ میں درد کا بہانہ بنا کر گھر واپس آ گیا۔ روبی بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ شیر خان بازار سے نان کباب لیتا آیا تھا۔ کیونکہ چولہا جلانے کے لئے روبی مکان کے صحن میں نہیں جاتی تھی۔ روبی نے شیر خان کے آتے ہی کہا۔

"تم مریم کے ہاں جا کر میری عائشہ کو لے آؤ۔"

پروگرام یہی تھا کہ روبی اپنی بچی کو لے کر پہلے نکل جائے گی اور اسٹیشن کے تھرڈ کلاس والے کھلے ویٹنگ روم میں شیر خان کا انتظار کرے گی۔ شیر خان کو رات بارہ بجے کے بعد گھر سے نکلنا تھا۔ انہوں نے سارا انتظام کر لیا تھا۔ صرف روبی کے پاس پستول اور گولیاں تھیں۔ شیر خان کے پاس پستول وغیرہ نہیں تھا۔ وہ اپنے پاس کوئی اسلحہ رکھنا بھی نہیں چاہتا تھا شیر خان نے کہا۔

"پہلے نان کباب کھاتے ہیں۔ پھر میں مریم کے ہاں جا کر بچی کو لے آؤں گا۔ ساتھ ہی تو اس کا گھر ہے۔"

دونوں نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ اس وقت رات کے سوا دس بج رہے تھے۔ شیر خان مریم کے گھر کی طرف گیا۔ اس نے دروازے پر دستک دے کر مریم بہن کہہ کر آواز دی۔ اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ شیر خان نے دروازے کو ذرا سا ٹھوکا دیا تو وہ کھل گیا۔ دروازہ اندر سے بند کیوں نہیں؟ شیر خان نے ایک بار پھر مریم کو آواز دی۔ جب تین چار مرتبہ بلانے پر بھی اندر سے کسی نے جواب نہ دیا تو شیر خان صحن میں آ گیا۔ کوٹھری کا دروازہ بھی تھوڑا سا کھلا تھا اور اندھیرا چھایا تھا۔ مریم نے بتی بھی نہیں جلائی تھی۔ شیر خان کے دل میں طرح طرح کے خیال آنے لگے۔ وہ کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ تاریک فضا میں اسے کلوروفارم کی ہلکی ہلکی ناگوار سی بو محسوس ہوئی۔ شیر خان حیران ہوا کہ یہ کس قسم کی بو ہے اور مریم کہاں ہے؟ اس کی بچی کہاں ہے؟ اس نے دیوار کو ٹٹول کر بتی جلائی تو یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ فرش پر مریم بے ہوش پڑی تھی اور بچی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ شیر خان نے جلدی سے مریم کو ہوش میں لانے کے واسطے گھڑے میں سے پانی لے کر اس کے منہ پر چھینٹے مارے۔ مریم کو کچھ ہوش آ گیا۔ شیر خان نے گھبرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"کیا ہوا مریم؟ بچی کہاں ہے" مریم سر پکڑ کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے سہمی ہوئی خشک آواز میں شیر خان کو بتایا۔

"ایک آدمی اس کی کوٹھری میں آیا۔ اس نے اسے کچھ سنگھایا اور بچی کو اٹھا کر لے گیا۔ میں بے ہوش ہو گئی۔ پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔" مریم روتے ہوئے شیر خان سے معافی مانگنے لگی کہ وہ اس کی بچی کی حفاظت نہیں کر سکی۔

شیر خان تو جیسے سکتے میں آ گیا۔ اس کی بچی کو کون اغوا کر سکتا ہے؟ ہاشم ..... ہاں ہاشم ہی اس کا دشمن ہے۔ یہ کام سوائے اس کے دوسرا کوئی نہیں کر سکتا۔ شیر خان کی وہاں سوائے ہاشم بدمعاش کے اور کسی سے دشمنی نہیں ہے۔ اس نے مریم سے آدمی کا حلیہ پوچھا۔ مریم نے کہا۔

"اس کی مونچھیں تھیں۔ اس نے منڈا سا باندھ رکھا تھا۔" یہ کہہ کر مریم نے نقاہت سے اپنا بوجھل سر چارپائی کی پٹی سے لگا دیا۔

شیر خان نے مریم کو سہارا دے کر چارپائی پر لٹایا اور کہا۔

"مریم بہن؟ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ میں جانتا ہوں میری بچی کو کون لے گئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہیں۔ تم اپنی زبان بند رکھنا۔" یہ کہہ کر شیر خان اپنے مکان میں آگیا۔ روبی نے شیرے کو خالی ہاتھ آتے دیکھا تو پوچھا۔

"کیا بات ہے عائشہ کو کیوں نہیں لائے؟" شیر خان کا چہرہ پتھر کی طرح ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔

"ہماری بچی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔" روبی کو یوں لگا جیسے اس کے جسم کے اندر ایک دھماکہ سا ہوا ہے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے چہرے کی رگیں تن گئیں۔

"کیا کیا کہہ رہے ہو؟" شیر خان نے دونوں ہاتھوں سے روبی کے کندھوں کو تھام لیا اور اسے چارپائی پر بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

روبی! تم بیٹھو۔ بیٹھ جاؤ۔ یہ کام ..... یہ کام ہاشم کا ہے۔ اسی کے آدمی مریم کو بے ہوش کر کے ہماری بچی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ بس ..... سب کچھ ختم ہو گیا۔ میں ان میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" شیر خان پھنکار رہا تھا۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔

روبی ایک دم سے خاموش ہو گئی تھی۔ شیر خان پنجرے میں بند شیر کی طرح کوٹھری میں چکر لگا رہا تھا۔ روبی نے صدری میں ہاتھ ڈال کر پستول کو اپنی مضبوط گرفت میں لیا چارپائی سے بظاہر بڑے اطمینان سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ شیر خان نے تڑپ کر پوچھا۔

"کہاں جا رہی ہو؟" روبی نے ہاتھ سے دھکا دے کر شیر خان کو چارپائی پر گرا دیا اور غراہٹ نما آواز میں بولی۔

"میرے پیچھے مت آنا شیرے۔ اب میرا اور ہاشم کا مقابلہ ہے۔ گیدڑ شیرنی کے بچے کو اٹھا لے جائے؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔" یہ کہہ کر روبی چھلانگ لگا کر کوٹھری سے صحن میں آئی اور پھر صحن کا دروازہ کھول کر گلی کے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

شیر خان روبی کے پیچھے دوڑا مگر گلی رات کے وقت دور تک خالی تھی وہ اسے آواز بھی نہیں دے سکتا تھا وہ دوڑتا ہوا اس جگہ آیا جہاں بڑی سڑک گزرتی تھی روبی وہاں بھی نہیں تھی۔ شیر خان کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے اسے اتنا احساس تھا کہ روبی ہاشم کے ڈیرے پر ہی گئی ہے۔ یہ شہر کے سب سے بدنام ترین اور خطرناک غنڈوں کا ڈیرا تھا روبی کا اکیلے وہاں جانا کسی حالت میں بھی ٹھیک نہیں تھا۔ شیر خان کو ہاشم بدمعاش کے ڈیرے کا پتا نہیں تھا سینما میں ایک گیٹ کیپر تھا جسے ہاشم کے ڈیرے کا علم تھا وہ وہاں کبھی کبھی جاتا رہتا تھا شیر خان نے مکان کو تالا لگایا اور سینما کی طرف تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ اسے وہاں کوئی رکشا ٹیکسی نظر نہ آئی۔ وہ پیدل ہی چل پڑا۔

اس وقت روبی مردانہ حلیئے میں ایک رکشے میں سوار تھی اور رکشا دارا کے گیراج والے مکان کی طرف جا رہا تھا روبی بخشو چاچا سے ہاشم کے ڈیرے کا پتا معلوم کرنا چاہتی تھی۔ روبی نے رکشے والے کو دارا کے گیراج کے قریب ہی ایک طرف کھڑا رہنے کو کہا اور خود گیراج کے چھوٹے سے احاطے میں آگئی۔ سامنے ایک بیٹھک تھی جس میں روشنی ہو رہی تھی۔ روبی نے دروازے پر جا کر بخشو کو آواز دی۔ بخشو نے ابھی ابھی چائے بنائی تھی اور چارپائی پر بیٹھا مزے سے پی رہا تھا۔ آواز سن کر باہر آگیا کمرے سے آتی روشنی میں اس نے مردانہ حلیئے میں بھی روبی کو پہچان لیا۔

"بیٹی تم! اندر آجاؤ۔" روبی نے کہا۔

"اندر بیٹھنے کا میرے پاس وقت نہیں ہے مجھے ہاشم بدمعاش کے ڈیرے کا پتا بتا دو بس میں صرف اسی کام کے لئے تمہارے پاس آئی ہوں۔" بخشو سمجھ گیا کہ روبی آگ میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چھلانگ لگانے کا فیصلہ کر کے نکلی ہے اس نے پوری طرح روبی کو ہاشم کے ڈیرے کا پتا سمجھا دیا جب روبی جانے لگی تو بخشو نے کہا۔

"بیٹی! ایک بار پھر سوچ لو تم اکیلی ہو۔"

روبی نے گردن موڑ کر بخشو کو دیکھا اور کہا۔

"شیرنی اکیلی ہی ہوتی ہے۔"

ہاشم بدمعاش کا ڈیرا کراچی شہر کے مشرق میں ایک غیر آباد علاقے میں واقع تھا۔ کراچی ابھی اپنی حدود سے باہر نہیں نکلا تھا ایک دو اضافی بستیاں زیر تعمیر تھیں۔ ہاشم کا ڈیرا ایک چھوٹے سے احاطے میں تھا جس کے پیچھے دو تین چھوٹے چھوٹے ٹیلے تھے۔ روبی نے کچی سڑک پر رکشا چھوڑ دیا خود اتر کر دور ہی سے ہاشم کے ڈیرے پر ایک نظر ڈالی۔ احاطے کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اندر سامنے کی جانب دو تین کمرے تھے جن میں سے ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی۔ باہر بھی ایک جانب بجلی کا بلب دیوار کے ساتھ جل رہا تھا جس کے نیچے تخت پر کچھ لوگ بیٹھے شاید شغل مے نوشی کر رہے تھے کیونکہ ان کے بے ہنگم قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

روبی نے پستول کو چیک کیا پستول میں پورا میگزین تھا۔ اس نے پستول واپس صدری کی جیب میں رکھ لیا اور ڈیرے کے احاطے کی طرف بڑھی۔ ایک نوجوان سا لڑکا احاطے سے باہر نکل رہا تھا۔ روبی نے اسے بلا کر کہا۔

"بھائی! میرا نام صمد خان ہے میں مردان سے آیا ہوں۔ مجھے بخت خان نے بھیجا ہے۔ مجھے ہاشم سے ملنا ہے۔ وہ کہاں ملے گا۔ بخت خان نے سودے کے بارے میں ایک ضروری پیغام دیا ہے جو صرف ہاشم کو ہی دینا ہے۔"

اس دبلے پتلے نوجوان نے روبی کو اوپر سے نیچے تک دیکھا وہاں زیادہ روشنی نہیں تھی روبی نے وہی ملیشئے کی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ شانوں پر چادر لپیٹی ہوئی تھی۔ روبی نے کہا "بھائی! مجھ پر شک کرنے کی ضرورت نہیں میں بخت خان کا بیٹا ہوں اور اب کراچی میں ہی مال سپلائی کرتا ہوں" شمال سے ہاشم کے ڈیرے پر مال آیا ہی کرتا تھا۔ نوجوان نشے میں نہیں تھا۔ کہنے لگا۔

"ہاشم تو اس وقت ڈیرے میں نہیں ہے۔"

روبی نے پوچھا "تو بھائی مجھے بتا دو وہ کہاں ہے۔ اس وقت اس کا ملنا بہت ضروری ہے میں صبح پہلی گاڑی میں واپس مردان جا رہا ہوں۔"

نوجوان بولا "ہاشم تمہیں اس وقت مال گودام والے ڈیرے پر ہی ملے گا۔ وہ دوپہر کو ہی وہاں چلا گیا تھا۔"

روبی نے مال گودام والے ڈیرے کا پتا اچھی طرح سے پوچھا اور پھر سلام کر کے واپس مڑ گئی۔

ریلوے مال گودام وہاں سے قریب ہی لاہور جانے والی ریلوے لائن کے پار ایک چھوٹے سے اسٹیشن کے عقب میں تھا۔ نوجوان کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق روبی نے پیدل ہی ایک سنگلاخ سا میدان عبور کیا اور ریلوے لائن کے پار پہنچ گئی۔ چھوٹے سے اسٹیشن کے سگنل کی لال بتی روشن تھی۔ لڑکے نے بتایا تھا کہ ریلوے اسٹیشن کے مال گودام کی بائیں جانب ڈھلانی کچا راستہ ہے۔ یہاں سے اتر کر ریلوے کے تین چار کوارٹروں کی ایک قطار ملے گی جو خالی پڑے ہیں ان میں سے کونے والے کوارٹر میں ہاشم ملے گا۔ ہاشم بدمعاش کا یہ کوئی خفیہ ٹھکانہ نہیں تھا ابھی پاکستان کو قائم ہوئے چند سال ہی گزرے تھے اور حکومت مہاجرین کی آبادکاری اور نئی مملکت کے دیگر مسائل میں مصروف تھی ان جرائم پیشہ لوگوں کی طرف پوری توجہ نہیں دی تھی۔ ہاشم نے ان کوارٹروں میں چرس اور شراب کا اسٹاک رکھا ہوا تھا۔ روبی کو یقین تھا کہ ہاشم نے اس کی بچی کو بھی اسی جگہ کسی کوارٹر میں رکھا ہو گا۔ کوارٹروں کے باہر ایک جیپ کھڑی تھی اور یہاں اندھیرا تھا کونے والے کوارٹر کی دیوار پر جو کمزور سا بلب جل رہا تھا اس کی روشنی بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچ رہی تھی۔ روبی بڑی احتیاط سے چلتی کوارٹروں سے چند قدموں کے فاصلے پر آ کر ایک طرف مٹی کے تودے کی آڑ لے کر بیٹھ گئی وہ بڑے غور سے ماحول کا جائزہ لے رہی تھی۔ یہ ریلوے کے پرانے کوارٹر تھے جن کا صرف ایک چھوٹا سا آنگن اور ایک ہی کمرہ ہوتا تھا۔ ساتھ ساتھ بنے ہوئے تین کوارٹر تھے سامنے کی جانب کوئی روشندان نہیں تھا جس سے یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ کس کوارٹر کے اندر روشنی ہو رہی ہے اور ہاشم موجود ہے۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

روبی پیچھے سے چکر کاٹ کر کوارٹروں کے پیچھے آگئی۔ جیپ کی موجودگی سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ کسی نہ کسی کوارٹر میں آدمی موجود ہیں۔ پیچھے کوارٹروں کی دیوار ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھی۔ درمیان والے کوارٹر کے روشندان میں روشنی ہو رہی تھی۔ یہاں پر کوارٹر کی ایک ایک کھڑکی بھی تھی سبھی کھڑکیاں بند تھیں۔ روبی اس کوارٹر کی بند کھڑکی کے پاس آگئی جس کے روشندان میں سے ہلکی ہلکی روشنی باہر آرہی تھی اس نے بند کھڑکی کی سلاخوں کے ساتھ کان لگا دیا۔ اندر کچھ آدمی باتیں کر رہے تھے روبی نے بڑی کوشش کی مگر ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ پھر اچانک ایک آدمی نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔

"ہاشم سیٹھ فکر ہی نہ کرو لڑکی میرے شہر والے مکان میں بالکل محفوظ ہے میں صبح ہوتے ہی اسے لے جا کر شمی نائیکہ کے حوالے کر دوں گا۔" اب ہاشم کی بھاری آواز سنائی دی اس نے پوچھا "وہ لڑکی کو سنبھال لے گی؟"

پہلے والے آدمی نے کہا "ہاشم سیٹھ وہ نائیکہ ہے لڑکیوں کو غائب کر کے انہیں طوائف کی ٹریننگ دینا ہی اس کا کام ہے وہ تو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دے گی۔ بس تم سمجھ لو کہ دس پندرہ سال بعد تمہارے بھائی کے قاتل کی بیٹی کوٹھے پر مجرا کر رہی ہو گی۔"

روبی کے کان سرخ ہو گئے۔ یہ لوگ اس کی بیٹی کو طوائف بنانے والے تھے۔ ہاشم بدمعاش روبی سے اس سے زیادہ بھیانک انتقام نہیں لے سکتا تھا۔ ہاشم کی بلند آواز گونجی۔

"بس میں یہ چاہتا ہوں۔ جس نے میرے بھائی کا خون کیا ہے میں اس کی نسل کو داغ دار کر دوں گا۔"

"اچھا ہاشم سیٹھ اب میں چلتا ہوں۔"

پہلے والے آدمی کی آواز بلند ہوئی۔

روبی کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کی بیٹی اس آدمی کے پاس ہے اور یہ صبح اسے کراچی کی کسی بدکار عورت کے حوالے کرنے والا ہے۔ روبی تیزی سے دوڑ کر کوارٹروں کے سامنے کی طرف آگئی جیپ اوپر سے بند تھی پیچھے بھی ترپال گری ہوئی تھی۔ وہ ترپال اٹھا کر جیپ کے اندر چلی گئی۔ جیپ میں کچھ چھوٹے کریٹ پڑے تھے اس نے دیوار کی جانب سے ترپال کو ذرا سا کھسکا کر دیکھا۔ ایک آدمی کوارٹر کے صحن والے دروازے سے نکل کر سگریٹ کا

دھواں اڑاتا جیپ کی طرف آرہا تھا۔ روبی نے ایک بہت بڑا خطرہ مول لے لیا تھا۔ ایسا ہو سکتا تھا کہ ایک کی بجائے اندر سے تین چار غنڈے باہر نکلتے ان میں سے دو غنڈے جیپ کے اندر ضرور سوار ہو جاتے۔ مگر روبی کی خوش قسمتی تھی کہ وہ آدمی اکیلا ہی باہر نکلا۔

اسٹیئرنگ پر بیٹھتے ہی اس نے انجن اسٹارٹ کیا۔ ہیڈ لائیٹیں آن کیں اور جیپ غیر ہموار زمین پر ہچکولے کھاتی شہر کراچی کی طرف جانے والی سڑک کی طرف چل پڑی۔ روبی جیپ کے اندر دبک کر بیٹھی تھی۔ وہ سب سے پہلے اپنی بچی کو حاصل کرنا چاہتی تھی ہاشم بدمعاش کو ختم کرنا اس کے فرائض کا دوسرا مرحلہ تھا۔ جیپ پکی سڑک پر آتے ہی تیزی سے بھاگنے لگی۔ اس وقت آدھی رات ہونے والی تھی۔ سڑک سنسان تھی ویسے بھی کراچی شہر کی ٹریفک ابھی اتنی زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ روبی جیپ کے اندر کریٹوں کے پاس سیٹ پر اس طرح بیٹھی تھی کہ پستول اس کے ہاتھ میں تھا ڈرائیونگ سیٹ کے پیچھے جو کھڑکی تھی اس پر بھی ترپال گری ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ غنڈہ جو جیپ چلا رہا تھا روبی کو دیکھ نہیں سکا تھا روبی ترپال ذرا سی اٹھا کر کسی وقت باہر سڑک پر نگاہ ڈال لیتی تھی۔

جیپ خالی سڑک پر اڑی چلی جا رہی تھی۔ شہر کی روشنیاں قریب آتی جا رہی تھیں جیپ سڑک پر دو تین جگہوں سے مڑی اب وہ ایک ویران سی سڑک پر جا رہی تھی روبی نے ترپال ہٹا کر باہر دیکھا دور سامنے دو چار روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ جیپ ان کی طرف ہی جا رہی تھی۔ جیپ نے اندھیرے میں ایک نصف دائرے کا چکر کاٹا اور ایک پرانے ایک منزلہ مکان کی دیوار کے پاس جا کر رک گئی روبی نے پستول پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اسے غنڈے کے اترنے اور پھر مکان کے صحن کا دروازہ کھول کر اندر جانے کی آواز سنائی دی۔ روبی پیچھے کی طرف سے جیپ سے اتر آئی۔ مکان کے صحن میں اندھیرا تھا۔ وہ غنڈہ ایک کوٹھری میں داخل ہو گیا۔ روبی صحن میں دبے پاؤں چلتی کوٹھری کے دروازے کے ایک جانب لگ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے کان اندر کی آوازوں پر لگے تھے۔ وہ غنڈہ کوٹھری میں کسی عورت سے باتیں کر رہا تھا پھر اسے کسی بچی کے رونے کی آواز سنائی دی۔ روبی کا دل زور سے دھڑک اٹھا اس کی مامتا بے قرار ہو گئی یہ اس کی بچی عائشہ کی آواز تھی وہ اپنی بچی کے رونے کی آواز کو پہچانتی تھی اس نے پستول والا ہاتھ اپنے دل پر رکھ لیا اور اپنے دل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے کہا۔

"نہیں نہیں۔ بے تاب نہیں ہونا۔ محبت میں کمزوری نہیں دکھانی۔ اب ممتا کو شیرنی کی طرح دھاڑنا ہو گا۔ ماں کی ممتا بڑے دکھ سہہ چکی ہے۔ اب سینے کے اندر دل کو فولاد کا ٹکڑا بنانا ہے۔ اب ان ہاتھوں کو کاٹ کر پھینک دینا ہے جو ممتا کے گلشن میں آگ لگاتے چلے آئے ہیں۔"

کوٹھری کے اندر وہی غنڈہ اپنی بلند آواز میں کسی عورت سے کہہ رہا تھا۔

"یہ روتی کیوں ہے۔ نامراد؟ اسے دودھ نہیں پلایا؟" عورت کی آواز آئی۔ "پلایا تھا۔ مگر ماں کے بغیر تو بچہ روتا ہی ہے۔ تم اسے نہیں سمجھ سکتے۔" غنڈے نے اسے جھڑک کر کہا

"بس بس بک بک بند کرو۔ تھوڑی دیر آنکھ لگا لوں۔ صبح ہونے سے پہلے مجھے اسے یہاں سے لے جانا ہے۔" عورت نے کہا۔

"کیوں کسی کی بچی پر ظلم کر رہے ہو۔" اس کے ساتھ ہی طمانچے کی تیز آواز آئی۔ غنڈے نے عورت کو گالی دے کر کہا۔

"تم چاچی لگتی ہو میری جو مجھے نصیحتیں کرنے لگی ہو؟ حرامزادی کہیں کی۔ سلاؤ اس نامراد کو نہیں تو میں تم دونوں کا خون کر دوں گا۔"

اس کے بعد کوٹھری میں خاموشی چھا گئی۔

روبی نے سوچا کہ عورت نے عائشہ کے منہ میں ضرور چوسنی دے دی ہو گی وہ دل میں خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنے لگی کہ وہ عین وقت پر پہنچ گئی اگر وہ گھر سے نہ نکلتی تو اس کی بیٹی اس کے ہاتھ سے نکل گئی ہوتی۔ روبی نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کوٹھری میں اس غنڈے کے سوا دوسرا کوئی غنڈہ نہیں ہے۔ اب ایکشن کا وقت آگیا تھا۔ روبی نے پستول کو ہونٹوں سے لگا کر چوما اور دروازے پر دستک دی اندر ایک دم خاموشی چھا گئی۔ پھر اسی غنڈے نے کرخت لہجے میں پوچھا۔

"کون ہے؟"

روبی نے جواب دینے کی بجائے ایک بار پھر دروازے پر دستک دی۔ کسی نے اندر

سے کنڈی اتار کر غصے کے ساتھ دروازہ کھولا۔ سامنے وہی غنڈہ کھڑا تھا۔ جس کی جیپ میں بیٹھ کر روبی یہاں تک آئی تھی۔

روبی نے بازو بالکل سیدھا کر کے اوپر تلے تین فائر کیے تینوں گولیاں غنڈے کے سینے میں پیوست ہو گئیں اور وہ منہ کے بل گرا روبی جلدی سے ایک طرف ہو گئی۔ پھر لپک کر کمرے میں آگئی۔ اندر ایک درمیانی عمر کی خوش شکل عورت دہشت زدہ ہو کر چارپائی پر بیٹھی روبی کو تک رہی تھی۔ اس چارپائی پر روبی کی بیٹی عائشہ چوسنی منہ میں لئے پڑی تھی گولیوں کے دھماکوں سے وہ ڈر کر رونے لگی تھی۔ روبی نے اپنی بچی کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور بولی۔

"تمہیں گولیوں کی آواز سے ڈرنا نہیں ہے میری شیرنی۔"

پھر سہمی ہوئی عورت سے مخاطب ہو کر کہنے لگی۔

"میں اس بچی کی ماں ہوں۔ مردانہ حلیہ میں نے یہاں تک پہنچنے کے لئے بنایا تھا۔ تم مت گھبراؤ میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گی۔" وہ عورت ہاتھ جوڑ کر بولی۔

تم نے ایک موذی سانپ کو مارا ہے خدا تمہارا بھلا کرے تم نے میری باقی ماندہ زندگی کو تباہ ہونے سے بچا لیا ہے۔"

اور وہ عورت چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر رونے لگی۔ روبی نے اسے حوصلہ دیا اور کہا۔

"تم جہاں جانا چاہو۔ میں باہر کھڑی جیپ میں تمہیں پہنچا دوں گی۔ مجھے گاڑی چلانی آتی ہے۔"

وہ عورت جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

خدا کے لئے مجھے تم صرف ریلوے اسٹیشن تک پہنچا دو۔ وہاں سے میں اپنے شہر چلی جاؤں گی۔ بچی ماں کے سینے کے ساتھ لگتے ہی چپ ہو گئی تھی۔ اس نے ماں کی گرمی کو محسوس کر لیا تھا۔ روبی نے اسے اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ دروازے کے باہر غنڈے کی لاش اوندھی پڑی تھی۔ دونوں جیپ میں بیٹھ گئیں۔ روبی نے عائشہ کو اس عورت کی گود میں دے دیا اور جیپ اسٹارٹ کرنے سے پہلے پوچھا۔

"کیا ہاشم غنڈہ بھی یہاں آتا ہے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عورت نے نفی میں سرہلا دیا۔

"وہ یہاں صرف ایک بار آیا تھا۔ اس کے بعد نہیں آیا۔ جس آدمی کو تم نے قتل کیا یہ نہ جانے کتنی عورتوں کی زندگی برباد کر چکا ہے اور کر رہا تھا۔ مجھے یہ رحیم یار خان سے اغوا کر کے لایا تھا۔"

روبی نے جیپ اسٹارٹ کی اور کراچی ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی۔

جب روبی اپنی بیٹی کے اغوا کا سن کر ہاشم بدمعاش کی تلاش میں گھر سے نکل کر سڑک کے اندھیروں میں نظروں سے اوجھل ہو گئی تو شیر خان نے اسے بہت تلاش کیا پھر سینما ہاؤس آ کر خاص گیٹ کیپر سے ہاشم بدمعاش کے ڈیرے کا پتہ پوچھا اور ایک رکشا کر کے اس کے ڈیرے پہنچ گیا۔ اس وقت روبی وہاں سے جا چکی تھی۔ اور ڈیرے کے احاطے میں تخت پر جو غنڈے بیٹھے تھے مے نوشی کر رہے تھے۔ ان میں سے بھی دو تین جا چکے تھے اور صرف ایک آدمی بیٹھا جھوم رہا تھا شیر خان نے رکشا ذرا دور کھڑا کیا تھا۔ اتفاق سے شیر خان کو بھی وہی نوجوان لڑکا مل گیا جس نے روبی کو ہاشم کے بارے میں بتایا تھا۔ جب شیر خان نے بھی ہاشم کے بارے میں سوال کیا کہ وہ کہاں ملے گا تو لڑکا محتاط ہو گیا۔ اس نے کہہ دیا کہ ہاشم سیٹھ تو حیدر آباد گیا ہوا ہے۔ پرسوں آئے گا۔ شیر خان نے اسے سچ سمجھا۔ لڑکے نے بھی بڑے یقین کے ساتھ کہا تھا۔ پھر اس نے پوچھا۔

"یہاں کوئی ملیشیا کے سوٹ والا نوجوان تو نہیں آیا تھا۔ اس نے سلیٹی رنگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ لڑکا آخر بدمعاش کے ڈیرے کا تھا۔ سمجھ گیا کہ کوئی چکر ہے۔ کہنے لگا۔

"نہیں بھائی یہاں کوئی ملیشیا کا سوٹ والا لڑکا نہیں آیا تم اتنی رات گئے کہاں سے آ گئے ہو۔ جاؤ ہمیں آرام کرنے دو۔"

یہ کہہ کر وہ لڑکا کمرے کی طرف چل دیا اور تخت پر ادھر ادھر پڑے گلاس اور خالی بوتلیں اٹھانے لگا۔ شاید وہ اسی کام پر مامور تھا۔

شیر خان سوچ میں پڑ گیا کہ اگر روبی یہاں نہیں آئی تو کہاں گئی ہو گی۔ اس خیال سے وہ واپس گھر کی طرف روانہ ہوا کہ شاید روبی واپس آ گئی ہو اسے اپنی بچی کی بھی پریشانی تھی۔ مگر ہاشم حیدر آباد چلا گیا تھا یقیناً بچی کو کسی خفیہ جگہ چھپا گیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے ساتھ ہی

لے گیا ہو وہ پہلے گھر جا کر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ روبی واپس آئی ہے یا نہیں۔ اس کے بعد وہ پولیس اسٹیشن جا کر بچی کے اغوا کی رپورٹ درج کرانا چاہتا تھا۔ اور پھر اپنے طور پر ہاشم کی تلاش میں نکلنا چاہتا تھا۔ جب وہ گھر پہنچا تو اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ وہ سخت پریشان تھا۔ وہ دروازہ کھول رہا تھا کہ مریم نے اپنے مکان کے دروازے میں سے اسے آہستہ سے آواز دے کر بلایا۔ شیر خان بھاگ کر اس کے پاس گیا۔ مریم اسے اندر لے گئی۔ اور کہا۔

"تمہاری بچی مل گئی ہے۔"

کوٹھری کی چارپائی پر شیر خان کی بچی چوسنی منہ میں لئے گہری نیند سو رہی تھی۔ شیر خان نے لپک کر بچی کو اپنے ساتھ لپٹا لیا اور خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔

"یہ کیسے آ گئی مریم بہن؟ اسے کون لایا؟"

شیر خان کے سوال پر مریم نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کمزور آواز میں کہا۔

"روبی بہن دے گئی تھی۔ وہ تھوڑی دیر پہلے آئی تھی۔" شیر خان حیرانی سے مریم کی طرف دیکھنے لگا۔

"وہ خود کہاں گئی؟" مریم نے کہا۔

کچھ بتا کر نہیں گئی۔ کہہ گئی تھی شیرے سے کہنا گھر سے کہیں نہ جائے میں جلدی واپس آ جاؤں گی۔" شیر خان نے بچی کو بستر پر لٹا دیا اور مریم سے کہا۔

"بہن اب تو بھی آرام کر ہمارے لئے تم نے بڑی تکلیفیں اٹھائی ہیں خدا تمہیں جزا دے گا۔ صبح دیکھا جائے گا۔"

شیر خان بوجھل قدموں سے اپنے مکان میں واپس آ گیا۔ دروازہ بند کیا اور بستر پر اپنے آپ کو گرا دیا وہ بچی کے مل جانے پر خوش بھی تھا مگر روبی کے بارے میں اسے سخت پریشانی بھی تھی کہ وہ نہ جانے کہاں ہو گی کس حال میں ہو گی۔ مجھے اس کے ساتھ ہونا چاہئے تھا مگر سوائے صبر کر کے بیٹھ رہنے کے وہ کچھ نہ کر سکتا تھا۔

اس وقت رات کے پورے دو بج کر بیس منٹ ہو رہے تھے' روبی کی جیپ بڑی تیز رفتاری سے سنسان سڑک پر دوڑتی ہوئی شہر سے باہر مضافاتی اسٹیشن کے کوارٹروں کی طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جا رہی تھی۔ روبی اپنے اس فرض کو پورا کرنے جا رہی تھی جواب اس کی زندگی کا واحد مقصد بن چکا تھا یہ مقصد پاکستان کی نوزائیدہ اسلامی مملکت کی پاک فضا کو ان جرائم پیشہ تخریب پسند عناصر سے پاک کرنا تھا جو اسے اپنی انسان دشمن اور ملک دشمن گھناؤنی سرگرمیوں سے آلودہ کر رہے تھے۔ اس کا نشانہ ہاشم تھا ہاشم بدمعاش..... جو شہر کے جرائم پیشہ غنڈوں کا سربراہ تھا جو قانون کے ناموس کی دھجیاں اڑا رہا تھا جو انسانی تعظیم اور خاندانوں کی عزتوں کا ڈاکو تھا جس کی انسان دشمن سرگرمیوں کی وجہ سے اب تک نہ جانے کتنے گھروں کا سکون برباد ہو چکا تھا۔ روبی اس واسطے اسے ختم کرنے نہیں جا رہی تھی کہ ہاشم سے اسے شیر خان کی جان کا یا اپنی جان کو خطرہ تھا جان ہی ایک ایسی چیز تھی جس کی شیر خان اور روبی نے کبھی پروا نہیں کی تھی اور جب ملکی سالمیت پاکستان کے وقار اور قانون کے تحفظ کا مسئلہ درپیش ہو تو روبی اور شیر خان اپنی جان موت کے پاس گروی رکھ کر گھر سے نکلتے تھے۔

ہاشم بدمعاش ریلوے کوارٹروں سے کہیں نکل نہ گیا ہو۔ روبی جیپ میں بیٹھی یہی سوچ رہی تھی۔ جیپ اس نے ریلوے کراسنگ پار کر کے کچھ فاصلے پر ہی کھڑی کر دی۔ تھوڑے فاصلے پر ریلوے کوارٹر تھے جہاں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تیسرے کوارٹر کی دیوار کے کونے پر بجلی کا کمزور بلب روشن تھا۔ روبی نے پستول کھول کر میگزین پر ایک نگاہ ڈالی۔ میگزین میں ابھی کچھ گولیاں باقی تھیں۔ روبی نے برما اور ہانگ کانگ میں بڑے بڑے قاتل قسم کے اسمگلروں سے مقابلہ کیا تھا جو بات بعد میں کرتے اور پہلے گولی مارتے تھے۔ اس وقت تو روبی کے سامنے کوئی اعلیٰ مقصد نہیں تھا لیکن اب وہ ایک تعمیری مقصد لے کر یہ سب کچھ کر رہی تھی۔ جب انسان کسی اعلیٰ اخلاقی سماجی یا دینی مقصد کے لئے سر پر کفن باندھ کر میدان کار زار میں نکلتا ہے تو اسے دشمن کی تعداد یا اس کا گولہ بارود اپنے سامنے ہیچ نظر آتا ہے۔

اصل شے مقصد کی عظمت ہے۔ اگر مقصد بلند اور عظیم ہے اور ذاتی مفاد سے بالاتر ہے تو پھر انسان کے سامنے پہاڑ بھی مٹی کی ڈھیری بن جاتے ہیں اور اگر مقصد دنیا اور دولت کا حصول ہے تو پھر دشمن کی مٹی کی ڈھیری بھی پہاڑ بن جاتی ہے۔ روبی جانتی تھی کہ وہ کوئی قوم کی اصلاح کرنے والی لیڈر یا کوئی مثالی کردار کی عورت نہیں ہے۔ اس کی حیثیت ایک ایسی گناہگار عورت کی ہے جس نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی تھی جو پاکستان کو اپنا گھر سمجھتی تھی اور جس نے اس گھر کی فضا کو اپنی جان کی قربانی دے کر بھی آلودگیوں سے پاک کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔ پاکستان میں ایسی کئی لیڈر قسم کی عورتیں بھی تھیں جو نیک نیتی اور بڑی جانفشانی سے پاکستانی معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنے کی جدوجہد میں مصروف تھیں۔ روبی نے بھی اسی نیک کام کا بیڑا اٹھایا تھا۔ مگر روبی کو ایک یہ فائدہ حاصل تھا کہ وہ جرائم پیشہ لوگوں کی نفسیات ان کے ہتھکنڈوں اور جوڑ توڑ سے واقف تھی اور اسٹیج پر تقریریں کرنے کی بجائے وہ بدمعاشوں کے ڈیروں پر جا کر بڑے سے بڑے سماج دشمن بدمعاش کو للکار سکتی تھی۔ خود بھی قتل ہو سکتی تھی اور دشمن کا سینہ بھی گولیوں سے چھلنی کر سکتی تھی۔

روبی اندھیرے میں بڑی احتیاط سے چلتی اس کوارٹر کے پیچھے آ گئی جہاں اس نے ہاشم کو باتیں کرتے سنا تھا۔ کوارٹر کی کھڑکی بند تھی۔ روشندان میں بھی اندھیرا تھا۔ یا تو اندر ہاشم سو گیا تھا یا وہاں کوئی نہیں تھا۔ روبی نے سوچا کہ کوارٹر کے دروازے کی طرف چل کر دیکھنا چاہئے۔ کہ وہاں تالا تو نہیں لگا ہوا۔ وہ واپس مڑنے ہی لگی تھی کہ کسی نے پیچھے سے پستول کی نالی اس کے سر کے ساتھ لگا دی اور گرج دار آواز میں پوچھا۔ "کون ہو تم؟"

اس وقت روبی کے ہاتھ میں بھی پستول تھا۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے وہ آدمی یہ پستول نہ دیکھ سکا تھا۔ روبی نے پستول صدری کی جیب میں ڈالنے کے لئے ہاتھ اٹھایا تو آدمی نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "خبردار جو حرکت کی۔ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ اور ہاتھ اوپر اٹھا لو۔"

روبی نے کہا۔ "میں مردان سے ہاشم سیٹھ کے لئے بخت خان کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ میں اس کی تلاش میں تھا۔" آدمی بولا

"بکواس بند کرو۔ مردان میں کوئی بخت خان نام کا ہمارا آدمی نہیں ہے۔ ہاتھ اوپر اٹھاؤ نہیں تو میں گولی چلا دوں گا۔" اس کے پستول کی نالی روبی کی کھوپڑی کے پیچھے بالکل ساتھ لگی تھی۔ اس نے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ اس آدمی نے جلدی سے روبی کے ہاتھ سے پستول چھین لیا اور حکم دیا کہ اٹھ کر آگے آگے چلو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ روبی کو پستول کی نوک پر چلاتا کوارٹر کے دروازے کی طرف لے آیا۔ یہاں دیوار پر لگے بلب کی روشنی میں اس نے غور سے روبی کو دیکھا اور پھر اس کے سینے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"حرامی عورت ہو اور مردانہ کپڑے پہن کر جاسوسی کرنے آئی ہو؟"

روبی نے اس کا ہاتھ پیچھے جھٹک دیا۔ اب وہ آدمی ہوسناک نظروں سے روبی کا جائزہ لے رہا تھا۔

"اگر تم مجھے صاف صاف بتا دو کہ تم کون ہو اور یہاں تمہیں کس نے بھیجا ہے تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔"

روبی بڑی گہری نظروں سے اس آدمی کو دیکھ رہی تھی جس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ جسم مضبوط تھا اور عمر تیس پینتیس کے قریب تھی۔ روبی مسکرائی اور غنڈے کی طرف ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے پنجابی زبان میں کہنے لگی۔

"میں تو صرف تمہارے درشن کرنے آئی تھی میری جان!" مونچھوں والا غنڈہ مکار ہنسی ہنسا اور روبی کو گندی گالی دے کر بولا۔

"تمہیں تو میں ایسے درشن کراؤں گا کہ ساری عمر یاد رکھو گی۔"

اس غنڈے پر جب یہ بھید کھلا کہ اس کے سامنے ایک دبلی پتلی عورت ہے تو وہ اس کی طرف سے قدرے بے احتیاط ہو گیا اور اس نے پستول بھی اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ اسے کیا خبر تھی کہ وہ جس دبلی پتلی عورت کے سامنے کھڑا ہے وہ ہانگ کانگ کے سب سے بڑے جوڈو کراٹے کے ماہر چینی استاد سے تربیت لے چکی ہے اور اب تک کتنے ہی جرائم پیشہ پاکستان دشمن تخریب کاروں کو ٹھکانے لگا چکی ہے۔ روبی نے بھی جب دیکھا کہ غنڈے نے اسے محض کمزور عورت جان کر پستول جیب میں رکھ لیا ہے تو وہ دل میں ہنس دی کہ یہ کس قدر نادان ہے۔ اسے خبر ہی نہیں کہ عورت اب کمزور نہیں رہی۔ اس نے اپنے اندر کی بلاخیز قوت کو پھر سے بیدار کر لیا ہے جو دنیا کی بڑی سے بڑی چٹان کو اپنے عزم اور ارادے کی طاقت سے ریزہ ریزہ کر سکتی ہے۔ غنڈے پر اب ہوس کا بھوت سوار ہو چکا تھا۔ روبی کو ایسے درندہ صفت انسانوں سے بھی نفرت تھی جو عورت کو محض ہوس کاری کا

ذریعہ جانتے تھے۔ عورت ..... جس کے قدموں میں خدا نے جنت رکھ دی تھی۔ جس کی گود میں شرم و حیا اور بلند ترین انسانی اخلاق کی قدریں پرورش پاتی تھیں۔ روبی کا حلق یوں کڑوا ہو گیا جیسے کسی نے اس کو زبردستی زہر پلا دیا ہو۔

غنڈے نے روبی کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا مگر اصل میں اس نے اپنی موت کو اپنی طرف کھینچا تھا۔ روبی کا سیدھا ہاتھ آزاد تھا۔ غنڈے کی طرف کھینچتے ہی روبی نے کہنی سے کلائی تک کا اپنا بازو غنڈے کی ٹھوڑی کے نیچے حلق کے باہر کو نکلی ہوئی ہڈی پر اتنی تیزی سے مارا کہ غنڈے کا سانس رک گیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن پکڑ کر لڑکھڑایا۔ اتنی دیر میں روبی نے اپنا پستول نکال لیا تھا۔ اس نے غنڈے کو سنبھلنے کی مہلت نہ دی اور ایک زبردست فلائینگ کک اس کے حلق پر ماری۔ غنڈہ دھڑام سے پیچھے گر پڑا۔ روبی نے پستول اس کی کنپٹی پر رکھ دیا اور پوچھا

"ہاشم سیٹھ کہاں ہے؟ میں تمہیں صرف تین سیکنڈ کی مہلت دیتی ہوں۔ ایک دو....."

اس سے پہلے کہ روبی تین کہے غنڈے نے خر خر کرتی آواز میں کہا۔

"بتاتا ہوں.....بتاتا ہوں۔"

پھر اس نے روبی کو بتایا کہ ہاشم سیٹھ ریلوے لائن کے پار وہاں سے ڈیڑھ فرلانگ دور ٹیلوں کو جاتی کچی سڑک پر ٹرکوں سے مال اتروانے گیا ہے۔ روبی نے غنڈے کو حکم دیا کہ اٹھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ جاؤ۔ جب غنڈہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا تو روبی نے پستول کی نال اس کی کھوپڑی کے بالکل قریب لا کر فائر کر دیا۔ ایک دھماکہ ہوا اور گولی غنڈے کو منہ کے بل گراتی ہوئی اس کی کھوپڑی سے پار نکل گئی۔ روبی نے اس کی جیب سے پستول نکال کر دیکھا۔ وہ ریوالور گولیوں سے پورا بھرا ہوا تھا۔ روبی نے اسے اپنے قبضے میں کیا اور جیپ کی طرف چل دی جسے وہ ریلوے لائن کے پاس نیچے ڈھلان میں کھڑی کر آئی تھی۔ اس غنڈے سے روبی نے ہاشم کے بارے میں پوری معلومات حاصل کر لی تھیں کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ وہ جیپ اسٹارٹ کر کے رات کے اندھیرے میں ایک طرف روانہ ہو گئی۔

آسمان پر پچھلے پہر کی ہلکی نیلی روشنی نمودار ہونا شروع ہو گئی تھی۔ روبی دن کی روشنی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نکلنے سے پہلے ہاشم غنڈے جیسے ناسور کو بھی کاٹ کر پھینک دینا چاہتی تھی کیونکہ یہی وہ گنجان درخت تھا جس کے سائے میں قسم قسم کے جرائم اور قانون شکن سرگرمیاں پرورش پا رہی تھیں۔ کوئی ڈیڑھ فرلانگ کے بعد بائیں جانب چھوٹی چھوٹی سیاہ رنگ کی خشک پہاڑیوں کے خاکے نظر آئے۔ روبی نے جیپ کی رفتار بہت ہلکی کر دی تاکہ اس کے انجن کی آواز کم سنائی دے۔ اچانک اسے کسی ٹرک کے انجن کی گر گر سنائی دی۔ ٹرک اسٹارٹ کیا جا رہا تھا۔ روبی نے جلدی سے بریک لگائی۔ پھر تھوڑا سا گھما کر جیپ ایک ٹیلے کی اوٹ میں کھڑی کر کے چھلانگ لگا کر اتری' دوڑ کر ٹیلے کے کونے تک گئی اور دوسری طرف دیکھا۔ صبح کاذب کی ہلکی نیلی روشنی میں اسے تھوڑے فاصلے پر ایک ٹرک اور ایک جیپ کھڑی دکھائی دی۔ دو تین انسانی سائے بھی حرکت کر رہے تھے۔ ٹرک کا انجن بند ہو گیا۔ کسی نے اونچی آواز میں کہا۔

"سردارے! یہ اب اسٹارٹ نہیں ہو گا۔ اسے یہیں کھڑا رہنے دے اور میرے ساتھ ڈیرے چل کر آرام کر۔ صبح دیکھی جائے گی۔"

یہ ہاشم سیٹھ کی آواز تھی۔ روبی اس آواز کو اچھی طرح سے پہچانتی تھی۔ دوسری آواز بلند ہوئی۔

"ہاشم سیٹھ تو مال ایک بار پھر چیک کر لے۔ میں اسے ابھی ٹھیک کیے دیتا ہوں۔ مجھے آج ہی کراچی سے نکل جانا ہے۔"

روبی کھسکتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ ریوالور اس کے سیدھے ہاتھ میں تھا۔ وہ ایک جگہ خشک اونچی گھاس کی آڑ لے کر بیٹھ گئی اور غور سے جائزہ لینے لگی۔ اس نے دیکھا کہ ایک بہت بڑے ٹرک کا بونٹ اٹھائے ایک آدمی اس پر جھکا مرمت کر رہا تھا۔ دو آدمی جیپ پر رکھے ہوئے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے کریٹ گن رہے تھے۔ ایک دراز قد بھاری بدن والا آدمی ان کے پاس کھڑا انہیں کہہ رہا تھا۔

"دھیان سے چیک کرو مال' کوئی بے اعتباری نہیں ہے۔ پھر بھی مال پورا ہونا چاہئے۔"

ان کریٹوں میں چرس بھری ہوئی تھی۔ کیونکہ ابھی تک ہیروئن کی وبا نہیں پھیلی تھی

اور صرف افیون چرس اور کوکین کی اسمگلنگ ہوتی تھی اور پاکستان کے شہروں اور دیہات میں بھی انسان دشمن عناصر یہی منشیات خفیہ طور پر نوجوانوں کے ہاتھ فروخت کرتے تھے۔ یہ کل چار آدمی تھے۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا سورج سے پہلے کی پھیکی پھیکی سفید روشنی پھیلتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا روبی کو یہ فائدہ ہوا تھا کہ وہ اپنے نشانے کو ٹھیک طور پر دیکھ سکتی تھی۔ اتنے میں ٹرک اسٹارٹ ہو گیا۔ جو آدمی اس کے انجن پر جھکا ہوا تھا اس نے بونٹ گراتے ہوئے کہا۔

"ہاشم سیٹھ انجن تو چل پڑا۔ اب ہم بھی چلتے ہیں۔" پھر اسی آدمی نے کسی کو آواز دی۔ جو دو آدمی جیپ پر لدا ہوا مال چیک کر رہے تھے ان میں سے ایک آدمی ٹرک کی طرف آگیا۔ ہاشم نے ہنس کر کہا۔

"اچھا یارا۔ بابو کو میرا سلام کہنا۔ رقم سنبھال کر رکھ لی ہے ناں؟" ڈرائیور ٹرک میں بیٹھ گیا تھا۔ وہیں سے اونچی آواز میں بولا۔

"فکر نہ کرو ہاشم سیٹھ۔ روز کا کام ہے۔" ٹرک وہاں سے چل دیا۔

اب وہاں ہاشم بدمعاش اور اس کا ساتھی رہ گیا تھا۔ ہاشم کے گلے میں پستول کی پٹی اب روبی کو صاف نظر آ رہی تھی۔ اس نے اپنے آدمی کو گالی دے کر کہا۔

"اب بس کر جانی۔ چل بیٹھ گاڑی میں دن نکل رہا ہے۔"

روبی کو جو کچھ بھی کرنا تھا اسی وقت کرنا تھا ورنہ شکار اس کے ہاتھ سے نکل رہا تھا۔ جانی غنڈہ جیپ پر ترپال ڈال کر اس کے چھلے کیلوں میں پھنسانے لگا۔ روبی زمین پر پیٹ کے بل رینگتی جیپ کی طرف سرکنے لگی۔ وہ ان دونوں بدمعاشوں میں سے کسی ایک کو سنبھلنے کا موقع دیے بغیر ایک دم حملہ کرنے والی تھی۔ دن کی روشنی اتنی ضرور ہو گئی تھی کہ روبی کو زمین پر رینگتے دیکھا جا سکتا تھا۔ زمین کی اونچی نیچی سطح زرد خشک گھاس کی چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں روبی کو چھپنے میں مدد دے رہی تھیں۔ وہ جیپ کے عقب میں آکر رک گئی۔ جانی غنڈہ ترپال کو ٹھیک طرح سے جماتے جونہی جیپ کے پیچھے آیا روبی نے خونخوار شیرنی کی طرح پیچھے سے اچھل کر غنڈے کو اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ ہاشم دوسری طرف کھڑا جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگا رہا تھا۔ اسے کچھ آواز

سنائی دی اس نے جانی کو آواز دی۔

"اوئے ادھر کیا کر رہا ہے تو حرامی؟"

مگر اتنی دیر میں روبی غنڈے کی گردن کا منکا توڑ چکی تھی اور جب ہاشم لپک کر جیپ کے پیچھے آیا تو روبی ریوالور تانے سامنے کھڑی تھی۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا کہ جیسے کوئی انجانا مسافر جنگل میں چل رہا ہو اور ایک درخت کے پیچھے سے نکل کر آگے آئے تو سامنے شیرنی کھڑی اسے خونخوار آنکھوں سے دیکھ رہی ہو۔ ہاشم نے مردانہ میں بھی شیر خان کی بیوی روبی کو پہچان لیا تھا۔ اس کا عیار دماغ تیزی سے کام کرنے لگا تھا۔ موت سامنے تھی۔ پیٹی میں سے پستول نکالنے کی مہلت نہیں مل سکتی تھی۔ یہاں مکاری سے کام نکالنے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہاشم بھی روبی کے دہشتناک ماضی اور اس کی خوفناک بیک گراؤنڈ سے واقف نہیں تھا۔ وہ اسے ایک نازک اندام عورت ہی سمجھ رہا تھا جو مردانہ لباس پہن کر اپنی بچی کی تلاش میں وہاں آگئی تھی۔ لیکن ایک خیال ہاشم کو ضرور پریشان کرنے لگا تھا کہ جیپ کے پاس جانی کی لاش پڑی تھی جب کہ وہاں پستول چلنے کی آواز بھی نہیں آئی تھی۔ ہاشم نے اپنی طرف سے بڑی شفقت کے ساتھ کہا۔

"بی بی! میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ میرے آدمی سے غلطی ہو گئی ہے۔ تمہاری بچی تمہاری امانت ہے ابھی چل کر لے لو۔"

روبی نے اپنے خاص انداز میں بازو بالکل سیدھا کیا ہوا تھا اور ریوالور کا رخ ہاشم کے سینے کی طرف تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں ہاشم بدمعاش کی آنکھوں میں ڈال رکھی تھیں۔ صبح ہو گئی تھی چاروں طرف سنہری سنہری روشنی پھیل رہی تھی۔ ہاشم کا شیطانی چہرہ روبی کو صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے جواب دیا۔

"میری بچی میرے پاس ہے۔"

ہاشم اندر سے حیران رہ گیا کہ یہ عورت بچی کیسے واپس لے گئی۔ اوپر سے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"تو پھر اب جھگڑا کس بات کا ہے؟" روبی ایک پل کے لئے بھی ہاشم کے چہرے سے نظریں نہیں ہٹا رہی تھی۔ اس نے زہر بھری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"جھگڑا ہی ختم کرنے تو آئی ہوں۔" اور اس کے ساتھ ہی اس کے ریوالور نے یکے بعد دیگرے دو شعلے اگلے دو دھماکے ہوئے۔ ایک گولی ہاشم کے سینے میں دل کے پاس لگی اور دوسری گولی اس کے گرتے ہوئے سینے سے ذرا اوپر حلق کے پاس لگی وہ گرا۔ گرتے ہوئے بھی اس نے اپنی پیٹی میں لگا پستول نکالنے کی کوشش کی مگر روبی کی تیسری گولی نے اس کا کام تمام کر دیا۔ تیسری گولی روبی نے اس بدمعاشوں کے سرغنہ کے سر پر بڑے قریب سے فائر کی تھی جس نے اس کا وہ مغز کھوپڑی توڑ کر باہر پھینک دیا تھا جہاں جرائم کے گھناؤنے منصوبے پرورش پایا کرتے تھے اور جن منصوبوں کی وجہ سے نہ جانے کیسے کیسے گھروں کے روشن چراغ بجھ چکے تھے۔

روبی نے جلدی سے جیپ کا بونٹ کھول کر اندر شیشے کی گول نلکی کو توڑ ڈالا جس کا پٹرول انجن پر پھیل گیا۔ روبی نے ہاشم کی لاش کی جیب سے لائٹر نکال کر کپڑے کے ٹکڑے کو آگ لگائی اور انجن میں پھینک دیا۔ پٹرول نے آگ پکڑ لی۔ روبی کو لاشیں چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے کسی جرائم پیشہ بدمعاش اور تخریب کار کی لاش کو نہیں چھپایا تھا۔ ہاں اتنا ضرور کیا کہ ہاشم کی لاش کو بھی کھینچ کر جیپ کے پہیے کے قریب ڈال دیا۔ انجن نے آگ پکڑ لی تھی اور اس کا ایک شعلہ جیپ کی ترپال کو جلانے لگا تھا۔ روبی اپنا کام کر چکی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ٹیلے کی اوٹ میں آگئی۔ یہاں اس کی جیپ کھڑی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ جیپ پر سوار کراچی سٹی کے ریلوے اسٹیشن کی طرف اڑی چلی جا رہی تھی۔ وہ دن ریلوے اسٹیشن کے ماحول میں گزارنا چاہتی تھی اور رات کا اندھیرا چھا جانے پر شیر خان کے پاس جانا چاہتی تھی۔ اپنی پیاری بیٹی کی طرف سے اسے اب کوئی پریشانی نہیں تھی۔ وہ شیر خان کے پاس محفوظ تھی اور اس کو اغوا کرنے والے اب اس دنیا میں باقی نہیں رہے تھے۔ اسٹیشن کو روبی نے اس لئے منتخب کیا تھا کہ وہاں ہر وقت مسافروں کا ہجوم رہتا ہے اور کوئی کسی کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیتا۔ روبی کے پاس ایک پستول تھا جس میں صرف دو گولیاں تھیں۔ جب کہ دوسرے ریوالور میں کافی گولیاں تھیں۔ اس نے پستول کو چلتی جیپ میں سے ایک نالے میں پھینک دیا اور ریوالور اپنے پاس ہی رکھا اسٹیشن تک آتے آتے کافی دن نکل آیا تھا اور کراچی کے بازاروں کی رونق اور چہل پہل شروع ہو گئی تھی۔ روبی نے اسٹیشن سے دور ایک ویران مقام پر جیپ کو ایک ڈھلان میں اتار کر وہیں پڑی رہنے دیا اور خود بڑے اطمینان سے چلتی اسٹیشن کی عمارت میں آگئی۔ اپنے لباس سے روبی ہری پور ہزارے کا کوئی نوجوان لڑکا لگتی تھی جو نوکری کی تلاش میں کراچی آگیا ہو۔ اس نے اسٹیشن پر ہی ناشتہ کیا اور چادر کو جسم کے گرد لپیٹ کر تھرڈ کلاس کے مردانہ ویٹنگ روم میں ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ یہ اونچی چھت والا کھلا ویٹنگ روم تھا اور بھانت بھانت کے لوگ وہاں اپنا اپنا سامان اور بچے لیے پڑے تھے۔ اسٹیشن کے اندر سے چھک چھک کرتے انجنوں کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ ابھی پاکستان میں بہت کم ڈیزل انجن چلتے تھے۔ زیادہ تر انجن کوئلے کے چلتے تھے اور ان کا خوب دھواں اٹھتا تھا۔ روبی کو سارا دن وہاں گزارنا تھا۔

یہ کافی صبر طلب کام تھا۔ وہ دن بھر صرف ایک بنچ پر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ چنانچہ کچھ دیر وہاں بیٹھنے کے بعد وہ اٹھی اور پلیٹ فارم ٹکٹ لے کر اسٹیشن کے اندر چلی آئی۔ یہاں دو چار پلیٹ فارم تھے ان میں جہاں گاڑیاں کھڑی تھیں وہاں مسافروں کا رش تھا۔ باقی خالی پڑے تھے۔ ریلوے پولیس کے سپاہی بھی کہیں کہیں کاہلی سے منڈلاتے یا کسی جگہ بیٹھے چائے سگریٹ سے شغل کرتے روبی کو نظر آئے تھے۔ اس نے ان کی طرف کوئی خاص دھیان نہ دیا تھا۔ کیونکہ وہ جس بھیس میں تھی اسے قریب سے بھی کوئی نہیں پہچان سکتا تھا۔ ایک جگہ چائے کی کینٹین کے پہلو میں بنچ خالی پڑا تھا۔ روبی چائے کی پیالی لے کر وہاں بیٹھ کر چائے پینے لگی۔

وہ سوچنے لگی کہ چونکہ انہوں نے اپنی بچی عائشہ کے اغوا کی رپورٹ تھانے میں نہیں لکھوائی تھی اس لئے ہاشم اور اس کے غنڈوں کے قتل کے بعد پولیس شیر خان کے گھر پوچھ گچھ کے لئے نہیں آئے گی۔ یہ سب کچھ اتفاق سے ہی ہو گیا تھا ورنہ پہلے شیر خان کا خیال تھا کہ عائشہ کے اغوا کی رپٹ درج کرائے مگر روبی نے اسے منع کر دیا تھا اور یہ کہہ کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی تھی کہ وہ اپنی بچی کو غنڈوں سے خود برآمد کرے گی۔ اب صرف ایک ہی مرحلہ اس کے سامنے تھا۔ اس نے اپنے خاوند شیر خان اور بچی عائشہ کو لے کر کراچی سے نکلنا تھا اور کاغان کی پہاڑیوں میں پہنچنا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ پہاڑی وادیاں پاکستان کے دور دراز علاقے میں ہیں اور وہاں شیر خان اور اس کی بچی عائشہ سکون کے ماحول میں زندگی بسر کر سکیں گے۔ اپنے بارے میں روبی جانتی تھی کہ وہ موت کے سفر پر ہے۔ وہ کئی خون کر چکی ہے۔ اگرچہ اس نے ان بدمعاشوں کو قتل کیا تھا جو خود قاتل تھے اور اگر پکڑے جاتے تو قانون انہیں پھانسی ہی کی سزا دیتا مگر روبی نے قانون اپنے ہاتھوں میں لے کر قانون شکنی کی تھی اور وہ بہرحال قاتلہ تھی۔ وہ جیل بھی توڑ کر بھاگی تھی۔ پھانسی کا پھندا اس کا مقدر ہو چکا تھا مگر وہ پھانسی کے تختے پر چڑھنے سے پہلے پاکستان کے جسم میں جرائم کا زہر گھولنے والے جتنے جرائم پیشہ درندوں کو ختم کر سکتی تھی ختم کر دینا چاہتی تھی۔

دوسری طرف جب دن نکلا تو کراچی پولیس کو اکٹھے تین آدمیوں کے قتل کی خبر ملی۔ ان میں بدنام زمانہ ہاشم بدمعاش بھی تھا۔ باقی دونوں غنڈے بھی اس کے ساتھی تھے۔ پولیس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا خیال فوراً شیر خان کی طرف گیا۔ اس کی بیوی روبی نے ہی ہاشم کے چھوٹے بھائی سہراب کو قتل کیا تھا اور یہ بات بھی پولیس کے علم میں تھی کہ ہاشم اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ شیر خان سے لینا چاہتا تھا اور اس سلسلے میں شیر خان کو دھمکیاں بھی مل چکی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ شیر خان کی بیوی مفرور قاتلہ روبی نے اپنے خاوند کو ہاشم کے انتقام سے بچانے کے لئے ہاشم کو قتل کر دیا ہو۔ یہ بات پولیس کے علم میں ہی نہیں تھی کہ شیر خان کی بچی بھی اغوا ہو گئی تھی۔ بہر حال انسپکٹر پرویز نے سارے کیس کا جائزہ لیا اور وہ کیس کی تفصیلات سے پہلے بھی آگاہ تھا اور مفرور قاتلہ روبی کو گرفتار کرنے کے لئے اسی نے شیر خان کے گھر کے آس پاس خفیہ پولیس کا آدمی لگایا تھا مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔

انسپکٹر پرویز نے شیر خان کو تھانے بلوا کر مقتول ہاشم بدمعاش کی طرف سے دی گئی دھمکیوں کے بارے میں پوچھ گچھ کی۔ شیر خان نے کہا کہ کافی دیر ہوئی ہاشم کی طرف سے اسے اس قسم کی دھمکی ملی تھی مگر پھر بات آئی گئی ہو گئی تھی اور اب ہاشم کا کوئی آدمی اس کے پاس کبھی نہیں آیا تھا۔ انسپکٹر پرویز نے شیر خان سے اس کی بچی کے بارے میں پوچھا کہ وہ ماں کے بغیر ضرور اداس ہو گی اور یہ کہ وہ اکیلا اس کی پرورش کس طرح کرتا ہے۔ شیر خان نے بتایا کہ وہ سینما کی ڈیوٹی پر آنے سے پہلے بچی کو اپنی نیک دل ہمسائی مریم کے پاس چھوڑ آتا ہے اور جب رات کو گھر واپس جاتا ہے تو تھوڑی دیر کے لئے بچی کی خیریت معلوم کرتا ہے اور رات کو بچی مریم کے پاس ہی رہتی ہے۔ انسپکٹر پرویز نے ایک دم سوال کر دیا۔

"تمہاری بیوی اپنی بچی سے ملنے کس دن آئی تھی؟" شیر خان بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا تھا اس نے غمگین لہجے میں کہا۔

"وہ کیوں آئے گی اب' اس کی وجہ سے تو میرا گھر برباد ہو گیا۔ بچی ویران ہو گئی۔ مدت گزر گئی کبھی اس کی شکل دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔"

انسپکٹر پرویز اس دوران بڑی گہری نظر سے شیر خان کے چہرے کا مطالعہ کرتا رہا۔ جب شیر خان چلا گیا تو اس نے اپنے ہیڈ کانسٹیبل احمد دین سے کہا۔

"اس کی ہمسائی مریم کو میرے پاس لاؤ مگر شیر خان کو پتہ نہیں چلنا چاہئے۔"

کانسٹیبل احمد دین دوپہر کے بعد مریم کے گھر پہنچ گیا۔ وہ سفید کپڑوں میں تھا۔ شیر خان

اس وقت سینما گیا ہوا تھا اور بچی مریم ہی کے پاس تھی۔ مریم بچی کو چارپائی پر لٹا کر خود کھرے میں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھی۔ بچی عائشہ بستر پر لیٹی ٹانگیں چلا رہی تھیں۔ کانسٹیبل نے مکان کے صحن میں آتے ہی مریم سے کہا۔

"میری بہن گھبراؤ بالکل نہیں میرا نام احمد دین ہیڈ کانسٹیبل ہے۔ تمہیں انسپکٹر صاحب نے تھوڑی دیر کے لئے تھانے بلایا ہے۔ بچی کو بھی ساتھ لے چلو میں تمہیں خود واپس چھوڑ جاؤں گا۔ گھبرانے کی بات نہیں۔ انسپکٹر صاحب نے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" پہلے تو مریم راضی نہیں ہوئی اور تھانے جانے سے صاف انکار کر دیا مگر جب ہیڈ کانسٹیبل نے کہا کہ وہ اسے اٹھا کر بھی لے جا سکتا ہے تو مریم بادل نخواستہ ساتھ چلنے کے لئے تیار ہو گئی۔ بچی عائشہ کو اس نے گودی میں اٹھا لیا۔ تھانے میں انسپکٹر پرویز نے مریم کو بڑی عزت سے بٹھایا اور بہن کہہ کر مخاطب کیا اور کہا۔

"تم سے صرف دو ایک باتیں پوچھنی ہیں مجھے یقین ہے کہ تم غلط بات نہیں کرو گی۔ اس کے بعد میرا آدمی تمہیں گھر چھوڑ آئے گا۔" مریم نے کہا۔

"آپ کو جو پوچھنا ہے پوچھیں اگر کسی بات کا مجھے علم ہوا تو میں ضرور بتا دوں گی۔" وہ بوتل سے عائشہ کو دودھ بھی پلا رہی تھی۔ انسپکٹر نے کہا۔

"شیر خان کی بیوی اپنی بچی سے ملنے کب آئی ہے؟" مریم نے کہا۔ "وہ تو جب سے جیل سے بھاگی ہے کبھی گھر نہیں آئی۔ میں خود ہی بچی کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔" انسپکٹر مریم کے چہرے کو گھور کر تک رہا تھا کہنے لگا۔

"مریم بی بی! اگر تم ہمیں سچ سچ سب کچھ بتا دو گی تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

مریم نے اس کے بعد بھی یہی کہا کہ اسے معلوم نہیں کہ روبی کہاں ہے۔ وہ کبھی نہیں آئی تب انسپکٹر پرویز نے غصے سے میز پر مکا مارا اور بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ اچانک ساتھ والے کمرے سے کسی عورت کی دردناک چیخ بلند ہوئی وہ رو رو کر کہہ رہی تھی۔

"خدا کے لئے مجھ پر یہ ظلم نہ کرو۔ خدا کے غضب سے ڈرو مجھے چھوڑ دو' مجھے چھوڑ دو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

انسپکٹر پرویز نے ایک لیڈی کانسٹیبل کو پہلے ہی ساتھ والے کمرے میں بٹھا دیا تھا اور اسے کہا تھا کہ جب میز پر مکا مارنے کی آواز آئے تو وہ چیخ مار کر مندرجہ بالا ڈائیلاگ بڑے درد بھرے انداز میں بولے۔ یہ ایک ڈرامہ تھا جو مریم پر دہشت طاری کرنے اور اس سے سچ اگلوانے کے لئے پہلے سے تیار کیا گیا تھا۔ مریم سیدھی سادی عورت تھی ساتھ والے کمرے سے کسی عورت کی چیخ و پکار سن کر سہم گئی۔ انسپکٹر پرویز نے کہا۔ "اگر تم نے میرے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب نہ دیا تو تمہارا بھی یہی حشر ہو گا جو ساتھ والے کمرے میں ایک عورت کے ساتھ ہو رہا ہے۔" تب مریم نے خوفزدہ ہو کر سب کچھ بتا دیا۔

انسپکٹر پرویز کے لئے یہ ایک حیران کن انکشاف تھا کہ شیر خان کی بچی اغوا ہو گئی تھی اور پھر آدھی رات کو روبی مردانہ لباس میں مریم کے گھر اتر کر بچی اس کے حوالے کر گئی تھی۔ مریم نے اپنے بیان میں یہ بھی بتایا کہ اسے ایک مونچھوں والا آدمی بے ہوشی کی دوا سنگھا کر بچی کو لے گیا تھا۔ انسپکٹر پرویز نے پوچھا۔

"یہ کل رات کی بات ہے؟"

"جی ہاں۔" مریم نے کہا۔ "کل رات ہی شیر خان کی بیوی واپس آ کر مجھے بچی دے گئی تھی اور کہہ گئی تھی کہ شیر خان سے کہنا میرے پیچھے نہ آئے۔"

انسپکٹر نے اس سے یہی نتیجہ نکالا کہ یہ تینوں قتل مفرور قاتلہ شیر خان کی بیوی روبی نے ہی کیے ہیں اور اس کی بچی کو ہاشم بدمعاش نے ہی اغوا کیا تھا کیونکہ وہ شیر خان سے اپنے بھائی کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ روبی مفرور تھی وہ تو اس کے ہاتھ نہیں آ رہی تھی۔ چنانچہ اس نے اس کی بچی کو ہی اغوا کر لیا۔ انسپکٹر مریم کو اعتماد میں لے چکا تھا وہ خوف کے مارے پولیس سے مکمل تعاون کے لئے بھی تیار ہو چکی تھی۔ انسپکٹر پرویز نے اسے مزید اعتماد میں لیتے ہوئے کہا۔

"بی بی! اب تم گھر جاؤ۔ شیر خان کو بلکہ کسی کو کچھ نہ بتانا۔ یہ راز اپنے تک ہی رکھنا اور اگر شیر خان کی بیوی گھر آئے یا شیر خان اس سے ملنے کسی جگہ جائے تو فوراً تھانے آ کر اطلاع کر دینا۔ اس بات سے بے فکر ہو جاؤ تمہارا کسی جگہ بھی نام نہیں آئے گا۔ ٹھیک ہے؟" مریم نے سوکھے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ "جی ٹھیک ہے۔" انسپکٹر پرویز نے

ہیڈ کانسٹیبل کی بجائے ایک لیڈی کانسٹیبل کو مریم کے ساتھ رکشے میں بٹھا کر بھیج دیا جو سفید کپڑوں میں تھی اس کے جانے کے بعد انسپکٹر نے احمد دین سے کہا۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ مفرور روبی اس وقت کراچی شہر میں ہی کسی جگہ روپوش ہے دوسری بات یہ ہے کہ وہ مردانہ کپڑوں میں یعنی ملیشے کی شلوار قمیص میں ہے۔ فوراً پولیس کے آدمی سفید کپڑوں میں شیر خان کے محلے میں تعینات کر دو۔ جو چوبیس گھنٹے نگرانی کریں گے۔ تم خود کوئی بھیس بدل کر شیر خان کی نگرانی کرو گے۔ مجھے یقین ہے کہ شیر خان کی بیوی ایک بار اپنے گھر ضرور آئے گی اس کے علاوہ ریلوے اسٹیشن پر بھی خفیہ کے کچھ آدمی بھیج دو۔ روبی کی تصویر تھانے میں موجود ہے۔ انہیں اچھی طرح چہرہ کرا دو۔" اسی وقت خفیہ پولیس کے دو آدمی بھی اسٹیشن کی طرف چل دیے۔

مریم نے گھر واپس آ کر بچی کو چارپائی پر لٹا دیا۔ وہ دل میں پریشان تھی کہ خوامخواہ اس نئی مصیبت میں پھنس گئی اس نے تو روبی اور شیر خان کی بھلائی کے لئے بچی کی دیکھ بھال اپنے ذمے لے لی تھی اور مشکل میں پھنس گئی۔ اس نے یہی فیصلہ کیا کہ رات کو شیر خان بچی کو دیکھنے آئے گا تو وہ اسے صاف صاف کہہ دے گی کہ اب میں اس کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی۔ اسے لے جاؤ جہاں جی چاہے اس کو رکھو مگر پولیس کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتائے گی۔ کیونکہ تھانے میں زیر تشدد عورت کی چیخ ابھی تک مریم کے کانوں میں گونج رہی تھی۔

اس وقت روبی کراچی سٹی کے ریلوے اسٹیشن پر نہیں تھی۔ بلکہ وہ ویٹنگ روم سے نکل کر وہاں سے کچھ دور ایک بہت بڑے گندے نالے کے کنارے پر بنی ہوئی جھگیوں کی بستی میں ایک چھوٹے سے تنور پر روٹی کھانے کے بعد صف پر بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ سگریٹ کی عادت تقریباً اس سے چھوٹ چکی تھی۔ مگر وہاں اپنے آپ کو مرد ظاہر کرنے کے لئے بھی سگریٹ پینا ضروری تھا۔ ایک بوڑھا سندھی مزدور اس کے قریب ہی بیٹھا پرچ میں چائے ڈال کر پی رہا تھا اور روبی سے باتیں بھی کرتا جاتا تھا۔ روبی نے اسے اپنا نام جمال بتایا تھا اور کہا تھا کہ میں ہری پور سے کام کی تلاش میں کراچی آیا ہوں۔ بوڑھا کہہ رہا تھا۔

"بیٹا کام تو تمہیں جونا مارکیٹ میں یا کیماڑی کی گودی کے آس پاس ہی ملے گا۔ وہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

محنت مزدوری کے پیسے بھی اچھے مل جاتے ہیں۔"

روبی کی تیز نگاہیں ارد گرد کے ماحول کا بھی جائزہ لے رہی تھیں۔ وہاں اسے کوئی ایسا آدمی نظر نہیں آتا تھا۔ جس پر سی۔ آئی۔ ڈی کا شبہ کیا جا سکے۔ وہ اتنی ماہر ہو گئی تھی کہ خفیہ پولیس والے کو اس کی چال اور حرکات و سکنات سے ہی پہچان لیتی تھی اس نے قمیص کے اندر جو صدری پہن رکھی تھی اس میں کافی رقم نوٹوں کی شکل میں موجود تھی ایک بھرا ہوا ریوالور بھی تھا۔ اسے کسی نہ کسی طرح دن گزارنا تھا۔ یہ علاقہ غیر اہم تھا یہاں وہ دیر تک بیٹھنا چاہتی تھی۔ تاکہ دن کا زیادہ سے زیادہ حصہ گزر جائے۔ لیکن ایک جگہ زیادہ دیر تک بیٹھے رہنا بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ اب تک نصف درجن سے بھی زیادہ خون کر چکی تھی اور ذرا سی غفلت اسے پھانسی کے تختے پر لے جا سکتی تھی۔ بچی عائشہ کی طرف سے اس کا دل مطمئن تھا کہ وہ اپنے باپ کے پاس پہنچ چکی ہے۔ اب وہ یہ چاہتی تھی کہ شیر خان اور اپنی بچی کو اس شہر سے نکال کر کسی دور دراز پہاڑی علاقے میں جا کر آباد ہو جائے اور اس کے بعد اپنی آئندہ زندگی کا کوئی پروگرام بنائے کہ قانون کے ہاتھوں سے محفوظ رہ کر وہ کسی مقام پر اپنے مشن کو آگے چلا سکتی ہے اس کا مشن عورتوں پر ظلم کرنے والے بدمعاشوں کو فوری طور پر موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ وہ مرنے سے ایک منٹ پہلے کسی درندہ صفت غنڈے کو قتل کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ دور دراز کے پہاڑی علاقے میں بھی وہ شیر خان اور اپنی بچی کے ساتھ زیادہ دیر تک نہیں رہ سکے گی لیکن وہ اتنا ضرور چاہتی تھی کہ شیر خان شہروں کی گناہ آلود جرائم پیشہ فضا سے دور رہ کر اس کی بچی کی پرورش کرے اور اس کو ایک ایسی عورت بنائے جو صرف اپنے حق کی حفاظت کرنا ہی نہ جانتی ہو بلکہ دوسری عورتوں کو بھی ان کا حق دلانا جانتی ہو جو بندی عورتوں کی طرح بزدل نیک عورت نہ ہو بلکہ شروع اسلام کی مثالی خواتین کی طرح ایک بہادر نیک عورت ہو جو ظالم کے سامنے بکری نہ بن جائے' بلکہ شیرنی بن کر ظالم کے ہاتھ کو چبا ڈالے اور یوں وطن پاک کی فضا کو خواتین کی ترقی اور خوشحالی کے لئے ساز گار بنائے۔

روبی اس حقیقت سے باخبر تھی کہ وہ زیادہ دیر تک اپنی بچی کے ساتھ نہ رہ سکے گی اور یہ کام اس کے بعد شیر خان کو کرنا ہو گا۔ یہ فرض اسے نبھانا ہو گا۔ اور اسے شیر خان سے

پوری امید تھی کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔ روبی یہی کچھ سوچتی وہاں سے اٹھی اور نالے کے کنارے شہر کی مخالف سمت چلنے لگی۔ یہ علاقے روبی کے لئے اجنبی تھے مگر پیچھے وہ بڑی سڑک تھی جو ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتی تھی وہاں سے وہ اپنے گھر پہنچ سکتی تھی۔ اب اسے صرف رات ہونے کا انتظار تھا۔ وہ ساری رات کی جاگی ہوئی تھی۔ اسے نیند بھی آ رہی تھی۔ وہ بے خبر ہو کر سونا نہیں چاہتی تھی لیکن کچھ دیر آرام بھی کر لینا چاہتی تھی۔ چلتے چلتے وہ ایک ویران مقام پر آ گئی۔ یہاں آس پاس دور دور تک کوئی جھونپڑی وغیرہ نہیں تھی۔ ایک کھلی جگہ پر خانہ بدوشوں نے گیلے چیتھڑے سکھانے کے لئے ڈال رکھے تھے۔ ایک جانب پھلاہی اور کیکر کے چھدرے درختوں کا جھنڈ تھا روبی اس کی چھاؤں میں بیٹھ گئی۔

اسے نہ جانے کیوں ہانگ کانگ اور برما میں گزارے ہوئے ہنگامہ خیز عیش و آرام کے دنوں کا خیال آ گیا۔ وہ ان خیالوں میں جیسے کھو گئی۔ اور اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ اس نے سوچا وہاں کوئی نہیں ہے اسے کچھ دیر کے لئے آرام کر لینا چاہئے چنانچہ اس نے چادر کو گول کر کے سر کے نیچے رکھ لیا اور خدا کو یاد کر کے آنکھیں بند کر لیں رات بھر کی جاگی تھی۔ آنکھیں بند کرنے کی دیر تھی کہ نیند کی پریاں اسے اٹھا کر خواب کی دنیا میں لے گئیں۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ جب تک سوتی رہی وہاں کوئی بندہ نہ آیا جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے کچھ نظر نہ آیا وہ جلدی سے اٹھ بیٹھی اس کے چاروں طرف تاریکی چھائی تھی۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے اس نے بڑے غور سے اپنی کلائی پر لگی ہوئی گھڑی کو دیکھا وہ حیران رہ گئی۔ گھڑی کی سوئیاں رات کے دس بجا رہی تھیں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی دیر تک سوتی رہی ہے لیکن وہ تازہ دم تھی اس نے صدری میں ہاتھ ڈال کر دیکھا اس کا ریوالور اور نوٹ اپنی جگہ پر تھے۔ وہ اٹھی اور اپنے گھر کا رخ کیا۔

شیر خان حسب معمول سینما کا آخری شو شروع کرانے کے بعد منیجر سے اجازت لے کر قریباً سوا نو بجے گھر واپس آ گیا تھا اور اپنی بچی کو دیکھنے سیدھا مریم کے مکان میں گیا۔ مریم کا رویہ کچھ بدلا بدلا تھا۔ شیر خان بچی گود میں لے کر اسے پیار کر رہا تھا۔ اس نے مریم سے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"خیر تو ہے مریم بہن! تم کچھ چپ چپ ہو۔" مریم نے منہ پھلا کر کہا۔

"بھائی شیر خان اب مجھ سے تمہاری بچی کی دیکھ بھال نہیں ہوتی۔ تم کوئی دوسری عورت تلاش کر لو۔ میں تھک گئی ہوں۔"

شیر خان کہنے لگا۔

"مریم بہن! تمہارے جیسی بہن مجھے اور کہاں ملے گی اور اب تو عائشہ بھی تمہارے ساتھ بڑی گھل مل گئی ہے مجھے تو بڑا اطمینان ہوتا تھا کہ بچی تمہارے پاس ہے۔"

"کوئی بات نہیں ہوئی بھائی۔ بس میں تھک گئی ہوں۔ اب تمہاری بچی کی دیکھ بھال نہیں کر سکتی۔ صاف بات ہے۔ تم اپنی بیٹی کو لے جاؤ۔ تمہاری مہربانی ہو گی۔" مریم نے صاف انکار کر دیا تھا۔ شیر خان منت سماجت کرنے والا آدمی ہی نہیں تھا۔ اس نے مریم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا

"بہن تم نے اب تک جس پیار اور ممتا سے میری بچی کی دیکھ بھال کی ہے اس کے واسطے میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ چھوٹا سا شکرانہ قبول کرو یہ تمہاری مہینے کی تنخواہ سے الگ ہے۔" اور شیر خان نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر مریم کے پاس چارپائی پر رکھا اور سلام کر کے عائشہ کو گود میں اٹھائے وہاں سے نکل کر اپنے مکان میں آ گیا۔

خفیہ پولیس کے دو آدمی اس وقت سفید کپڑوں میں گلی کی نکڑ پر آمنے سامنے چھپ کر کھڑے تھے۔ انہوں نے شیر خان کو مریم کے گھر میں جاتے اور پھر وہاں سے بچی کو گود میں اٹھائے نکلتے اور اپنے گھر میں واپس جاتے دیکھ لیا تھا دونوں سپاہی وہاں سے ہٹ گئے۔ دوسری طرف کچھ فاصلے پر ایک پرانی عمارت کے سائے میں ایک اور سپاہی فقیر کے حلیئے میں دیوار سے ٹیک لگائے یوں بیٹھا تھا جیسے سو رہا ہو۔ یہ ہیڈ کانسٹیبل احمد دین تھا۔ انہوں نے احمد دین کو ساری رپورٹ دی اور واپس اپنے اپنے ٹھکانوں پر جا کر چھپ گئے۔ جال بچھ چکا تھا اور اس جال میں پھنسنے کے لئے روبی ایک رکشے میں بیٹھی چلی آ رہی تھی۔ اتنا اسے ضرور احساس تھا کہ اس کے گھر کی نگرانی ہوتی ہے مگر اب پولیس غافل ہو گئی ہے مگر ہاشم کے قتل کے بعد روبی قدرے چوکس ہو گئی تھی۔ چنانچہ احتیاط کے طور پر اس نے رکشہ اپنے محلے سے بہت پیچھے چھوڑ دیا اور چادر کی بکل مار کر پیدل ہی گھر کی طرف چل

پڑی۔

محلے کے قریب آ کر وہ محتاط ہو گئی اور دائیں بائیں اندھیرے میں دیکھتی ہوئی پھونک پھونک کر قدم اٹھانے لگی۔ اس جگہ جو دو چار دکانیں تھیں وہ بند تھیں۔ غریبانہ قسم کے مکانات تھے جن کے مکین بتیاں بجھا کر گہری نیند سو رہے تھے۔ آگے چند قدموں پر وہ جگہ تھی جہاں روبی کا مکان تھا۔ اس گلی کے کونے پر ایک بلب لگا تھا جس کی روشنی بڑی مشکل سے نیچے فرش تک پہنچتی تھی۔ روبی مکانوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہی تھی کہ اچانک اس کے قدم رک گئے اور وہ جلدی سے ایک مکان کی اوٹ میں ہو گئی۔ اس نے گلی کے نکڑ پر کسی آدمی کے سائے کو حرکت کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ اندھیرے میں دیوار سے لگ کر کھڑی ٹکٹکی باندھے گلی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ریوالور اس نے نکال کر مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ سامنے والی پرانی بلڈنگ کی جانب سے ایک اونچا لمبا آدمی جھوم جھوم کر چلتا آ رہا تھا۔ وہ کھمبے کی روشنی میں آیا تو روبی نے غور سے دیکھا۔ وہ کوئی فقیر ملنگ لگ رہا تھا۔ یہ ہیڈ کانسٹیبل احمد دین تھا جو فقیر کے حلیئے میں وہاں پڑا تھا۔ روبی نے سوچا کہ رات کے گیارہ بجے کسی فقیر کا یہاں کیا کام..... یہ خفیہ پولیس کے آدمی کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ کسی ایسے آدمی کو گولی کا نشانہ بنانا جو اپنی ڈیوٹی ادا کر رہا ہو اور اس کا کسی گھناؤنے مجرمانہ فعل سے کوئی تعلق نہ ہو۔ یہ روبی کا مسلک نہیں تھا۔ اتنا اب اسے یقین ہو گیا تھا کہ ہاشم اور اس کے دو غنڈوں کے قتل کے بعد شیر خان کے گھر کی نگرانی پولیس نے سخت کر دی ہے اور وہ ہر حالت میں روبی کو گرفتار کرنے پر تل گئی ہے۔ فقیر ملنگ آدمی گلی میں جا کر تھوڑی دیر بعد باہر آ گیا اور واپس پرانی بلڈنگ کی طرف چل دیا جہاں پہلے سے ایک انسانی سایہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ دونوں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔ روبی وہیں سے دبے پاؤں واپس ہو گئی۔ وہ اپنی بچی اور شیر خان کے پاس بھی ضرور جانا چاہتی تھی۔ وہ ان دونوں کو اب اس قسم کے اذیت بخش ماحول میں تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ وہ پچھلی طرف ٹیوب ویل کے قریب سے نکل کر اپنی گلی کے عقب میں آ گئی۔ یہاں سے اس کی گلی کو جانے والا کوئی باقاعدہ راستہ تو نہیں تھا مگر ایک احاطہ تھا جہاں کچھ مزدوروں نے جھونپڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ اس احاطے کا ایک درخت سامنے والے مکان کی عقبی دیوار سے جڑا ہوا تھا۔ اس جگہ کو روبی نے شروع

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دن ہی سے ذہن میں رکھا ہوا تھا۔ یہاں سے ایک منزلہ مکانوں کی چھتوں سے ہوتی ہوئی وہ اپنے مکان کی چھت پر پہنچ سکتی تھی۔

احاطے میں خاموشی اور تاریکی تھی۔ مزدور مرد اور عورتیں تختوں اور چارپائیوں پر یہاں وہاں سو رہے تھے۔ روبی دبے پاؤں ان کے درمیان سے گزر کر سامنے والے درخت کے پاس آئی درخت کے تنے سے کوئی پانچ فٹ اوپر جا کر اس کی شاخیں شروع ہوتی تھیں۔ روبی کا لڑکپن اور جوانی کا ابتدائی حصہ برما کے جنگلوں میں ہی گزرا تھا۔ اس کے لئے یہ ایک آسان درخت تھا۔ اس درخت پر تو برما ہانگ کانگ کے درختوں کی طرح زہریلے سبز سانپوں کا خطرہ بھی نہیں تھا۔ پاکستان کے درخت تو روبی کو بڑے شریف' نیک اور بے ضرر لگے تھے۔ یہ بھی درخت ایسا ہی تھا۔ اس نے اچھل کر درخت کی ایک شاخ کو تھاما اور پھر جھول کر اس پر چڑھ گئی۔ درخت کی ایک موٹی شاخ مکان کی چھت کے قریب سے ہو کر اوپر نکلتی تھی۔ روبی بڑے آرام سے چھت پر اتر گئی۔ یہاں بھی اسے کچھ لوگ چارپائیوں پر سوتے نظر آئے۔ وہ تیزی سے مگر دبے پاؤں ان کے درمیان سے گزرتی ہوئی دوسری چھت پر آ گئی۔ یہ چھت خالی تھی اس سے اگلی چھت روبی کے مکان کی تھی۔ وہ یہاں آ کر بیٹھ گئی اور غور سے ماحول کا جائزہ لینے لگی۔ جب اسے وہاں کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا تو وہ گھٹنوں کے بل چلتی رات کی خاموشی اور اندھیرے میں اپنے مکان کی چھت پر آ گئی۔ نیچے چھوٹے سے صحن میں ایک زینہ اترتا تھا۔ روبی صحن میں آ گئی۔ اسے اپنی بچی عائشہ کے رونے کی آواز آئی۔ وہ بے چین ہو کر دروازے کی طرف گئی اور آہستہ سے دستک دی۔ اندر شیر خان جاگ رہا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو روبی تیزی سے اندر گھس گئی۔ شیر خان نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ اور بولا۔

"تم کس طرف سے آئی ہو؟ تمہیں کسی نہ کسی نے ضرور دیکھ لیا ہو گا۔ باہر تو چار آدمی ہر وقت منڈلاتے رہتے ہیں۔" روبی نے روتی ہوئی عائشہ کو چارپائی سے اٹھا کر اپنے ساتھ لگا لیا اور اسے پیار کرتے ہوئے بولی۔

"میں چھت پر سے آئی ہوں۔ کیا بات ہے۔ عائشہ آج مریم کے پاس نہیں رہی؟ اسے بھوک لگی ہے۔ دودھ ہے گھر میں؟"

شیر خان نے نعمت خانے میں سے دودھ کی پتیلی نکال کر بوتل میں دودھ ڈالا اور روبی عائشہ کو چارپائی پر لٹا کر دودھ پلانے لگی۔ اس نے شیر خان کی طرف چہرہ اٹھا کر ایک بار پھر پوچھا کہ عائشہ تو رات کو مریم کے ہاں ہوتی ہے اسے کیوں لے آئے تھے؟ میں جب آتی تو وہاں سے منگوا لیتے۔ شیر خان نے سامنے والی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مریم نے بچی کو اپنے پاس رکھنے سے انکار کر دیا ہے۔"

روبی شیر خان کا منہ تکنے لگی۔

"وہ کیوں؟" شیر خان نے اپنے سیاہ گھنگھریالے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کندھے اچکا کر کہا۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ بس اس نے کہہ دیا ہے کہ اب وہ بچی کی ذمے داری نہیں اٹھا سکتی۔" پھر پلٹ کر بولا "ضرور کوئی بات ہوئی ہے روبی ..... میرا دل کہتا ہے کہ مریم کو پولیس نے اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ آج میں سینما سے گھر آیا تو میں نے تین چار اجنبی آدمیوں کو یہاں محلے میں منڈلاتے دیکھا۔ ایک فقیر تو پرانی بلڈنگ کے باہر آ کر بیٹھ گیا ہے۔"

"یہ سب سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی ہیں۔"

روبی نے عائشہ کے بالوں کو اس کے ماتھے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں بھی اسی لئے آئی ہوں کہ یہاں سے نکل چلیں۔" شیر خان نے پوچھا۔

"تم نے ابھی تک مجھے نہیں بتایا کہ عائشہ تمہیں کہاں سے ملی؟ کیا ہاشم کو تم نے ہی قتل کیا ہے؟" روبی نے شعلہ برساتی آنکھوں سے شیر خان کی طرف دیکھا اور بولی۔

"تو اور کیا تمہارے باپ نے اسے قتل کیا ہے؟ میں نے اسے مارا ہے۔ اس کے دو غنڈوں کا خون بھی میں نے ہی کیا ہے۔ میں ایسے ایک ہزار ایک غنڈوں کا خون کر سکتی ہوں۔ وہ میرے جگر کے ٹکڑے' میری بیٹی کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ میں کیسے چپ بیٹھ سکتی تھی؟ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ میں چپ کر کے بیٹھ جانے والی عورت نہیں ہوں؟" شیر خان نے ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھتے ہوئے کہا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"خدا کے لئے اس وقت تو چپ ہو جاؤ۔ آہستہ بولو۔ ہو سکتا ہے باہر دروازے پر کسی نے کان لگا رکھے ہوں۔"

روبی بڑبڑاتی ہوئی خاموش ہو گئی اور اپنی بچی عائشہ کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ بچی آنکھیں بند کر کے دودھ پی رہی تھی۔ اسے نیند آ رہی تھی۔ روبی نے کہا۔

"میں نے بھی گلی کی نکڑ پر دو تین مشتبہ آدمی دیکھے ہیں اسی وجہ سے میں احاطے کی طرف سے چھتوں پر سے ہوتی یہاں آئی ہوں۔ چلو اٹھو۔ اب ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ہم کوئی سامان اپنے ساتھ نہیں لے جائیں گے۔ عائشہ کو اٹھالو۔"

روبی نے صدری میں سے سو سو کے نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر شیر خان کو دیں اور کہا۔

"یہ تم اپنے پاس رکھو۔ راستے میں حالات کچھ بھی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ میں تمہیں اور اپنی بیٹی کو ان غیر یقینی خوف زدہ حالات میں چھوڑ کر اکیلی کہیں نہیں جا سکتی۔ کم از کم تم دونوں کو کسی محفوظ مقام پر پہنچانے کے بعد کہیں جاؤں گی۔" شیر خان نے کہا۔

"نہیں روبی ہم جہاں بھی رہیں گے اکٹھے رہیں گے۔" روبی نے کہا۔

"تم ابھی تو یہاں سے نکلو۔ ہم مکان کی چھت سے ہو کر جائیں گے۔"

شیر خان نے نوٹ ایک کپڑے میں لپیٹ کر اپنی قمیص کے اندر کمر کے ساتھ باندھ لیے۔ سوئی ہوئی عائشہ کو اٹھا کر کاندھے سے لگایا اور روبی کے اشارے پر اس کے پیچھے کوٹھری سے باہر نکل آیا۔ دونوں جھک کر زینہ چڑھ کر چھت پر آ گئے۔ دونوں بیٹھ کر آگے بڑھ رہے تھے اسی طرح وہ دوسرے مکان کی چھت پر سے بھی گزر گئے اور اب سامنے درخت کی موٹی شاخ تھی۔ سب سے پہلے شیر خان شاخ پر چڑھا۔ روبی نے سوئی ہوئی بچی کو چھت پر سے اسے پکڑا دیا۔ وہ آہستہ آہستہ درخت سے نیچے اترنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی روبی بھی درخت سے اتر گئی۔ احاطے میں ابھی تک ویسے ہی سناٹا طاری تھا۔ کسی طرف سے کوئی بچہ رویا۔ اس کی ماں نے اسے نیند بھری آواز میں پچکارا اور اس کے بعد پھر خاموش ہو گئی۔ روبی اور شیر خان ان سوئے ہوئے لوگوں کے نیچے سے ہو کر احاطے سے باہر نکل آئے۔ اسی جگہ سے انہوں نے اپنا رخ سینما ہاؤس والی سڑک کی طرف کر لیا اور جتنی تیز چل سکتے تھے چلتے ہوئے ریلوے پل کی طرف جاتی سڑک پر آ کر لکڑی کے ایک بند

کھوکھے کے پیچھے بیٹھ گئے۔ روبی نے سنسان سڑک کی طرف دیکھا اور کہا۔

"شیرے! یہاں ہمیں کوئی رکشہ ٹیکسی نہیں ملے گی۔ چلو پیدل ہی چلتے ہیں۔" شیر خان نے بچی کو کاندھے سے لگا رکھا تھا۔ اسے آہستہ آہستہ تھپتھپاتے ہوئے بولا۔

"اسٹیشن یہاں سے بہت دور ہے ابھی کوئی خالی سواری آ جائے گی۔" جب پانچ دس منٹ گزر گئے تو روبی بے چین ہو گئی۔

"یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے۔ آگے چلو پل کے پاس کسی جگہ شاید سواری مل جائے۔"

وہ سڑک کے کنارے کنارے چلتے پل پر چڑھ گئے۔ یہ کافی بڑا پل تھا۔ دوسری طرف یہ ایک بڑی سڑک کے ساتھ جا کر مل جاتا تھا۔ یہاں انہیں ایک خالی رکشہ مل گیا۔ وہ اس میں بیٹھ کر سٹی اسٹیشن کی بجائے کافی فاصلہ طے کر کے کراچی صدر کے ریلوے اسٹیشن پر آ گئے۔ جب تک گاڑی نہ آئی دونوں اپنی بچی کو لیے پلیٹ فارم کے ایک کونے میں پڑے رہے۔ گاڑی کراچی سٹی سے تیار ہو کر آتی تھی۔ جب گاڑی آئی تو دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ روبی چونکہ ابھی تک مردانہ حلیئے میں تھی اس لئے شیر خان نے اسے اپنے ساتھ مردانہ ڈبے میں بٹھایا۔ احتیاطاً اس نے بچی اپنی گودی میں لے لی تھی کہ کہیں روبی زیادہ ممتا کا اظہار نہ کر دے اور بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔ اب روبی کے مردانہ حلیئے کو برقرار رکھنے کی ضرورت نہیں تھی مگر وہ کسی ایسی جگہ اپنا لباس تبدیل کرنا چاہتی تھی جہاں اسے زنانہ کپڑے مل سکتے ہوں۔ ٹرین کی منزل پشاور تھی۔ سفر میں کوئی تشویش ناک صورت حال پیش نہ آئی لاہور شہر سے بھی ٹرین نکل گئی۔ راولپنڈی پہنچی تو وہ دونوں اتر گئے۔ یہاں سے انہیں آگے ہزارہ کی سرسبز پہاڑی وادیوں میں جانا تھا مگر سب سے پہلے روبی کو زنانہ کپڑے پہنانا ضروری تھا۔ شیر خان اسے لے کر راجہ بازار کے ایک ہوٹل میں آ گیا۔ یہاں اس نے روبی کو اپنا چھوٹا بھائی ظاہر کر کے ایک کمرہ کرائے پر لے لیا۔ انہوں نے کھانا کھایا۔ بچی کو نہلا دھلا کر تازہ دودھ پلایا پھر دونوں بازار کی طرف نکل گئے۔ ایک دکان پر سے شیر خان نے روبی کے لئے کچھ زنانہ کپڑے خریدے اور واپس ہوٹل میں آ کر روبی نے کپڑوں کو تھیلے میں سنبھال کر رکھ لیا۔ وہ ہوٹل میں اپنا حلیہ نہیں بدلنا چاہتی تھی۔ ایک رات انہوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نے راجہ بازار کے ہوٹل میں گزاری۔ اس دوران شیر خان نے مری اور ایبٹ آباد کے درمیان کی وادی کی گلیوں اور دیہات کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر لی تھیں۔ اگلے روز وہ ایک بس میں سوار ہوئے جو کوہ مری جا رہی تھی۔

یہ ستمبر کا مہینہ تھا۔ پہاڑی علاقے میں سردی شروع ہو گئی تھی۔ صبح کا وقت تھا۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ جوں جوں بس چڑھائی چڑھ رہی تھی خنکی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بس میں زیادہ رش نہیں تھا۔ کوہ مری کے علاقے کے لوگ ہی سوار تھے۔ پہاڑ پر سیاحت کا موسم ختم ہو چکا تھا۔ شیر خان نے اس سارے علاقے کا نقشہ پنڈی سے ہی ذہن نشین کر لیا تھا۔ اس نے بعض جگہوں کے نام بھی یاد کر لیے تھے۔ اس نے یہ بھی معلوم کر لیا تھا کہ کوہ مری زیادہ بلندی پر واقع ہے جس کی وجہ سے وہاں ستمبر میں ہی سرد ہوائیں چلنے لگتی ہیں مگر نیچے وادی میں اتنی ٹھنڈ نہیں ہوتی۔ ابھی اسلام آباد تعمیر نہیں ہوا تھا۔ کوہ مری کی آبادی میں بھی اتنا اضافہ نہیں ہوا تھا۔ بس سٹی بینک رکی تو پروگرام کے مطابق شیر خان اور روبی بچی کو لیے وہیں اتر گئے۔ شیر خان کلڈنہ روڈ کی طرف چلنے لگا۔ اب روبی نے عائشہ کو کاندھے سے لگا رکھا تھا۔ روبی نے شیر خان سے پوچھا کہ آگے کدھر جانے کا ارادہ ہے؟ شیر خان بولا۔

"پہلے تو تمہیں دوبارہ عورت بنانا بڑا ضروری ہے۔ وہ جگہ ٹھیک رہے گی۔ میرے ساتھ آؤ۔"

ستمبر کے مہینے میں کوہ مری باہر سے آنے والوں سے تقریباً خالی ہو جاتا ہے۔ کم از کم اس زمانے میں خالی ہو جایا کرتا تھا اور لوگ میدانوں میں اتر جاتے تھے۔ کلڈنہ روڈ چھوٹی سی بڑی خاموش سڑک ہوا کرتی تھی۔ چیڑھ کے درختوں میں گھری ہوئی۔ ایک طرف پہاڑیوں کی چڑھائی اور دوسری طرف نیچے گہری سبز کشادہ وادیاں جن کے ٹیلوں پر جو اور مکئی کے کھیت سیڑھیوں کی شکل میں دور سے نظر آتے تھے۔ سرد ہوا چل رہی تھی۔ درختوں کے پتے جھڑنے لگے تھے۔ خزاں کا' سردیوں کا موسم شروع ہو رہا تھا۔ شیر خان سڑک سے ہٹ کر چڑھائی پر جھاڑیوں کی طرف آگیا۔ وہ بچی کو لے کر وہاں بیٹھ گیا اور روبی تھیلا لیے دوسری جھاڑیوں اور چیڑھ کے درختوں کے پیچھے کپڑے بدلنے چلی گئی۔ تھوڑی

دیر بعد وہ درختوں سے نکلی تو پوٹھوہار کی دیہاتی عورتوں کے لباس میں تھی۔ اگرچہ اس کے سر کے بال لمبے نہیں تھے۔ مگر اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر کوئی عورت پوچھے گی تو وہ یہی بتائے گی کہ بیماری کی وجہ سے اس کے بال گرنے لگے ہیں۔ کلڈنہ روڈ کے لوئر ٹوپے والے موڑ پر وہ نیچے ایک کچی پگ ڈنڈی پر ہو گئے جو نیچے وادی کے چھوٹے چھوٹے دیہات میں چلی گئی تھی۔ شیر خان نے بھی سویٹر پہن لیا تھا۔ روبی نے بچی کو بھی لال رنگ کا سویٹر پہنا کر سر پر گرم اونی ٹوپی بھی اوڑھا دی تھی۔

وادی بڑی خوبصورت اور پرسکون تھی۔ ٹیلوں پر اونچے نیچے دیہاتی مکان بکھرے ہوئے تھے۔ ہر مکان کے آگے کھیت اور پھل دار باغ تھے۔ درمیان میں پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا۔ وہاں وہ رک گئے اور سامنے والے دیہات کی طرف دیکھا۔ روبی نے ایک گاؤں کی طرف اشارہ کیا جس میں چار پانچ ہی دیہاتی مکان تھے۔ کہنے لگی۔

"یہ گاؤں ٹھیک رہے گا۔ کلڈنہ روڈ سے زیادہ دور بھی نہیں ہے اور شہر سے اس کا کوئی بظاہر تعلق بھی معلوم نہیں ہوتا۔"

وہ پہلے مکان کے سامنے جوار کے چھوٹے سے کھیت کے آگے پہنچ کر رک گئے۔ سامنے کچا مکان تھا جس کی چھت ڈھلوان تھی پیچھے ایک چھوٹی سی کوٹھری بھی تھی جس کے باہر خشک لکڑیوں اور سرکنڈوں کا ڈھیر لگا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا کلہاڑی کو پتھر پر رگڑ رہا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر عورت کونے میں چیڑھ کر درخت کے نیچے بندھی بھینس دھو رہی تھی۔ شیر خان اور روبی کو اپنی طرف آتے دیکھ کر دیہاتی آدمی اٹھ کھڑا ہوا اور خالص پوٹھواری لہجے میں بولا۔

"آپ لوگوں کو کہاں جانا ہے؟"

روبی اور شیر خان نے سلام کیا اور اسے مختصر لفظوں میں ایک پہلے سے بنی بنائی کہانی سنا دی کہ ہماری ضلع گجرات میں تھوڑی سی زمین تھی ماں باپ فوت ہو چکے تھے کوئی بہن بھائی نہ تھا کلکتے میں کچھ رشتے دار تھے۔ وہاں جا کر محنت مزدوری کرنے لگا اور وہیں اپنی پسند کی ایک لڑکی سے شادی کر لی جو اب میری بیوی ہے۔ واپس اپنے گاؤں آیا تو رشتے داروں نے جینا حرام کر دیا کیونکہ وہ اپنی برادری میں میری شادی کرنا چاہتے تھے یہاں آکر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میری بیٹی بھی دنیا میں آگئی۔ جب گاؤں میں زندگی گزارنی مشکل ہو گئی تو اپنی تھوڑی سی زمین اونے پونے بیچ باچ کر اپنی گھر والی اور بچی کے ساتھ ان پہاڑیوں میں نکل آیا ہوں۔ اس خیال سے کہ یہاں رہ کر محنت مزدوری کروں گا اور رشتے داروں کے جھگڑوں سے دور سکون کی زندگی گزار دوں گا۔ اس دیہاتی کی بیوی بھی ان کے قریب آگئی تھی اور شیر خان کی باتیں سننے لگی تھی۔ دیہاتی نے پوچھا۔

"مگر تم دونوں نے یہ علاقہ ہی کیوں چن لیا یہاں تو کوئی محنت مزدوری بھی نہیں ہے۔" شیر خان نے روبی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اصل میں میری بیوی سلطانہ پیچھے پہاڑی علاقے کی رہنے والی ہے اس کی خواہش تھی کہ ہم کسی خوبصورت پہاڑی علاقے میں جا کر رہیں گے۔ بس اسی خیال سے یہاں آگیا ہوں۔ میرے پاس کچھ رقم ہے۔ آپ وہ لے لیں اور مجھے یہاں چھوٹا سا کچا کوٹھا بنانے میں میری مدد کریں۔ میں اور میری بیوی کھیتی باڑی بھی کر لیں گے۔"

شیر خان نے صدری کی جیب سے دس ہزار روپے کے نوٹ نکال کر دیہاتی کے سامنے رکھے تو اس کے ذہن میں شیر خان اور اس کی بیوی کے بارے میں جو وسوسے پیدا ہو رہے تھے وہ ایک دم غائب ہو گئے۔ دس ہزار روپے کی رقم اس زمانے میں بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔ دیہاتی اور اس کی بیوی کا لہجہ بدل گیا۔ وہ کہنے لگا۔

"میرا نام کرم دین ہے اور میری بیوی کا نام داراں ہے۔ تمہیں نیا کوٹھا ڈالنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم ہمارا مکان ہی خرید لو۔ ہماری کوئی اولاد نہیں ہے۔ کوئی قریبی رشتے دار بھی یہاں نہیں ہم بوڑھے ہو رہے ہیں۔ تم ہماری اولاد کی طرح ہو۔ یہ مکان آج سے تمہارا ہے۔ ایک بھینس ہے۔ یہ دو کھیت ہیں۔ آگے جیسے تمہاری مرضی میں تمہیں مجبور نہیں کر رہا۔" اتنا کہہ کر کرم دین نے دس ہزار کے نوٹ شیر خان کو واپس کر دیے۔ شیر خان نے جلدی سے نوٹ واپس کرتے ہوئے کہا۔

"بھائی کرم دین! ہم نے تمہارا مکان خرید لیا یہ اس کا معاوضہ سمجھ لو۔ تم میرے بڑے بھائی ہو آج سے اور یہ تمہاری بھابی ہے ہم دونوں کھیتی باڑی کے کام میں تمہارا ہاتھ بٹائیں گے۔ کرم دین نے روپے اپنے پاس رکھ لئے اتنے روپے اکٹھے اس کے پاس زندگی میں

بھی نہیں آئے تھے وہ اور اس کی بیوی بڑے خوش تھے۔

شیر خان کرم دین کے ساتھ کھیتوں کی دیکھ بھال کرتا۔ بھینس کے لئے چارہ بھی کاٹ کر لے آتا۔ روبی بھی گھر کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں کرم دین کی ادھیڑ عمر بیوی داراں کا اس کے منع کرنے کے باوجود ہاتھ بٹاتی۔ مگر اس کی ساری توجہ اپنی بیٹی عائشہ کی پرورش کی طرف تھی۔ کوہ مری جا کر شیر خان بچی کے لئے بہت اعلیٰ کوالٹی کے دودھ کے ڈبے فراک، سویٹر، گرم ٹوپی، جرابیں اور دنیا جہان کی چیزیں لے آیا تھا۔ کرم دین اور داراں کے واسطے بھی وہ گرم چادریں الگ لایا تھا۔ اس دور افتادہ پہاڑی علاقے میں انہوں نے گویا ایک طرح سے نئی زندگی کا آغاز کیا تھا دو مہینے بعد انہوں نے عائشہ کو بھینس کے دودھ میں ذرا پانی ڈال کر پلانا شروع کر دیا۔ شیر خان نے کرم دین کو کچھ نئی بکریاں بھی خرید وا دیں۔ جن سے اس کا مقصد گوشت حاصل کرنا تھا۔ سردیوں کا موسم آگیا۔ یہاں سخت سردی پڑتی تھی۔ دسمبر میں برف بھی گرنے لگی۔ وادی کی نچان میں ہونے کے باعث وہاں تک آتے آتے برف ہلکی پڑ جاتی تھی۔ سردیوں کا موسم بھی گزر گیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شیر خان روبی اور عائشہ کی صحت بڑی اچھی ہو گئی تھی۔ عائشہ اب غوں غاں کرنے لگی تھی اور مکان کے صحن میں لڑھکتی پھرتی تھی۔ ایک سال اس پہاڑی گاؤں کے مکان میں گزر گیا۔ چھ سات مکان ہی تھے وہاں لوگ بڑے سادہ اور شریف تھے وہ بھی شیر خان کو اپنا بھائی سمجھنے لگے تھے۔ شیر خان ضرورت کے وقت ان کی دل کھول کر مدد کر دیا کرتا تھا۔ ان کے پاس ابھی کافی روپے تھے۔ وہاں روپے خرچ ہی کہاں ہوتے تھے۔ ہر ماہ شیر خان کرم دین کو ایک لگی بندھی رقم الگ دے دیا کرتا تھا۔ پہلے تو روبی کا خیال تھا کہ وہ زیادہ دنوں تک پولیس کی نظروں سے دور نہیں رہ سکے گی۔ لیکن جب ایک سال گزر گیا اور کوئی واقعہ نہ ہوا۔ کوئی پولیس والا اس کی تلاش میں وہاں نہ آیا تو اسے بھی کچھ کچھ یقین ہونے لگا کہ وہ قانون کی پہنچ سے باہر ہو گئی ہے اور اگر ساری زندگی نہیں تو کم از کم چھ سات سال اپنی بچی اور خاوند کے ساتھ وہاں ضرور گزار سکے گی۔ لیکن یہ اس کی بھول تھی۔ پنجاب پولیس کی نظروں سے جرم کرنے کے بعد بچ نکلنا کچھ انہونی سی بات ہے کہتے ہیں انگریزوں کے دور میں انگلستان کے اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں سے اگر قتل کا کوئی معمہ حل نہیں ہوتا تو وہ پنجاب پولیس کے کسی افسر کی خدمات حاصل کیا کرتے تھے۔ پنجاب پولیس جان بوجھ کر چشم پوشی سے کام نہ لے تو کوئی مجرم ان کی زد سے باہر نہیں نکل سکتا۔ چنانچہ کراچی کی پولیس کے ساتھ پنجاب کی پولیس بھی روبی اور شیر خان کی تلاش میں تھی مشکل صرف اتنی تھی کہ پولیس کا دور افتادہ پہاڑی دیہات کی طرف خیال نہیں گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ دونوں میاں بیوی اپنی بچی کے ساتھ کسی بڑے شہر میں چھپے ہوئے ہوں گے یا پھر قبائلی علاقے کی طرف نکل گئے ہوں گے۔ چنانچہ پولیس کی ایک پارٹی ملزمہ کی تلاش میں بنوں کی طرف بھی

جا چکی تھی۔ مگر ایک سال گزر جانے کے بعد بھی پولیس کو روبی اور شیر خان کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔ آخر پنجاب پولیس ان دونوں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئی۔

آباد ہونے کو تو شیر خان اور روبی پہاڑی گاؤں میں آباد ہو گئے تھے مگر یہاں کا رہن سہن ان کے لئے نیا تھا۔ وہ جنوبی مشرقی ایشیا کے بہت حد تک جدید شہروں میں رہتے آئے تھے چنانچہ انہیں بعض شہری چیزوں کی ضرورت پڑتی رہتی تھی اس کے لئے شیر خان کوہ مری کا مہینے میں ایک خفیہ چکر لگایا کرتا تھا خفیہ ان معنوں میں کہ وہ شام کا اندھیرا ہو جانے کے بعد کلڈنہ جانے والی سڑک سے ہوتا ہوا سٹی بینک کے عقبی پہاڑی راستے سے گزر کر مال پر ڈاک خانے کے پچھواڑ نکل آتا اور یہاں سے لوئر بازار میں داخل ہو کر جو چیزیں لینی ہوتیں وہ خرید کر تھیلے میں ڈالتا اور گرم کمبل میں منہ سر چھپائے اسی راستے سے واپس چل دیتا۔ سیزن کے دنوں میں یہاں کافی رش ہوتا ہے۔ میدانی علاقوں سے لوگوں کے ہجوم یہاں آئے ہوتے ہیں۔ ان دنوں کسی کا شیر خان کی طرف دھیان نہ جاتا تھا۔ مگر سیزن ختم ہونے کے بعد جب برفباری شروع ہو گئی تو شیر خان کو بہت محتاط رہنا پڑتا تھا کیونکہ مال پر اکا دکا مقامی لوگ ہی دکھائی دیتے تھے۔ برفباری کا پہلا سیزن گزر گیا۔ موسم بہار بھی نکل گیا۔

دوسرے سیزن میں برفباری شروع ہوئی تو ایک روز شیر خان ضروری چیزیں خریدنے کے لئے گاؤں کی چڑھائی چڑھ کر کلڈنہ روڈ پر آ گیا۔ یہ پہلی برفباری تھی اور بڑی ہلکی برف گر رہی تھی دو روز پہلے بجری بھی گری تھی۔ سخت ٹھنڈ تھی۔ کوہ مری کا علاقہ ملکی اور غیر ملکی سیاحوں سے بالکل خالی ہو چکا تھا۔ صرف مقامی لوگ ہی وہاں موجود تھے اور ان ہی کے واسطے لوئر بازار کھلا رہتا تھا۔ اب شیر خان شام کو نہیں بلکہ دن میں گھر سے نکل پڑتا تھا اس نے چھوٹی سی چادر اوڑھ رکھی تھی تاکہ کوئی آسانی سے اسے پہچان نہ سکے۔ یہ ساری احتیاطیں وہ اپنے لئے نہیں کرتا تھا۔ اس نے خود کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ پولیس کو اس کی تلاش بھی نہیں تھی۔ یہ سب کچھ وہ اپنی بیوی اور محبوبہ روبی کی خاطر کرتا تھا کیونکہ روبی اس کے ساتھ رہتی تھی اور نہ جانے کتنے خون کر چکی تھی اور جیل توڑ کر بھی بھاگی ہوئی تھی اور پولیس کو اس کی تلاش تھی وہ چاہتا تھا کہ روبی اب ہمیشہ کے لئے اس کے پاس اس کی پیاری بیٹی عائشہ کے پاس رہے چنانچہ وہ چاروں طرف سے چوکس ہو کر کوہ مری کے لوئر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بازار کی طرف جاتا تھا۔

اس روز ہلکی برفباری میں شیر خان حسب عادت سنی بینک سے ہی بائیں جانب ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا یہ راستہ جو اوپر مال روڈ کے ڈاک خانے کے پچھواڑے نکلتا تھا بڑا دشوار گزار تھا باقاعدہ راستہ نہیں تھا دیہاتی لوگوں نے چل چل کر بنا دیا تھا اب سنا ہے کہ وہاں باقاعدہ چھوٹی پکی سڑک بنا دی گئی ہے مگر جس زمانے کی ہم کہانی بیان کر رہے ہیں اس زمانے میں ادھر سے صرف دیہاتی لوگ ہی گزرتے تھے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہاں کہیں کہیں چڑھائی اتنی مشکل تھی کہ پتھروں اور جھاڑیوں کو پکڑ پکڑ کر اوپر چڑھنا پڑتا تھا۔ اور آدمی جب ڈاک خانے والی سڑک پر پہنچتا تو اس کا سانس دھونکنی کی مانند تیز تیز چل رہا ہوتا تھا۔ شیر خان ابھی جوان تھا سخت جان تھا اور اسے اس راستے سے جانے کی عادت بھی ہو گئی تھی۔ برف باریک باریک سفید پتیوں کی شکل میں گر رہی تھی۔

مال پر آنے کے بعد شیر خان جونہی ڈاک خانے کے چوک سے ہو کر لوئر بازار میں اترا تو کونے والے ایک چھوٹے ہوٹل میں بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ یہ کراچی پولیس کا مخبر تھا اور شیر خان کی شکل سے اچھی طرح واقف تھا اس وجہ سے پنجاب پولیس نے اسے کراچی سے منگوایا ہوا تھا وہ شیر خان کو دور ہی سے پہچان سکتا تھا شیر خان پولیس کو اس لئے مطلوب تھا کہ پولیس کو یقین تھا کہ اب اصل مجرمہ روبی بھی شیر خان کے ساتھ ہی رہ رہی ہے۔ مخبر نے کمبل کی بکل اور چھوٹی داڑھی میں بھی شیر خان کو پہچان لیا تھا۔ یہ مخبر اصل میں شیر خان اور اس کی مفرور بیوی ہی کی تلاش میں پنڈی سے پشاور کی طرف جا رہا تھا۔ راستے میں وہ پنڈی رک گیا اور پھر یہاں اپنے ایک پرانے دوست سے ملنے کی غرض سے کوہ مری آگیا تھا آج وہ واپس پنڈی جا رہا تھا کہ برفباری شروع ہو گئی اور وہ چائے پینے کے لئے وہاں رک گیا۔ شیر خان کو پہچانتے ہی مخبر ہوشیار ہو گیا۔ چائے اسے بھول گئی۔ اس نے چائے کے پیسے وہیں میز پر رکھے اور لوئر بازار میں شیر خان کے پیچھے اتر گیا۔ شیر خان اپنے خیال میں ایک دکان کے باہر کھڑا ولایتی صابن اور بے بی پاؤڈر اور خوشبو دار تیل کی شیشی خریدنے میں مصروف تھا۔ اسے کوئی خبر نہیں تھی کہ پولیس کا ایک آدمی اس کے پیچھے لگ گیا ہے اور آگے اس کی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب آنے

والا ہے۔

اس نے ضرورت کی چیزیں خرید کر تھیلے میں رکھیں اور واپس چل پڑا۔ مخبر بھی اس کی طرف پیٹھ کئے ایک دکان کے باہر کھڑا یونہی دکان پر رکھی ہوئی چیزوں کو اٹھا اٹھا کر دیکھ رہا تھا۔ شیر خان اس کے عقب سے گزر گیا جب وہ دس بارہ قدم کے فاصلے پر پہنچا تو مخبر نے اس کا پیچھا شروع کر دیا۔ شیر خان نے لوئر بازار کے باہر سیروز سینما کے باہر ایک ادھ کھلی دکان سے کچھ خشک میوے خرید کر تھیلے میں رکھ لئے وہ بڑی بے فکری سے واپس جا رہا تھا۔ ڈاک خانے کی عقبی سڑک پر ایک جگہ سے وہ ڈھلان اتر گیا مخبر بڑا تجربہ کار تھا وہ جانتا تھا کہ پہاڑی راستہ دور تک خالی ہے اور جب تک شیر خان کوئی موڑ نہیں گھومتا وہ اسے کسی بھی وقت سر گھما کر دیکھ سکا ہے۔ چنانچہ مخبر نے درمیان میں کافی فاصلہ ڈال دیا۔ برف اس طرح ہلکی ہلکی گر رہی تھی شیر خان اپنے خیال میں چلتا گیا۔ مخبر بھی اس کے پیچھے لگا رہا اسے ایک بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی تھی اسے قطعی یقین تھا کہ اس کی بیوی مفرور قاتلہ روبی بھی اس کے پاس ہی رہ رہی ہو گی۔

شیر خان اپنے گاؤں والے مکان میں داخل ہوا تو مخبر وہاں سے تھوڑی دور ایک ٹیلے کی اوٹ میں کھڑا تھا اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان عورت نے اس کے لئے دروازہ کھولا تھا یہ روبی تھی مخبر نے اسے بھی پہچان لیا تھا وہ وہیں سے واپس ہوا اور سیدھا سنی بینک آکر راولپنڈی جانے والی ایک بس میں سوار ہو گیا۔ بس تقریباً خالی تھی راولپنڈی پہنچتے ہی اس نے لاہور انسپکٹر شہباز کو جو اس کیس کی تفتیش کر رہا تھا یہ خوشخبری سنائی کہ مفرور قاتل عورت روبی کا سراغ مل گیا ہے۔ انسپکٹر شہباز کے لئے یہ بڑی قیمتی خبر تھی وہ اسی وقت پولیس پارٹی لے کر روانہ ہوا اور رات کے ایک بجے راولپنڈی میں پہنچ گیا۔ پنڈی میں یہ پولیس پارٹی صرف پانچ منٹ کے لئے رکی اور مخبر کو ساتھ لے کر کوہ مری کی طرف چل پڑی۔ انسپکٹر شہباز رات کے اندھیرے میں چھاپہ مار کر مفرور قاتلہ کو گرفتار کر لینا چاہتا تھا دن کے وقت اس کے ادھر ادھر نکل جانے کا ڈر تھا۔ پولیس پارٹی دو بند جیپوں میں سوار تھی۔ پنڈی سے سوا ایک بجے رات یہ جیپیں بارہ کھوہ سے نکل کر مری کی طرف رواں تھیں۔ ابھی اسلام آباد نہیں بنا تھا اور بری شاہ امام سے سیدھی سڑک کوہ مری کی پہاڑیوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی طرف جاتی تھی۔ ابھی راول ڈیم بھی نہیں بنا تھا۔

دوسرے طرف شیر خان روبی اپنے مکان کی کوٹھری میں خوب گرم ہو کر گہری نیند سو رہے تھے بیٹی عائشہ کو روبی نے اپنے ساتھ سلایا ہوا تھا شیر خان ساتھ والی چارپائی پر لحاف اوڑھے سویا ہوا تھا۔ طاق میں مٹی کا دیا روشن تھا جس کی بتی نیچی کر دی گئی تھی اور کوٹھری میں بے معلوم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی اچانک بچی رونے لگی۔ روبی کی آنکھ کھل گئی اس نے بچی کو بہلانے کی کوشش کی مگر وہ روتی رہی۔ روبی سمجھ گئی کہ عائشہ کو بھوک لگی ہے۔ وہ اس کے منہ میں چوسنی دے کر نعمت خانے کے پاس گئی جہاں جالی کے اندر دودھ رکھا ہوا تھا پانی سے بوتل دھو کر اس نے کوٹھری کے باہر جا کر چولہے میں آگ جلا کر دودھ نیم گرم کیا اسے بوتل میں ڈال کر ہلا رہی تھی کہ اس کے کانوں نے ایک آواز سنی یہ آواز کسی جیپ کے رکنے کی تھی اور اوپر کلڈنہ روڈ کی طرف سے آئی تھی۔ روبی کا ہاتھ بوتل ہلاتے ہلاتے وہیں رک گیا اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ ٹیلوں کی اونچی اونچی ڈھلانوں پر سفید برف کی بہت ہلکی سی تہہ چادر کی طرح بچھی تھی ستاروں کی چمک میں روبی نے اپنی نگاہیں اوپر کلڈنا روڈ کے چیڑھ کے درختوں پر جما دیں جو اندھیرے میں خاموش کھڑے تھے اتنے میں ایک دوسری جیپ کے کھڑے ہونے کی آواز آئی۔

روبی کے بدن میں خون کی گردش تیز ہو گئی وہ تیزی سے کوٹھری میں گئی بچی کے منہ سے چوسنی نکل گئی تھی اور وہ بھوک کی وجہ سے رو رہی تھی شیر خان لحاف میں لیٹے ہی لیٹے روبی کو آوازیں دے رہا تھا روبی نے دودھ کی بوتل بیٹی کے منہ میں لگا دی اور شیر خان کا لحاف پیچھے ہٹا کر کہا۔

"اٹھو میرا ریوالور اور گولیاں کہاں رکھی ہیں؟"

"کیا ہوا؟" شیر خان جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ روبی نے آہستہ سے کہا۔

"اونچی آواز نہ نکالو۔ ساتھ والی کوٹھری میں داراں اور اس کا خاوند سو رہے ہیں۔"

شیر خان نے پوچھا۔

"آخر ہوا کیا ہے۔ ریوالور کیوں مانگ رہی ہو؟" روبی نے بڑے جذباتی انداز میں کہا بلکہ اس کے منہ سے جیسے اپنے آپ یہ الفاظ نکل گئے۔

"شیر خان! شاید جدائی کا وقت آگیا ہے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں بتاتی کیا بات ہے؟" شیر خان نے روبی کو پیار سے جھڑک کر کہا روبی لپک کر دروازے کے پاس گئی اس کا ایک پٹ کھول کر باہر اندھیرے میں دیکھا اور پھر جلدی سے واپس آکر بولی۔

لگتا ہے کسی نے مخبری کر دی ہے۔ پولیس یہاں چھاپہ مارنے والی ہے میں نے اوپر کلڈنہ روڈ پر دو جیپوں کے کھڑے ہونے کی آواز سنی ہے۔" شیر خان نے کہا۔

"تمہیں کیسے پتا کہ وہ پولیس کی جیپیں ہیں ملٹری کی گاڑیاں بھی ہو سکتی ہیں۔" روبی نے کہا۔

"ملٹری کی گاڑیاں یہاں رات کے وقت کھڑی نہیں ہوا کرتیں۔ گزر جایا کرتی ہیں یہ پولیس پارٹی ہے میں جاتی ہوں تم عائشہ کا خیال رکھنا۔ اگر میں زندہ واپس نہ آئی تو اس کی پرورش اسی طرح کرنا جس طرح میں نے تمہیں ہدایت کی ہے۔" شیر خان نے روبی کو بڑے پیار سے اپنے پاس بٹھا کر تسلی دینے کی کوشش کی اور کہا۔

تم یہاں بیٹھو میں جا کر دیکھتا ہوں کہ معاملہ کیا ہے۔ روبی رسی پر لٹکتی ہوئی شیر خان کی گرم جیکٹ اتار کر جلدی جلدی پہننے لگی۔

"جو میں کہتی ہوں وہ کرو۔ ریوالور کہاں ہے؟"

"کونے والے ٹرنک میں ہے۔" یہ کہہ کر شیر خان کوٹھری سے باہر نکل گیا باہر رات بڑی سرد تھی اس نے اوپر کلڈنہ روڈ کی طرف گھور کر دیکھا وہاں سوائے چیڑھ کے اونچے اونچے سیاہ درختوں کے اور کچھ دکھائی نہ دیا۔ وہ پلٹ کر کوٹھی میں آیا تو روبی بچی کو گود میں لئے اسے دودھ پلا رہی تھی اور دیے کی ہلکی روشنی میں اسے ماتا بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ریوالور اور گولیوں کی بیلٹ اس کے قریب ہی چارپائی پر پڑی تھی روبی نے عائشہ کا ماتھا چوما اسے بستر میں لٹا کر لحاف اوپر کیا اور بیلٹ میں سے جلدی جلدی گولیاں نکال کر جیکٹ کی جیب میں ڈالنے لگی۔ شیر خان نے اس کا ہاتھ روک لیا۔

"کیا کر رہی ہو' پاگل ہو گئی ہو؟ اس وقت کہاں جاؤ گی؟ ریوالور مجھے دو پولیس کو میری لاش پر سے گزر کر تم تک پہنچنا ہو گا۔" روبی کی آنکھوں سے چنگاریاں سی پھوٹنے لگیں۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس نے شیر خان کو گریبان سے پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا اور اپنی آواز کو دباتے ہوئے بولی۔

"جب تک میری بچی زندہ ہے تمہیں نہیں مرنا۔ سنا تم نے؟ اسے اپنے دل پر لکھ رکھو۔ اگر تم میری بچی کو شیرنی بنائے بغیر مرگئے تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

شیر خان روبی کی خصلت سے واقف تھا اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور کہا۔

"مگر باہر تو کوئی نہیں ہے۔ یہاں پولیس نہیں آسکتی تمہیں خواہ مخواہ شک ہو گیا ہے۔" روبی نے ساری گولیاں جیکٹ کی جیب میں ڈال لی تھیں اتنے میں باہر سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی پتھر اونچائی سے گرا ہو۔ روبی نے ریوالور ہاتھ میں لے لیا اور تڑپ کر دروازے کی طرف لپکی ذرا سا پٹ کھول کر باہر دیکھا پھر پلٹ کر کہنے لگی۔

"جو کچھ میں نے کہا ہے اسے یاد رکھنا شیر خان اس پر عمل کرنا عائشہ کو شیرنی بنانا اسے کہنا کہ پاکستان کو امن سلامتی کا ملک بنانا ہے۔ یہاں سے جرائم اور تخریب کاری کا خاتمہ کرنا ہے باقی مجھے الفاظ نہیں مل رہے تم جانتے ہو پاکستان کو اسلام کا قلعہ کس طرح بنانا ہو گا۔" پھر نہ جانے روبی کے اندر کس جذبے نے جوش مارا یا اسے آنے والے حالات کا علم ہو گیا تھا وہ دوڑ کر شیر خان کی طرف آئی بے اختیار اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر اس کا ماتھا چوما اور عجیب سی ملکوتی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"میرے شیر! میں نے تمہاری قدر نہیں پہچانی مجھے معاف کر دینا اس لئے کہ سوائے تمہارے میں نے کسی سے محبت نہیں کی۔"

اس سے پہلے کہ شیر خان اس سے وفا شعار بیویوں والی محبت کا کوئی جواب دیتا روبی دروازہ کھول کر کوٹھری سے باہر نکل گئی۔ شیر خان اس کے پیچھے آیا اس نے آخری بار اپنی دلیر اور وفا شعار بیوی کو احاطے کی دیوار کی دوسری طرف سے نیچے ڈھلان اترتے دیکھا یہ روبی کی آخری جھلک تھی جو شیر خان نے دیکھی۔ اسے اپنے مکان کے پیچھے بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دی۔ شیر خان نے اندر آکر کوٹھری کا دروازہ بند کر دیا اس کے کان باہر کی آوازوں پر لگے تھے سرد ویران پہاڑی رات کے سناٹے میں کچھ آدمیوں کے جلدی جلدی احاطے میں سے گزرنے کی آواز آئی اور دوسرے لمحے کسی نے دروازے کو زور زور سے کھٹکھٹایا ساتھ ہی اونچی آواز میں کہا۔

"شیر خان! اپنی بیوی کو لے کر باہر آجاؤ۔ تم لوگ اب بھاگ نہیں سکتے۔" شیر خان نے دروازہ کھول دیا۔ باہر انسپکٹر شہباز چار سپاہیوں کے ساتھ کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں پستول تھا شیر خان نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں کس نے کہا کہ میری بیوی یہاں ہے؟ وہ تو مجھے اور اپنی دودھ پیتی بچی کو چھوڑ کر کب کی خدا جانے کہاں جا چکی ہے۔"

پولیس کوٹھری میں گھس آئی۔ ٹارچ کی روشنی میں ساری کوٹھری کی تلاشی لی ٹرنک کھول دیکھے ان میں زنانہ کپڑوں کو نکالتے ہوئے انسپکٹر شہباز نے گرج دار آواز میں پوچھا۔

"اگر تمہاری بیوی یہاں نہیں ہے تو پھر یہ زنانہ کپڑے کس کے ہیں؟"

انسپکٹر نے شیر خان کی طرف پستول کا رخ کیا اور بولا۔

"شیر خان تمہاری چالاکی یہاں تمہاری کوئی مدد نہیں کرے گی۔ ہمیں پورا علم ہو چکا ہے کہ تمہاری بیوی اور مفرور قاتلہ روبی اسی گھر میں تمہارے ساتھ رہ رہی ہے۔ سیدھی طرح ہمیں بتا دو کہ وہ کہاں چھپی ہوئی ہے نہیں تو تمہارا وہ حشر ہو گا جس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

شیر خان کوئی روایتی انداز کا شریف آدمی تو تھا نہیں کہ مصلحت اندیش اور رواداری سے کام لیتا اس نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا اور کہا۔

"انسپکٹر صاحب! میں مجرم نہیں ہوں اس سے پہلے بھی پولیس مجھے کافی تنگ کر چکی ہے اور اسے کچھ حاصل نہیں ہوا اس لئے کہ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میری بیوی اپنی جان بچائے کہاں ماری ماری پھر رہی ہے۔ اگر تم نے میرے ساتھ اب کوئی زیادتی کی تو میں نے بھی چوڑیاں نہیں پہن رکھیں اور میں کوئی شریف آدمی نہیں ہوں اپنی عزت کی حفاظت کرنی جانتا ہوں۔"

شیر خان کے بارے میں انسپکٹر شہباز کو پوری معلومات تھیں یہ بات اس کے علم میں تھی کہ شیر خان قیام پاکستان سے پہلے برما سنگاپور ہانگ کانگ میں بڑا نامی گرامی اور قاتل قسم کا اسمگلر رہ چکا تھا مگر پاکستان آکر شریفانہ زندگی بسر کر رہا تھا اور اس نے کبھی کوئی جرم نہیں کیا تھا سوائے اس جرم کے کہ اس نے پولیس کو مطلوب ایک مفرور قاتلہ کو اپنے پاس پناہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دی تھی جو اتفاق سے اس کی بیوی بھی تھی۔ انسپکٹر شہباز کچھ سنبھل گیا اس نے پولیس کو حکم دیا کہ چاروں طرف پھیل جاؤ اور مجرمہ کو تلاش کرو وہ یہیں کہیں چھپی ہو گی پھر شیر خان سے مخاطب ہو کر بولا۔" وہ ہم سے بچ کر کہیں نہیں جا سکے گی لیکن تمہیں اسی گھر میں رہنا ہو گا جب تک کہ تمہاری بیوی کو ہم پکڑ کر قانون کے حوالے نہیں کرتے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر شہباز بھی کوٹھری سے باہر نکل گیا۔

عائشہ رونے لگی تھی شیر خان نے دودھ کی بوتل کو دیکھا وہ خالی ہو چکی تھی۔ گلاس میں باقی دودھ اسی طرح پڑا تھا اس نے بوتل میں باقی کا دودھ بھی ڈال دیا بوتل کو بچی کے منہ کے ساتھ لگایا اور سوچنے لگا کہ روبی کا اندازہ کس قدر صحیح تھا اگر وہ ذرا دیر کر دیتی تو اس وقت پولیس اسے ہتھکڑی لگا کر اپنے ساتھ لے جا رہی ہوتی۔ یہ سوچ کر شیر خان کا دل بوجھل ہو گیا کہ خدا جانے روبی اتنی سرد رات میں کس طرف نکل گئی ہو گی۔

پولیس والوں کے شور سے کرم دین اور اس کی بیوی واراں کی بھی آنکھ کھل گئی تھی مگر وہ دونوں اپنی کوٹھری سے باہر نہیں نکلے تھے۔ جب پولیس چلی گئی تو وہ شیر خان کے پاس آئے اور کرم دین نے پوچھا۔

"شیرو بیٹا! کیا بات تھی؟ یہ پولیس کس کی تلاش میں آئی تھی؟" شیر خان بولا۔

"کیا بتاؤں بھائی کرم دین! رشتے داروں نے ابھی تک مجھے معاف نہیں کیا۔ حالانکہ میں اپنے حصے کی زمین بھی ان میں بانٹ آیا تھا۔ مگر پھر بھی انہوں نے مجھ پر جھوٹا مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ پولیس اسی سلسلے میں مجھ سے پوچھ گچھ کرنے آئی تھی۔" کرم دین اور واراں نے روبی کی چارپائی خالی دیکھی تو اس کے بارے میں پوچھا۔

"روبی کہاں ہے؟" شیر خان کو کچھ نہ کچھ جواب ضرور دینا تھا۔ کہنے لگا۔

"یہی سب سے بڑی مصیبت ہوئی ہے کہ میرے رشتے داروں نے روبی کے خلاف بھی مقدمہ درج کرا دیا ہے کہ وہ ان کا روپیہ لے کر بھاگ گئی ہے۔ پولیس میری بیوی کی تلاش میں ہی آئی تھی۔" کرم دین نے فکر مند ہو کر پوچھا۔

"یہ تو بڑی بری بات ہوئی ہے۔ بیٹی کہاں ہے؟" شیر خان بولا۔" وہ پولیس کو دیکھ کر کہیں باہر جا کر چھپ گئی ہے۔" واراں کہنے لگی۔

"ہائے میں مر گئی۔ بے چاری اتنی سردی میں کہاں چھپی ہو گی۔ میں باہر جا کر دیکھتی ہوں۔" شیر خان نے اسے روک دیا اور کہا۔

"نہیں نہیں بھابی! ابھی نہیں۔ پولیس چلی جائے گی تو وہ خود بخود واپس آ جائے گی۔" کرم دین اور واراں جانے لگے تو شیر خان نے ان کے شکوک کو دور کرنے کی کوشش میں کہا۔

"بھلا روبی کو چوری کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہمارے پاس تو اپنے پیسے کافی تھے۔"

"یہی تو میں بھی کہتی ہوں۔" واراں نے شیر خان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا اور پھر عائشہ کے بارے میں پوچھا کہ وہ سو گئی ہے۔ شیر خان نے کہا۔

"ہاں! دودھ پی کر سو گئی ہے۔" کرم دین اور اس کی بیوی چلے گئے۔

شیر خان باہر نکل کر روبی کو تلاش کرتا۔ اسے معلوم تھا کہ روبی پولیس سے بچنے کے لئے اب تک نہ جانے کہاں نکل چکی ہو گی۔ وہ سوچنے لگا کہ ان کی مخبری کس نے کی ہو گی؟ بہر حال مخبری بڑی صحیح ہوئی تھی اور اب یہ گاؤں بھی یہ علاقہ بھی پولیس کی مسلسل نگرانی میں آ گیا تھا اور اس حقیقت کے پیش نظر روبی کوئی خاص موقع دیکھ کر ہی واپس آئے گی۔

شیر خان کا چہرہ اس خیال سے اداس ہو گیا کہ نہ جانے ملاپ اور فرار کا یہ دردناک کھیل کس مقام پر جا کر ختم ہو گا۔ وہ لحاف اوپر کر کے چارپائی پر لیٹ گیا۔ عائشہ اپنی پلنگڑی پر چھوٹے سے لحاف کے اندر گہری نیند سو رہی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس سے بے پناہ پیار کرنے والی اور موت کی گہری خندقوں کو پار کر کے بار بار اس کے پاس آنے والی اس کی ماں برفباریوں کی شدید سردی اور یخ بستہ سرد رات میں نہ جانے کہاں ماری ماری پھر رہی ہو گی۔ شیر خان کا ذہن سخت پریشان تھا۔ باقی رات اس نے جاگ کر گزار دی۔

جب دن نکلا اور سورج نے اپنی سنہری روشنی پہاڑی ڈھلانوں پر بچھی ہوئی برف کی سفید چادر پر پھیلائی تو پہاڑی کوؤں کے بولنے کی آواز سے روبی کی آنکھ کھل گئی۔ جس خستہ حال کوٹھری میں اس نے باقی رات گزاری تھی وہ وادی کے ایک ویران مقام پر چیڑھ کے اونچے درختوں کے درمیان واقع تھی۔ اس کوٹھری کا دروازہ غائب تھا اور ڈھلواں چھت ایک طرف سے بیٹھ گئی تھی۔ کوٹھری میں کلہاڑی سے کاٹی ہوئی درختوں کی ٹہنیاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

بھری ہوئی تھیں۔ روبی اپنی گرم جیکٹ میں سمٹ سمٹا کر یہاں ایک طرف پڑی تھی۔ دروازے میں سے دن کی روشنی دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھی۔ سب سے پہلے اس نے اپنی جیکٹ کی تلاشی لی۔ بھرے ہوئے ریوالور اور خالی گولیوں کے علاوہ ایک جیب میں سے ایک سو باسٹھ روپے ملے۔ اسے اپنے گاؤں والے مکان سے اتنی عجلت میں بھاگنا پڑا تھا کہ وہ زیادہ رقم نہ رکھ سکی تھی۔ ایک چادر وہ اپنے ساتھ گھر سے اٹھا لائی تھی جو اس نے جیکٹ کے اوپر اوڑھ رکھی تھی۔ اسی چادر کے پلو سے اس نے اپنا سر بھی ڈھانپ لیا تھا۔ اس کے بال لمبے ہو گئے تھے۔ وہ عورت کے حقیقی روپ میں تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ پولیس اسے گرفتار کرنے کے لئے اسی علاقے میں چاروں طرف موجود ہو گی۔ ایسی صورت حال میں اسے کس طرف کو نکل جانا چاہیے۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے گھر کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ چکی ہے۔ یہ سارا علاقہ اب اس کے لئے غیر محفوظ تھا۔ وہ کسی محفوظ جگہ پر بیٹھ کر اپنی آئندہ زندگی کا کوئی منصوبہ بنانا چاہتی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ ایسی جگہ کونسی ہو سکتی ہے۔ اس کے ذہن میں دارا کے جگری دوست میاں خان کا خیال آگیا۔ میاں خان ایک دلیر اور قابل اعتبار آدمی تھا۔ اس کے فارم میں کچھ روز کے واسطے پناہ مل سکتی تھی۔ اس کے بعد جو ہونا ہو گا ہوتا رہے گا۔ یہ فیصلہ کر کے روبی خستہ حال دیہاتی کوٹھری سے باہر نکل آئی۔ وادی میں دن کا سنہری اجالا چاروں طرف پھیل چکا تھا۔ یہاں برف تو نہیں تھی مگر سردی بہت تھی۔ ڈھلان کے زینہ نما کھیتوں میں کہیں کہیں پانی سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔

روبی نے اپنے آپ کو چادر میں اچھی طرح سے لپیٹا۔ دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں دیے اور ایک پگڈنڈی پر چلنے لگی۔ اس کا رخ راولپنڈی کی طرف تھا۔ چلتے چلتے وہ ایک ایسی جگہ پر آگئی جہاں اسے دور پتلی سی سڑک نظر پڑی جو پہاڑی کے ساتھ ساتھ سانپ کی طرح بل کھاتی نیچے میدانی علاقے کی طرف چلی جاتی تھی۔ ایک ٹرک رینگتا ہوا چل رہا تھا جو کھلونا لگ رہا تھا۔ درمیان میں گہری کھائی تھی۔ روبی اندازے سے ایک طرف چل پڑی۔ جوں جوں وہ نیچے اتر رہی تھی سردی کم ہو رہی تھی۔ اسے پسینہ آگیا۔ ایک جگہ سے پانی کا جھرنا بہہ رہا تھا۔ اس کے پاس بیٹھ کر روبی نے پانی پیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ تھوڑا

آرام کیا اور اس کے بعد پھر چل پڑی۔ سورج سر پر آ چکا تھا کہ روبی پنڈی کو جاتی سڑک کے قریب پہنچ گئی۔ سیزن ختم ہو چکا تھا۔ سڑک پر گاڑیوں کی آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ کافی وقفے کے بعد کوہ مری کی طرف سے آنے والی کوئی لاری یا ٹرک سڑک پر سے گزر جاتا تھا۔ روبی بہت دور سے پہاڑی رستوں پر چل کر آئی تھی۔ وہ تھک گئی تھی اور اسے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ مگر سڑک پر آکر کسی لاری یا ٹرک کو ہاتھ دے کر روکنا اس کے لئے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ سڑک کے نیچے ڈھلان میں آگے کو چلنے لگی۔ ایک جگہ سے وہ چڑھائی چڑھ کر سڑک پر نکل آئی۔ یہاں موسم بڑا خوشگوار تھا۔ سردی کی شدت ختم ہو گئی تھی اور پہاڑوں کی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ کچھ فاصلے پر ایک چھوٹے سے پل کے پاس ایک لڑکا بیٹھا چھلیاں یعنی مکئی کے بھٹے بھون رہا تھا۔ روبی نے اس سے دو تین بھٹے لیے اور وہیں سڑک کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ کر کھانے لگی۔ وہ بالکل دیہاتی لباس میں تھی۔ صرف جیکٹ شہریوں والی تھی جو چادر کے نیچے چھپی ہوئی تھی۔ شلوار موٹے کپڑے کی تھی۔ سر چادر کے پلو سے ڈھکا ہوا تھا۔ روبی نے لڑکے سے پوچھا کہ پنڈی وہاں سے کتنی دور ہے؟ لڑکے نے بتایا کہ چھتر وہاں سے ایک فرلانگ پر ہے جہاں سے پنڈی کے میدان شروع ہو جاتے ہیں۔ لڑکے نے کہا۔

"تم یہاں سے کسی لاری پر بیٹھ جاؤ۔ وہ تمہیں پنڈی پہنچا دے گی۔"

روبی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے ایک لاری کو مری کی طرف سے آتے دیکھ لیا تھا اس میں بیٹھنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مگر جونہی لاری قریب پہنچی لڑکے نے اٹھ کر اسے ہاتھ کا اشارہ کر دیا۔ لاری رک گئی۔ لڑکے نے روبی سے مخاطب ہو کر کہا۔

"بی بی! اس میں بیٹھ جاؤ۔ یہ پنڈی جا رہی ہے۔"

روبی نے گردن موڑ کر لاری کی طرف دیکھا لاری تقریباً خالی تھی۔ دو چار دیہاتی آدمی بیٹھے تھے۔ روبی نے سوچا کہ اب جو ہو سو ہو۔ پنڈی تک وہ پیدل نہیں جا سکتی اور وہ لاری میں سوار ہو گئی۔ کنڈیکٹر نے اس سے کرایہ لے کر ٹکٹ دے دیا اور لاری پنڈی کی طرف چل دی۔ روبی پچھلی سیٹ پر کھڑکی کے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی اور چادر سے آدھا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ لاری پنڈی کے مضافات میں سے گزر کر پنڈی شہر میں داخل ہو گئی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

روبی نے ایک جگہ لاری کو رکوایا اور نیچے اتر گئی۔ ابھی اسلام آباد قائم نہیں ہوا تھا اور شہر میں ٹریفک کا زیادہ رش نہیں تھا۔ رکشہ وغیرہ بھی ابھی چلنا شروع نہیں ہوئے تھے۔ روبی ریلوے اسٹیشن پر جانا چاہتی تھی تاکہ وہاں سے لاہور جانے والی کوئی گاڑی پکڑ کر شاہدرہ تک جائے اور وہاں سے شیخوپورہ کا راستہ اختیار کر کے میاں خان کے فارم پر پہنچ جائے۔ وہ ایک سواریوں والے تانگے میں بیٹھ گئی جس میں عورتیں بھی بیٹھی تھیں اور وہ ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔ پنڈی ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو گئی۔ یہاں ریلوے پولیس کے کچھ سپاہی بھی اسے نظر آئے تھے۔ وہ تھرڈ کلاس کے کھلے ویٹنگ روم میں آکر بنچ پر بیٹھ گئی۔ کچھ دوسری عورتیں بھی بال بچوں کے ساتھ وہاں بیٹھی تھیں روبی نے معلوم کیا کہ لاہور جانے والی گاڑی دوپہر کے بعد ساڑھے تین بجے چلے گی۔ روبی کو وہاں دو اڑھائی گھنٹے گزارنے تھے۔ وہ وہاں سے اٹھ کر خوامخواہ لوگوں کی نگاہوں میں نہیں آنا چاہتی تھی لہٰذا وہیں دیہاتی عورتوں کی طرح چادر سے منہ سر ڈھانپے بیٹھی رہی۔ جو مسافر عورت اس کے قریب بیٹھی تھی اس نے روبی سے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہی ہے اور کیا وہ اکیلی ہے؟ روبی نے ادھر ادھر کی من گھڑت باتوں سے اس کی تسلی کر دی۔ پھر اسی کے ذریعے لاہور کی ایک ٹکٹ بھی منگوا لی اور وہیں بیٹھ کر روٹی بھی کھائی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ ترچھی نظروں سے آس پاس کا جائزہ لے لیتی تھی کہ کہیں کوئی پولیس کا سپاہی یا خفیہ پولیس کا آدمی تو وہاں نہیں ہے۔

ابھی تک اس قسم کا کوئی خطرہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ دو بجے دوپہر روبی اسی دیہاتی مسافر عورت کے ساتھ پلیٹ فارم پر آگئی اور ایک طرف بیٹھ گئی۔ اس عورت کے ساتھ دو بچے اور کچھ سامان بھی تھا۔ جب تین بج گئے تو انہیں یہ خبر ملی کہ جس گاڑی نے تین بجے لاہور جانے کے لئے پشاور سے آنا تھا وہ کسی وجہ سے منسوخ ہو گئی ہے اور اب لاہور جانے والے مسافروں کو رات کے دو بجے والی گاڑی ہی مل سکتی ہے۔

مسافروں میں بے چینی سی دوڑ گئی۔ کچھ مسافر وہاں سے لاری اڈے کی طرف چل دیئے مگر روبی مسافر عورت کے ساتھ وہیں پلیٹ فارم پر ہی بیٹھی رہی۔ اس وقت تک ادھر کوئی پولیس والا نہیں آیا تھا۔ وہاں کچھ دوسری عورتیں اور مرد بھی اپنا اپنا سامان رکھے بیٹھ

رہے تھے۔ رات ہو گئی پلیٹ فارم پر روبی نے مسافر عورت کے ساتھ ہی روٹیاں اور آلو شوربہ منگوا کر کھا لیا۔ وہ اس خیال سے مطمئن تھی کہ سفر رات کو کٹے گا اور وہ صبح صبح لاہور پہنچ گی۔ خدا خدا کر کے رات کے دو بجے اور پشاور سے گاڑی وہاں پہنچ گئی۔ دوسری عورتوں کے ساتھ روبی بھی تھرڈ کلاس کے ایک ڈبے میں سوار ہو گئی۔ رات کا سفر شروع ہو گیا۔ پنڈی سے نکلتے ہی عورتیں جہاں بیٹھی تھیں، وہیں سو گئیں۔ روبی کی بھی آنکھ لگ گئی۔ بیچ بیچ میں آنکھ کھلتی تو ٹرین شور مچاتی جا رہی تھی۔ پہاڑیوں میں ہی پو پھٹ گئی تھی اور دن کا اجالا طلوع ہونے لگا تھا۔ ٹرین جہلم رکی تو ایک درمیانی عمر کی صحت مند عورت دیہاتی لباس میں ڈبے میں داخل ہوئی۔ روبی سامنے والی سیٹ پر کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی۔ اس عورت نے روبی پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی اور بالمقابل سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ روبی کو محسوس ہوا کہ عورت کو اس نے پیچھے کسی اسٹیشن پر دیکھا تھا اور یہ ڈبے میں جھانکتی ہوئی گزر گئی تھی لیکن اس نے کوئی خیال نہ کیا۔ کیونکہ ہو سکتا تھا اس عورت کو کسی دوسرے ڈبے میں مناسب سیٹ نہ ملی ہو۔ اس نے روبی سے باتیں شروع کر دیں اور باتوں ہی باتوں میں پوچھا۔

"بہن! تم کہاں جا رہی ہو؟" روبی نے رازداری سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"کراچی جا رہی ہوں۔" اتنی سردی نہیں رہی تھی جس کے باعث روبی نے چادر اتار کر پاس رکھ لی تھی اور اس کی مردانہ جیکٹ نظر آ رہی تھی۔ عورت نے جیکٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ جیکٹ تو گرم ہے۔ لگتا ہے تم کوہ مری سے آ رہی ہو؟" روبی کے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ کہیں یہ عورت خفیہ پولیس والی نہ ہو۔ یہ سوچ کر روبی نے بے نیازی سے کہہ دیا۔

"یہ جیکٹ تو میں نے راولپنڈی سے خریدی تھی۔ دراصل مجھے سردی بڑی جلدی لگ جاتی ہے اس لئے پہن لی ہے۔"

روبی کھڑکی سے سر باہر نکال کر پلیٹ فارم کی دوسری طرف تکنے لگی۔ اس کے بعد روبی نے عورت کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ اگر وہ کوئی سوال کرتی تو اس کا ہوں ہاں میں

جواب دے کر خاموش ہو جاتی مگر اس کے دل میں شک پڑ گیا تھا کہ یہ عورت پولیس سے تعلق رکھتی ہے۔ لالہ موسیٰ آیا تو وہ عورت ڈبے سے اتر گئی۔ روبی کھڑکی میں سے اسے پلیٹ فارم پر جاتے دیکھتی رہی۔ وہ عورت گیٹ میں سے گزر گئی۔ ٹکٹ دکھانے کی بجائے اس نے گیٹ پر کھڑے ٹکٹ چیکر سے زبانی کوئی بات کی تھی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ یہ عورت لالہ موسیٰ نہیں جا رہی تھی بلکہ کسی خاص منصوبے کے تحت وہاں اتری ہے۔ روبی اپنے ڈبے میں ہی بیٹھی رہی۔ اس کی جیب میں بھرا ہوا ریوالور اور گولیاں موجود تھیں اور ہر صورت حال کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لئے پوری طرح تیار تھی۔

ٹرین تھوڑی دیر کو لالہ موسیٰ کے اسٹیشن پر رک کر لاہور کی طرف چل پڑی۔ روبی سوچنے لگی کہ اگر یہ خفیہ پولیس والی ہے تو سیدھی پولیس اسٹیشن گئی ہو گی جہاں سے وزیر آباد پولیس کو اس کی اطلاع کر دی جائے گی اور بہت ممکن ہے کہ وزیر آباد اسٹیشن پر پولیس روبی کو گرفتار کرنے کے لئے گھات لگائے بیٹھی ہو۔ اس خیال سے روبی کچھ پریشان ضرور ہو گئی۔ کیونکہ وہ پولیس مقابلہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ابھی تک کسی بے گناہ کا خون نہیں کیا تھا اور خاص طور پر قانون کا تحفظ کرنے والوں پر تو اس کا پستول کبھی نہیں اٹھا تھا۔ اس نے آج تک جتنے قتل کیے تھے وہ سب جرائم پیشہ اور بڑے خطرناک قسم کے خونی اور عصمتوں کے ڈاکو تھے۔ مگر وہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ابھی اس نے معاشرے کے جسم کے بہت سے ناسوروں کو ہمیشہ کے لئے کاٹ کر پھینکنا تھا۔ اب اس کی زندگی کا واحد مقصد ہی یہی تھا اور اسی مقصد کے لئے وہ زندہ تھی۔ مرنے سے پہلے وہ جتنے زہریلے سانپ مار سکتی تھی مار دینا چاہتی تھی۔ پاک وطن کی فضا کو گھناؤنے بدکار لوگوں سے جتنا پاک کر سکتی تھی پاک کر دینا چاہتی تھی۔

اب ایک ایسا اتفاق ہوا کہ وزیر آباد ریلوے اسٹیشن سے تھوڑی دور پہلے ریلوے لائن پر اچانک ایک بھینس انجن سے ٹکرا گئی۔ گاڑی روک دی گئی۔ روبی کے لئے قدرت نے جیسے خود ایک موقع فراہم کر دیا تھا۔ وزیر آباد اسٹیشن کے شہر کی مضافاتی آبادی شروع ہو چکی تھی۔ روبی فوراً وہاں ٹرین سے اتر گئی۔ اس کے ساتھ سفر کرنے والی دیہاتی عورت اس سے پوچھتی ہی رہ گئی کہ کہاں جا رہی ہو۔ ٹرین چل پڑے گی۔ مگر روبی نے کوئی جواب نہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیا۔ وہ ٹرین کی الٹی سمت چلنے لگی۔ اور پھر ٹرین کی دوسری طرف آ کر ڈھلان اتر کر ایک کھیت میں داخل ہو گئی جہاں جوار کی اونچی فصل کھڑی تھی۔ فصل نے اسے اپنے اندر چھپا لیا۔ وہ تیز تیز چلتی گئی۔ ایک کھیت سے نکل کر دوسرے اور دوسرے سے نکل کر تیسرے کھیت میں سے ہوتی ہوئی ایک کھلی جگہ پر آ گئی جہاں پیپل کے گنجان درخت کے قریب ایک ویران کنواں تھا۔ روبی نے جیکٹ میں سے ریوالور گولیاں اور پیسے نکال کر اپنی قمیص کے اندر چھپائے اور جیکٹ کنوئیں میں پھینک دی۔ اس جیکٹ سے وہ دور ہی سے پہچانی جا سکتی تھی۔

دوسری طرف جب ٹرین وزیر آباد اسٹیشن پر پہنچی تو وہاں پولیس پہلے سے موجود تھی۔ اس نے خفیہ پولیس والی عورت کے بتائے ہوئے نمبر والے زنانہ ڈبے پر اچانک چھاپہ مار کر روبی کی تلاش شروع کر دی۔ مگر وہاں جیکٹ والی کوئی عورت نہیں تھی۔ دوسری عورتوں سے پوچھ گچھ کرنے پر پولیس کو پتا چلا کہ جیکٹ والی عورت پیچھے جہاں ٹرین تھوڑی دیر کو رکی تھی اتر گئی تھی۔ پولیس پیچھے دوڑ پڑی۔ مگر اس وقت تک روبی ان کی پہنچ سے نکل چکی تھی۔ وہ کھیتوں کے پار ایک میدان عبور کر کے ایک لاری میں بیٹھ کر لاہور کی طرف چلی جا رہی تھی۔ اس زمانے میں پولیس کے پاس وائرلیس سیٹ نہیں ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ جب پولیس پارٹی مفرور قاتلہ روبی کو گرفتار کرنے میں ناکام رہی تو وہ وہیں سے جیپ میں گوجرانوالہ کی طرف روانہ ہو گئی تاکہ وہاں سے آگے اسٹیشن اور جی ٹی روڈ کی ناکہ بندی کی جا سکے۔ مگر اسی اثنا میں روبی کی لاری گوجرانوالہ سے آگے نکل گئی تھی۔ پولیس نے گوجرانوالہ پہنچ کر سڑک کی ناکہ بند کروی اور لاریوں کی پڑتال ہونے لگی۔ وہاں سے ٹیلی فون پر شاہدرہ کو خبر کر کے شاہدرہ چوک پر بھی پولیس متعین کروا دی گئی۔

جس لاری میں روبی سوار تھی جب وہ شاہدرہ چوک پہنچی تو روبی نے دیکھا کہ وہاں سڑک کی ایک جانب چھ سات لاریاں کھڑی تھیں اور پولیس ہر لاری میں سواریوں کی پڑتال کر رہی تھی۔ وہ خاموشی سے چادر لپیٹ کر اٹھی اور لاری کے پچھلے دروازے سے اتر گئی۔ یہ بات اب ثابت ہو گئی تھی کہ جہلم اسٹیشن پر جو عورت اس کے ڈبے میں داخل ہوئی تھی وہ خفیہ پولیس کی سپاہن تھی اور اسی نے پولیس کو اس کے پیچھے لگا دیا ہے۔ آگے دریائے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

راوی تھا جس پر ابھی دوسرا پل نہیں بنا تھا مگر روبی کو شیخوپورہ کی طرف جانا تھا شیخوپورہ کو ایک پکی سڑک شاہدرہ چوک ہی سے پھوٹتی تھی۔ روبی اندازے سے شیخوپورے والی سڑک کی طرف چلنے لگی۔ اسے کچھ فاصلے پر ٹاہلی کے درختوں کے درمیان شیخوپورہ والی سڑک نظر آگئی مگر وہاں پولیس کی ایک جیپ کھڑی دیکھ کر روبی الٹے قدم واپس مڑ گئی۔ گویا یہ سارا علاقہ پولیس نے اپنے گھیرے میں لے لیا تھا۔ اس نے اپنا رخ دریائے راوی کے پل کی طرف کر دیا۔ لیکن پل پر بھی پولیس سے آمنا سامنا ہو سکتا تھا۔ وہ شاہدرہ چوک کے قریب اسی مقام پر تھی جہاں کبھی کھجوروں کے جھنڈ ہوا کرتے تھے اور ملکہ نور جہاں کا مقبرہ ان کی بائیں جانب تھا۔ یہاں کچے پر ایک منزلہ مکانوں کی چھوٹی سی بستی تھی۔ وہ کچھ وقت کسی مکان کی چار دیواری میں گزارنا چاہتی تھی تاکہ خطرہ ٹل جائے اور وہ رات کے وقت شیخوپورہ کی طرف روانہ ہو۔ وہ سمجھ دار عورت تھی۔ زندگی کا اسے بڑا تجربہ تھا اور ہر صورت حال کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہتی تھی وہ کچی بستی میں داخل ہو گئی۔

یہاں آمنے سامنے بنے ہوئے کچے مکان تھے جن کے درمیان کچی گلی تھی جہاں ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ ایک عورت دروازے کے باہر بیٹھی برتن مانجھ رہی تھی۔ یہ غریب محنت کش مزدوروں کی کوئی کچی آبادی تھی۔ روبی نے اس عورت کو جا کر سلام کیا جو کچے مکان کے باہر بیٹھی برتن مانجھ رہی تھی۔ مکان کے دروازے پر ٹاٹ پڑا تھا۔ عورت ادھیڑ عمر تھی۔ اس نے وعلیکم السلام کہہ کر روبی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"کس سے ملنا ہے بی بی؟" روبی نے سب کچھ پہلے ہی سے سوچ لیا تھا۔ کہنے لگی۔

"میں راولپنڈی سے یہاں اپنی ماسی سے ملنے آئی تھی۔ پتا چلا کہ انہوں نے گھر بدل لیا ہے۔ یہاں میرا کوئی جاننے والا نہیں۔ میرے پاس کچھ پیسے تھے وہ لاری میں کسی نے نکال لیے ہیں۔ میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔" برتن دھونے والی عورت دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی ہوئی اٹھی اور بولی

"کوئی بات نہیں بہن! یہ بھی تمہارا اپنا گھر ہے۔ چلو اندر چل کر کچھ کھا پی لو۔" اس نے اپنی دونوں بیٹیوں کو باری باری آواز دی

"صغراں ..... نی ..... خورشید کہاں مر گئی ہو۔ روٹی والی چنگیر اور ساگ ہانڈی میں

ڈال کر لے آؤ۔" پیچھے ایک کچی کوٹھری تھی۔ باہر کونے میں مٹی کے دو گھڑے گڑونچیوں پر رکھے ہوئے تھے۔ ایک بکری کونے میں بندھی تھی۔ عورت نے روبی کو چارپائی پر بٹھایا کوٹھری میں سے دو نوجوان لڑکیاں باہر نکلیں جن کی عمریں سولہ سترہ سال سے زیادہ نہ ہوں گی۔ انہوں نے روبی کو غور سے دیکھا۔ ان کی ماں نے ساری بات بتا دی۔ ایک لڑکی کے ہاتھ میں روٹیوں والی چنگیر تھی جس میں ساگ والا پیالہ بھی رکھا تھا۔ دوسری لڑکی جلدی سے پانی کا گلاس لے آئی۔ عورت بولی۔

"یہ میری بیٹیاں ہیں صغراں چھوٹی ہے خورشید اس سے ڈیڑھ سال بڑی ہے۔ بس یہی دو بچیاں ہیں۔"

روبی خاموشی سے روٹی کھانے لگی۔ دونوں لڑکیاں اس کے سامنے پیڑھی پر بیٹھ گئیں اور اس کی طرف بڑے شوق سے تکنے لگیں۔ ان کی ماں نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"تم یہاں بیٹھی گھور گھور کر کیا دیکھ رہی ہو جاؤ اندر جا کر صفائی کرو۔ پھر کپڑے لا کر دھونے ہیں۔" دونوں لڑکیاں آپس میں کھسر پھسر کرتی اور ہنستی ہوئی اندر چلی گئیں۔ روبی نے پوچھا۔

"تمہارا خاوند کیا کام کرتا ہے؟" عورت بولی۔

"وہ لاری اڈے پر محنت مزدوری کرتا ہے اور ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں۔ غریب ہیں اس کچی آبادی میں اپنی عزتوں کو سنبھال کر بیٹھے ہوئے ہیں مگر بی بی زمانہ بڑا خراب آگیا ہے یہاں کچھ بدمعاش ہیں جن کے ڈر سے میں صغراں اور خورشید کو گھر سے باہر نہیں جانے دیتی۔" روبی نے کہا۔

"تم ان دونوں کی شادی کیوں نہیں کر دیتیں۔" عورت نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

"کیا کروں بہن ..... اتنے پیسے ہی نہیں۔ بستی کے سبھی لڑکے نشہ کرتے ہیں رشتہ داروں میں کوئی لڑکا نہیں ہے بس خدا پر ڈوری چھوڑ رکھی ہے۔"

روبی بڑے مزے سے ساگ کے ساتھ روٹی کھا رہی تھی۔ روبی اس غریب مگر انتہائی مہمان نواز شریف خاتون کی کچی کوٹھری کے آگے چارپائی پر بیٹھی ساگ روٹی کھا رہی تھی اور نہیں جانتی تھی کہ یہ اس کی زندگی کا آخری کھانا ہے۔ ٹھیک اسی وقت کچی آبادی کی اسی بیگی ٹیڑھی گلی کی نکڑ والی ایک کوٹھری میں تین جرائم پیشہ آدمی بیٹھے ٹین کے ڈبوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں دیسی شراب پی رہے تھے۔ یہ وہ بدمعاش تھے جنہوں نے کچی آبادی اور آس پاس کی بستیوں کے شریف لوگوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ وہ جس کی چاہے کھڑے کھڑے بے عزتی کر دیتے تھے اور عورتوں کو اغوا کر لیتے تھے۔ کچھ بااثر افراد ان کی پشت پناہی کرتے تھے۔ اور ان میں سے ہر آدمی پیسے لے کر ایک ایک بے گناہ کو قتل بھی کر چکے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام ماکھا دوسرے کا نام شیفا اور تیسرے کا نام بھانا تھا۔ تینوں ہٹے کٹے تھے اور شراب چڑھاتے ہوئے ایک دوسرے سے فحش مذاق بھی کر رہے تھے شفیع نے آنکھ مار کر کہا۔

"نہر والا ڈیرہ کب سے خالی پڑا ہے۔ کچھ کام دکھا دینا چاہئے۔" بھانا اور ماکھا اس کا مطلب سمجھ گئے تھے۔ ماکھا نے کہا۔

"تو پھر چلو مختاراں کے گھر۔ وہاں سے مال لے کر سیدھا ڈیرے پہنچ جاتے ہیں۔" بھانا کہنے لگا۔

"اٹھو یار۔ اسی عورت نے ہمارے خلاف علاقے کے کونسلر کے آگے..... شکایت بھی کی تھی۔ آج اسے مزا چکھا ہی دینا چاہئے۔" تینوں بدمعاش کوٹھری سے باہر نکل کر اس عورت کے گھر کی طرف چلے۔

روبی روٹی کھانے کے بعد چارپائی پر بیٹھی خورشید اور صغراں کی ماں مختاراں سے یونہی ادھر ادھر کی باتیں کر کے کچھ وقت گزار رہی تھی۔ اس کا پروگرام یہ تھا۔ کہ ذرا شام کا اندھیرا ہو جائے تو وہ وہاں سے نکل کر شیخوپورہ والی بس پکڑ لے اور میاں خان کے فارم میں رات ہونے سے پہلے پہنچ جائے ابھی تک اسے اس امر کا اطمینان تھا کہ پولیس اس کا پیچھا کرتی کچی آبادی میں نہیں پہنچی تھی۔

اسی لمحے ایک دم دروازے کا ٹاٹ ہٹا اور تینوں بدمست بدمعاش ہاتھوں میں پستول لئے اندر گھس آئے۔ مختاراں کی چیخ نکل گئی۔ خورشید اور صغراں بھی چیخیں مارتی ہوئی کوٹھری میں گھس گئیں ماکھے نے بڑک مار کر کہا۔

"بھاگ کر کہاں جاؤ گی۔ چل اوئے شفیع نکال ان دونوں کو باہر۔" شفیع نے ایک بڑک مار کر پستول کے دو ہوائی فائر کر دیے اور کوٹھری کی طرف لپکا روبی بھی جلدی سے اٹھ کر دیوار کے ساتھ لگ گئی۔ بھانے نے اپنی سرخ آنکھوں سے روبی کی طرف گھور کر

دیکھا اور اوپر والے ہونٹ پر اپنی زبان پھیر کر بولا۔

"اوئے ماکھے۔ یہ تو کوئی نئی بادشاہ زادی ہے۔"

ماکھے نے جھومتے ہوئے کہا۔

"چلو اس بادشاہ زادی کو بھی لے چلو۔ فائرنگ کے دھماکوں کی آواز سن کر کچی آبادی کے لوگوں نے اپنی اپنی کوٹھریوں کے دروازے بند کر لیے تھے اتنے میں شیفا کوٹھری سے چیختی چلاتی دونوں کنواری اور شریف لڑکیوں کو گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ اس کی ماں دوپٹہ پھیلا کر بدمعاش سے رحم کی بھیک مانگنے لگی۔ وہ رو رو کر کہہ رہی تھی۔

"خدا کے لئے میری بچیوں کو چھوڑ دو مجھ پر رحم کرو۔"

بھانے نے عورت کے منہ پر اتنی زور سے طمانچہ مارا کہ وہ چکرا کر فرش پر گر پڑی۔ ماکھے نے خورشید کو اور شیفے نے صغراں کو دبوچ لیا۔ بھانے نے پستول کی نالی کو چوما اور روبی کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"میری جان تم بھی چلو۔ تمہیں اپنے ڈیرے کی سیر کراتے ہیں۔"

روبی کا ہاتھ اس دوران قمیص کے اندر جا چکا تھا۔ جونہی بدمعاش نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ روبی نے بدمعاش کے سینے کا نشانہ لیا۔ بڑے اطمینان سے اوپر تلے دو فائر کر دیے۔ بھانے کے سینے سے خون کے فوارے ابل پڑے۔ دوسرے بدمعاش ایک سیکنڈ کے لئے ساکت ہو کر رہ گئے۔ ان کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ یہ دیہاتی عورت اچانک ریوالور نکال کر اس کے ساتھی کا خون کر دے گی۔

یہ صورتحال دیکھ کر شیفا صغراں کو گردن سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا کوٹھری سے باہر نکل گیا۔ ماکھے نے پستول سے روبی پر فائر کیا مگر اس کا نشانہ چوک گیا۔ دوسرا دھماکہ روبی کے ریوالور کا تھا۔ روبی کا نشانہ کبھی دور سے بھی نہیں چوکا تھا اور یہ درندہ صفت آدمی تو اس سے بھی چار قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ روبی کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی نے ماکھے کی کھوپڑی اڑا دی۔ اس کا بھیجہ بکھر گیا۔ مختاراں دہشت زدہ ہو گئی تھی۔ روبی اس کی بیٹی صغراں کو بچانے کے لئے باہر کو دوڑ پڑی۔

شیفا بدمعاش اس وقت صغراں کو کھینچتا ہوا۔ ریلوے لائن کی طرف لیے جا رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

صغراں چیخ رہی تھی مگر جیسے کہ اکثر ہوتا ہے کوئی شریف آدمی اس کی مدد کو نہیں آرہا تھا۔ بلکہ لوگ وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ تھوڑی دور پولیس کے دو سپاہی بھی کھوکے کے باہر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ انہوں نے فائرنگ کی آواز سن لی تھی اور جب علاقے کے بدمعاش شیفے کو ایک لڑکی اغوا کر کے لے جاتے دیکھا تو جان بوجھ کر انجانے بن گئے۔ روبی شیفے کے پیچھے دوڑی۔ شیفے بدمعاش نے صغراں کو اس طرح پکڑ رکھا تھا کہ روبی اس پر فائر نہیں کر سکتی تھی۔ صغراں اس کے چنگل میں کبھی دائیں آجاتی تھی اور کبھی بائیں۔ شیفے نے اپنے پیچھے روبی کو دیکھا تو رک کر دو فائر جھونک دیے۔ ایک گولی روبی کے قریب سے گزر گئی دوسری گولی اس کے بائیں بازو کو چیر گئی۔ روبی کا بازو ایسے گرم ہو گیا جیسے کسی نے انگاروں میں ڈال دیا ہو مگر وہ رکی نہیں۔ اس نے بدمعاش کی ٹانگ پر فائر کیئے مگر اسے گولی نہ لگ سکی۔ ریلوے لائن کے قریب پہنچ کر شیفے نے محسوس کیا کہ اس کا مقابلہ کسی تجربے کار عورت سے ہے۔ چنانچہ اس نے اچانک پستول کی نالی چیختی چلاتی خدا کے واسطے دیتی صغراں کی کنپٹی سے لگا دی۔ اور روبی کی طرف للکار کر کہا۔

"اگر تم واپس نہ گئیں تو میں صغراں کا خون کر دوں گا۔"

روبی وہیں رک گئی۔ اس کے زخمی بازو سے خون ابل ابل کر اس کے پاؤں تک بہہ رہا تھا۔ بدمعاش نے ایک بار پھر بڑک ماری اور للکار کر روبی سے کہا۔

"پیچھے چلی جا۔ چلی جا یہاں سے نہیں تو میں اسے گولی مارنے لگا ہوں۔" اب کچھ لوگ تماشا دیکھنے کے واسطے ادھر ادھر محفوظ جگہوں پر کھڑے ہو گئے تھے۔ مکانوں کی چھتوں پر بھی کچھ عورتیں اور مرد دکھائی دے رہے تھے۔ روبی نے سوچا کہ اگر وہ وہاں سے ہٹ گئی تو پھر ایک شریف لڑکی کی عزت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لٹ جائے گی۔ اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ اسے معاشرے میں کوئی قبول نہیں کرے گا۔ اس نے پیچھے ہٹنے کی بجائے شیفے بدمعاش کے سر کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ یہ روبی کی بدقسمتی تھی کہ اب اس کا نشانہ چوک گیا دوسرے لمحے شیفے بدمعاش کے پستول نے شعلے اگلے اور دو گولیاں روبی کے سینے میں آکر پیوست ہو گئیں روبی کو یوں لگا جیسے اس کے جسم میں آگ لگ گئی ہو گرتے گرتے اس نے ایک فائر کر دیا۔ یہ گولی شیفے بدمعاش کی گردن کے ایک حصے کو لوتھڑے اڑاتی نکل

گئی۔ ادھر روبی گری ادھر شیفا بدمعاش گرا۔

صغراں اس کی گرفت سے نکل کر دہشت زدہ حالت میں اپنے گھر کی طرف دوڑ پڑی۔ روبی کا سانس رکنے لگا تھا اس کی آنکھوں میں شیر خان اور اپنی بیٹی عائشہ کی شکلیں گھومنے لگی تھیں۔ دونوں گولیوں نے اس کے پھیپھڑے اڑا دیے تھے۔ وہ خون میں لت پت ریلوے لائن کے قریب زمین پر پڑی تھی اور اس کا خون مٹی میں جذب ہو رہا تھا۔ اب لوگ دوڑ کر اس کے قریب آگئے تھے اور روبی کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے خون میں ڈوبا دیکھ رہے تھے۔ روبی میں ابھی کچھ جان باقی تھی اس نے ایک مرتبہ ہاتھ اوپر اٹھایا۔ اس کے ہونٹ ذرا سا ہلے شاید وہ کچھ بتانا چاہتی تھی۔ شاید وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ میرے محبوب خاوند شیر خان کو جا کر بتا دو کہ اس کی روبی نے اپنے آپ کو ایک شریف لڑکی کی ناموس پر قربان کر دیا ہے۔ اسے جا کر بتا دو کہ اس کی پیاری روبی اب اس دنیا سے جا رہی ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ اسے کہو کہ میں اپنی بیٹی کو اپنی عائشہ کو اپنی شیرنی کو اس کے پاس چھوڑے جا رہی ہوں۔ اسے کہو کہ وہ عائشہ کو ایسی شیرنی بنائے جو پاکستان کے تخریب کاروں اور جرائم پیشہ بدمعاشوں کے لئے آدم خور بن جائے اور بے سہارا عورتوں کی حفاظت کرتے ہوئے اگر اسے جان بھی قربان کر دینی پڑے تو اپنی جان بھی قربان کر دے۔ اس کے ساتھ ہی روبی نے آخری سانس لیا اور اپنی جان اللہ کے سپرد کر دی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ریلوے لائن کے پاس لاہور کے مضافات کی ایک کچی آبادی کے باہر روبی کی لاش پڑی تھی۔ لوگ لاش کے قریب نہیں آرہے تھے۔ ان کے سامنے اس جانباز عورت روبی نے ایک غریب بیوہ عورت مختاراں کی دو جوان بیٹیوں کی عزت بچاتے ہوئے اپنی جان دے دی تھی۔ اس نے علاقے کے تین بدکردار غنڈوں کو سب کے سامنے قتل کر کے غریب بیوہ کی عزت کو تار تار ہونے سے بچا لیا تھا مگر خود بھی قتل ہو گئی تھی۔ عورتیں کچے مکانوں کی چھتوں پر کھڑی روبی کی لاش کو عقیدت و احترام کی نظروں سے دیکھ رہی تھیں مرد مکان کے دروازوں پر بیٹھے آپس میں چہ میگوئیاں کرتے ہوئے اس اجنبی عورت کی بہادری اور دلیری کی تعریف کر رہے تھے۔ ایک آوارہ کتا ریلوے لائن سے اتر کر روبی کی لاش کے قریب آیا مگر ڈر کر جدھر سے آیا تھا ادھر کو بھاگ گیا۔ ہاں ..... مرے ہوئے شیر کی بھی ایک دہشت ہوتی ہے۔ اتنے میں پولیس بھی وہاں پہنچ گئی۔ انسپکٹر نے روبی کو پہچان لیا اور حوالدار جبار علی سے کہا۔

"یہ تو وہی مفرور قاتلہ ہے جس کی ایک عرصے سے پولیس کو تلاش تھی اور جو اشتہاری قرار دے دی گئی تھی۔"

پوسٹ مارٹم کے بعد روبی کی لاش کو پولیس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ ضروری کارروائی کے بعد روبی کا کیس داخل دفتر کر دیا گیا اور راولپنڈی کے تھانہ بارہ کھوہ کو روبی کی لاش کی فوٹو بھیج کر ہدایت کی گئی کہ وہ اس کے خاوند شیر خان کو اطلاع کر دے۔ بارہ کھوہ پولیس کو علم تھا کہ شیر خان قریبی پہاڑی علاقے کی ایک وادی کے گاؤں میں رہتا ہے۔ روبی کو پکڑنے کے لئے پولیس نے وہاں سی۔ آئی۔ ڈی بھی لگا رکھی تھی۔ شیر خان کو جب روبی

کی لاش کی تصویر ملی تو وہ وہیں بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔ اس کی بچی عائشہ والان میں گھٹنوں کے بل چل کر ربڑ کی گیند سے کھیل رہی تھی۔ روبی کی لاش کی تصویر شیر خان کے ہاتھ میں تھی اور تصویر پر' روبی کی لاش پر شیر خان کے آنسو گر رہے تھے۔ اسے اپنی محبت کا وہ زمانہ یاد آرہا تھا جب اس نے روبی کو پہلی بار برما کے سرحدی جنگل میں اسمگلروں کے ڈیرے پر دیکھا تھا اور پہلی نظر میں ہی وہ اس سے محبت کرنے لگا تھا۔

شیر خان کی نگاہوں میں محبت کے پہلے زمانے کی حسین تصویریں گھومنے لگیں۔ اسے روبی کی آواز اس کے قہقہے اس کی شرمیلی مسکراہٹیں اس کی دلیرانہ باتیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ روبی کا ایک نہ ایک روز یہی انجام ہونے والا تھا مگر وہ اپنی محبت کا یہ انجام نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ روبی کا ماضی جیسا بھی تھا مگر اس نے پاکستان کو اپنا وطن بنا لیا تھا اور اب پاکستان کو امن و سلامتی کا گہوارہ بنانا چاہتی تھی۔ وہ پاکستان کی فضاؤں کو جرائم کی آلودگی سے پاک کر دینا چاہتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وقف کر دی تھی۔ اس نے کنارے پر کھڑے ہو کر طوفانوں کا تماشہ نہیں دیکھا تھا بلکہ طوفانوں میں کود کر بلا خیز موجوں کا مقابلہ کیا تھا۔ حالات نے اسے گناہ اور جرائم کی دلدل میں پھینک دیا تھا مگر روبی نے اس دلدل میں رہ کر بھی جرائم کا مقابلہ کیا اور گناہ کے عفریت کو اسی کی تلوار سے ہلاک کرتی رہی۔ اس نے پاکستان میں آکر قانون کے کسی محافظ پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ اس کے پستول کی گولیاں غریبوں کے حقوق کی حفاظت میں اور بے کس و مجبور عورتوں کی عزتوں پر ڈاکہ ڈالنے والوں پر چلیں اور آخر کار اسی خیر و شر کے میدان جنگ میں لڑتے ہوئے اس نے اپنی جان دے دی۔

یہ ساری باتیں شیر خان کے ذہن میں گونج رہی تھیں اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے جو روبی کی لاش کی تصویر پر گر رہے تھے۔ وہ سسکیاں بھر کر رونے لگا۔ شیر خان بھی ایک دلیر اور بہادر جوان تھا۔ برما اور لنکا کے جنگلوں میں اس نے قانون شکنیاں ضرور کی تھیں مگر پاکستان پہنچنے کے ساتھ ہی اس نے بھی اس پاک زمین کی مٹی کو چوم کر آنکھوں سے لگایا تھا اور جرائم سے توبہ کر لی تھی لیکن روبی نیکی اور بدی' جرم اور قانون کی جنگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں لڑتے لڑتے اتنی دور نکل گئی تھی کہ اب اس کی لاش ہی واپس آسکتی تھی اور ایسا ہی ہوا۔ روبی کی لاش لاہور کے پولیس اسپتال کے مردہ خانے میں اس کا انتظار کر رہی تھی۔

شیر خان کی سسکیوں کی آواز سن کر اس کی نو عمر بچی عائشہ گیند کی طرف لڑھکتے ہوئے رک گئی۔ اس نے معصوم چہرہ اٹھا کر اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ عائشہ اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ باپ اس کی ماں کی لاش کی تصویر ہاتھ میں لئے آنسو بہا رہا ہے۔ شیر خان نے بڑھ کر بچی کو اٹھا لیا۔ اسے سینے سے لگاتے ہی اس کی ہچکی بندھ گئی۔ ساتھ والے گھر میں کرم دین اور اس کی بیوی نے شیر خان کے رونے کی آواز سنی تو دوڑ کر اس کے پاس آگئے۔ انہوں نے زندگی میں پہلی بار شیر خان کو روتے ہوئے دیکھا تھا۔ کرم دین کی بیوی بچی کو اٹھا کر پیار کرنے لگی۔ کرم دین نے شیر خان کے کندھے پر بڑی محبت سے ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"شیر خان! اللہ خیر کرے۔ کیا ہوا؟"

شیر خان نے قمیص کے دامن سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے روبی کی لاش کی تصویر کرم دین کی طرف بڑھا دی۔

اگلے روز شیر خان نے بچی کو کرم دین اور اس کی بیوی کے حوالے کیا اور خود بس میں بیٹھ کر پنڈی کی طرف روانہ ہو گیا۔ راولپنڈی سے اس نے دوسری بس پکڑی اور لاہور پہنچ گیا۔ وہ رات گئے لاہور پہنچا تھا۔ رات اس نے لاری اڈے کے پاس ہی ایک ہوٹل میں سوتے جاگتے کسی نہ کسی طرح گزار دی۔ دوسرے دن وہ متعلقہ پولیس اسٹیشن آگیا۔ ایس ایچ او اس کی شکل سے واقف تھا۔ سارا دن ضروری کارروائیوں میں گزر گیا۔ شام کے قریب مردہ خانے لے جا کر روبی کی لاش اس کے حوالے کر دی گئی۔ روبی کی لاش ٹھنڈے فرش پر ایک طرف پڑی تھی۔ چہرے پر موت کی زردی چھائی تھی۔ آنکھیں ذرا ذرا کھلی تھیں۔ جیسے شیر خان کی طرف کن انکھیوں سے دیکھ رہی ہو۔ شیر خان بے اختیار لاش سے لپٹ گیا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنی چیخ کی آواز سنی۔ یہ چیخ زخمی شیر کی دہاڑ کی طرح اس کے سینے سے نکل کر مردہ خانے کی سرد فضا کو چیرتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ مگر بہت جلد شیر خان نے اپنے اوپر قابو پا لیا۔ وہ جانتا تھا اسے روتا دیکھ کر روبی کی روح کو تکلیف پہنچے

گی۔ وہ شیر خان کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے روبی کی لاش کو یوں اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا جس طرح میدان جنگ میں ایک بہادر سپاہی دوسرے بہادر سپاہی کی لاش کو اٹھاتا ہے۔

شیر خان کے پاس کافی پیسے تھے۔ اس نے ایک پوری ویگن کروا کر روبی کی لاش کو اس میں رکھا اور اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ دوسرے روز دوپہر کے وقت وہ گاؤں پہنچ گیا۔ یہاں کرم دین کی بیوی دا راں نے روبی کی میت کو غسل دیا اور اسے کفنا کر چارپائی پر ڈال دیا۔ شیر خان میت کے پاس بیٹھ کر کلمہ شریف کا ورد کرنے لگا۔ اسے کلمہ ہی آتا تھا۔ عائشہ کو ماں کی میت سے قصداً دور رکھا گیا۔ گاؤں کی دوسری عورتیں بھی وہاں آگئیں اور سیپارے کھول کر پڑھنے لگیں۔ شیر خان ان خواتین کے احترام میں میت کے پاس سے اٹھا اور باہر آکر بیٹھ گیا جہاں کرم دین نے تین چارپائیاں بچھا دی تھیں اور اس پہاڑی گاؤں کے جو چند ایک گھر تھے ان کے مرد تعزیت کے واسطے وہاں پہلے سے بیٹھے تھے۔ گاؤں کے جنوب میں ذرا نیچے خوبانی کے ایک کافی پھیلے ہوئے درخت کے پاس ایک پہاڑی چشمہ بہتا تھا۔ وہیں شیر خان نے اپنی دوست اپنی بیوی روبی کی آخری آرام گاہ تیار کروائی۔ شام ہونے سے پہلے روبی کو اس قبر میں دفنا دیا گیا۔

شیر خان نے خود میت کو لحد میں اتارا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ روبی کو آخری بار اپنے سے جدا کر رہا ہے۔ وہ غم سے نڈھال تھا۔ لحد میں میت کو اتارنے کے بعد شیر خان نے آخری بار اپنی پیاری بیوی کا دیدار کیا۔ روبی کا چہرہ زرد تھا۔ آنکھیں ذرا ذرا کھلی تھیں۔ صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس کی چیخ نکل گئی۔ کرم دین نے دوسرے لوگوں کی مدد سے شیر خان کو قبر سے باہر نکالا۔ شیر خان ایک طرف بیٹھ کر آنسو بہانے لگا۔ قبر تیار ہو گئی۔ شیر خان پھٹی پھٹی آنکھوں سے روبی کی قبر کو تک رہا تھا۔ اسے وہ دن یاد آگیا جب وہ پہلی بار برما کے جنگل میں روبی سے ملا تھا۔ وہ سنہری بالوں کو پیچھے کی طرف جھٹک کر اسمگلروں کے اسٹیمر سے نیچے اتر رہی تھی۔ شیر خان نے قبر پر کپکپاتے ہاتھوں سے گلاب کے سرخ پھول ڈالے۔ کرم دین اسے صبر کی تلقین کر رہا تھا۔

روبی کی جواں مرگی نے شیر خان کو جیسے نیم دیوانہ بنا دیا تھا۔ وہ سارا سارا دن اس کی قبر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پر بیٹھا اسے یاد کرتا اور آنسو بہاتا رہتا۔ کرم دین کی بیوی عائشہ کی دیکھ بھال کرتی۔ شیر خان کو کھانے پینے کا ہوش نہیں تھا۔ اسے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ روبی اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئی ہے۔ کرم دین اس کے ساتھ ساتھ رہتا۔ اسے سمجھاتا۔ صبر کرنے کے لئے کہتا مگر شیر خان کو صبر نہیں آتا تھا۔ اسے روبی اپنی آنکھوں کے سامنے چلتی پھرتی باتیں کرتی ہنستی بولتی نظر آتی۔ اس کی داڑھی بڑھ آئی تھی۔ اسے کپڑے بدلنے کا بھی کچھ ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ آدھی آدھی رات کو اٹھ کر بے اختیار روبی کی قبر پر پہنچ جاتا اور اس سے دیوانوں کی طرح باتیں کرتا۔ اسے آوازیں دیتا۔ اسے کہتا کہ تم مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں! کیا تم اب کبھی مجھ سے بات نہیں کرو گی؟

ایک رات کو ایسا ہوا کہ شیر خان سخت سردی میں روبی کی قبر سے لپٹ کر رو رہا تھا کہ اچانک اسے بجلی کا جھٹکا سا لگا۔ وہ تڑپ کر پرے جا گرا اور سراسیمگی کے عالم میں قبر کی طرف دیکھنے لگا جو رات کے اندھیرے میں دھندلی دھندلی دکھائی دیتی تھی۔ ابھی وہ سنبھل نہیں پایا تھا کہ اسے ایک اور جھٹکا لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے پیچھے کی طرف دھکا دیا ہو۔ ساتھ ہی اس کے کانوں میں ایک آواز گونجی۔

"یہاں کیا لینے آجاتے ہو؟ جاؤ جا کر میری بچی کی اسی طرح پرورش کرو جس طرح میں تمہیں کہا کرتی تھی۔ وہ شیرنی کی بیٹی ہے' اسے شیرنی بناؤ۔ اسے اس لائق بناؤ کہ وہ اپنے ناموس کے تحفظ کے ساتھ ساتھ پاکستان کی بے کس و لاچار عورتوں کے ناموس کی بھی حفاظت کر سکے۔ جاؤ ..... اپنا فرض اور میری وصیت پوری کرو۔ یہاں کیا لینے آجاتے ہو۔"

شیر خان کے جسم کو ایک اور جھٹکا لگا اور وہ وہیں گر کر بے ہوش ہو گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو وادی میں چاروں طرف سنہری دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ خوبانی کے درخت پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ روبی کی قبر پر گلاب کے سرخ پھول ابھی تک تر و تازہ تھے۔ اسے رات کے واقعے کا خیال آرہا تھا۔ وہ آواز اگرچہ روبی کی آواز سے مختلف تھی مگر جو کچھ اس آواز نے شیر خان کو کہا وہ روبی ہی کہہ سکتی تھی۔ شیر خان کلمہ شریف کا ورد کرتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس کے چہرے پر سورج کی سنہری کرنیں پڑ رہی تھیں۔ اسے اپنے اندر ایک نئی

طاقت ایک نئی توانائی کا احساس ہوا۔ اس نے روبی کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر اس کی روح کو ثواب پہنچایا اور دل میں ایک نیا عزم ایک نیا عہد لے کر اپنے مکان کی طرف چل پڑا۔ پتھر کی دیواروں والے چھوٹے سے مکان کے دالان میں کرم دین کی بیوی شیر خان کی بیٹی عائشہ کو دھوپ میں اپنے سامنے بٹھائے اسے دلیا کھلا رہی تھی۔ عائشہ نے اپنا معصوم چہرہ اٹھا کر باپ کو دیکھا۔ شیر خان کو یوں لگا جیسے روبی بچی کی صورت میں اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ عائشہ کی شکل اپنی ماں سے ہو بہو ملنے لگی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر عائشہ کو گود میں اٹھا لیا اور اسے پیار کرتے ہوئے کرم دین کی بیوی سے بولا۔

"داراں بہن! تم جا کر آرام کرو میں دلیا کھلاؤں گا اپنی بیٹی کو۔" داراں اپنے گھر چلی گئی اور شیر خان عائشہ کو دلیا کھلاتے ہوئے اس سے باتیں کرنے لگا۔ پھر اس نے اٹھ کر شیو کی۔ کپڑے بدلے اور بچی کو داراں کے حوالے کر کے کرم دین کو لے کر مکان سے باہر آگیا۔

"کرم دین! میں چاہتا ہوں کہ میرے پاس جو جمع پونجی بچ رہی ہے اسی سے راولپنڈی جا کر کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کروں۔ میں اس مقصد کے لئے پنڈی کا ایک چکر لگانے جا رہا ہوں۔ تم عائشہ کا خیال رکھنا میں چند روز تک واپس آجاؤں گا۔" کرم دین نے پوچھا۔

"تم کس قسم کا کاروبار کرنا چاہتے ہو۔"

"ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ تو پنڈی جا کر ہی معلوم کروں گا۔ ویسے مجھے قیمتی پتھروں کی بڑی پہچان ہے۔ راولپنڈی میں کچھ صراف پتھروں کا کاروبار کرتے ہیں۔ میں ان سے جا کر ملوں گا۔ تب ہی کچھ اندازہ ہو سکے گا کہ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں۔"

شیر خان نے صدری کی جیب سے کچھ روپے نکال کر کرم دین کو دیے اور اس پہاڑی سڑک کی طرف چل پڑا جہاں سے اسے راولپنڈی کی بس پکڑنی تھی۔ راولپنڈی آکر شیر خان نے راجہ بازار کے ایک درمیانے سے ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے لیا۔ دوپہر ہو گئی تھی اس نے منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھایا اور صرافہ بازار کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہاں اس کا کوئی واقف نہیں تھا مگر اسے یقین تھا کہ وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو گا۔ اس نے کھدر کی شلوار قمیص کے اوپر چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر گرم اونی ٹوپی تھی۔ راولپنڈی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں سردی کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ صرافہ بازار میں کافی رونق تھی۔ یہاں زیادہ تر سونے کے زیورات کی دکانیں تھیں۔ ایک جگہ سڑک کے فٹ پاتھ پر اسے ایک آدمی قیمتی پتھروں کو اپنے سامنے سجائے بیٹھا نظر آیا۔ شیر خان وہاں رک کر پتھروں کو تکنے لگا۔ وہ برما اور لنکا میں جن اسمگلروں کے ساتھ رہا تھا وہ زیادہ تر قیمتی ہیرے جواہرات کی ہی اسمگلنگ کرتے تھے اور شیر خان کو بچپن ہی سے ان پتھروں کی بڑی پہچان ہو گئی تھی۔ وہ بیٹھ گیا۔ وہاں فٹ پاتھ پر بچھائے ہوئے اخبار پر مرجان، پکھراج، عقیق اور سفید موتیوں کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں لگی تھیں۔ شیر خان ایک مرجان کو اٹھا کر غور سے دیکھنے لگا۔ دکاندار نے شیر خان سے پیچھا چھڑانے کے انداز میں کہا۔

"بھائی کیا دیکھ رہے ہو۔ اصلی ہیں۔ تم اسے نہیں خرید سکتے۔ جاؤ اپنا راستہ لو۔" شیر خان نے مرجان اپنی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے کہا۔

"بھائی صاحب! یہ مرجان اصلی نہیں ہے۔ آپ یہاں بیٹھے قیمتی پتھر بیچتے ہیں اور آپ کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ یہ نقلی مرجان؟ دکاندار نے ایک ثانیئے کے لئے غور سے شیر خان کو دیکھا۔ پھر مرجان اس کی ہتھیلی سے اٹھا کر ڈھیری میں رکھ دیا۔

"اچھا بھائی یہ نقلی ہے تو تم کسی اور جگہ سے اصلی خرید لو۔"

شیر خان نے ایک ہی نگاہ میں وہاں پڑے ہوئے تمام پتھروں کا جائزہ لے لیا۔ وہ مسکرا کر کہنے لگا

"بھائی! یہ سارے پتھر جو تم نے یہاں رکھے ہوئے ہیں ان میں سے ایک بھی اصلی نہیں ہے۔" دکاندار نے شیر خان کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھا اور ذرا سا آگے جھک کر پوچھا۔

"بھائی! تم کام کیا کرتے ہو؟" شیر خان کہنے لگا۔

"بھائی کسی کام ہی کی تلاش میں یہاں آیا ہوں۔" فٹ پاتھ پر بیٹھے اس چھوٹے دکاندار نے شیر خان کے لئے چائے منگوائی اور اس سے قیمتی پتھروں کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ بہت جلد اس پر یہ ظاہر ہو گیا کہ شیر خان کو پتھروں کی زبردست پہچان ہے اور وہ ایک ماہر جوہری ہے۔ اس نے شیر خان سے کہا۔

"کیا تم میرے ساتھ کاروبار کرو گے؟" شیر خان بولا۔ "مگر بھائی میں نقلی پتھروں کا کام

نہیں کر سکتا۔ ادھر لنکا میں میں اصلی جواہرات کا کاروبار کرتا تھا۔ وہاں انقلاب آگیا۔ جنگ شروع ہو گئی اور میرا سارا کاروبار وہیں ختم ہو گیا۔ اب پاکستان آگیا ہوں۔ چاہتا ہوں پھر سے پتھروں کا کاروبار شروع کر دوں۔" فٹ پاتھیئے دکاندار نے وہاں ایک آدمی بٹھایا اور شیر خان کو ایک جوہری کے پاس لے گیا۔ یہ بڑا دیانت دار جوہری تھا وہ بھی شیر خان کی مہارت سے بڑا متاثر ہوا۔ اس نے شیر خان کو پندرہ بیس نقلی پتھروں میں ایک اصلی پتھر ملا کر کہا۔

"تمہارے خیال میں یہ اصلی ہیں یا نقلی؟" شیر خان کی آنکھ کیسے دھوکا کھا سکتی تھی۔ اس نے نقلی پتھروں میں سے اصلی اٹھا کر جوہری کی طرف بڑھا دیا۔

"بس اس میں یہی ایک اصلی ہے۔"

جوہری نے شیر خان کو اپنے ہاں ملازم رکھنے کی پیش کش کر دی۔ شیر خان نوکری کی بجائے اپنا کاروبار کرنا چاہتا تھا مگر اس نے دیکھ لیا کہ شروع شروع میں اسے کچھ روز ملازمت ہی کرنی پڑے گی۔ اس نے حامی بھر لی اور دو روز بعد آنے کا کہہ کر واپس اپنے گاؤں آگیا۔ اس نے کرم دین کو اپنی ملازمت کے بارے میں بتایا اور کہا کہ عائشہ کی دیکھ بھال کرے۔

"میں ہفتے میں صرف ایک بار ہی اپنی بچی کو دیکھنے آسکوں گا۔" کرم دین کی بیوی داراں بھی وہیں موجود تھی۔ اس نے کہا۔

"بیٹا! تم بالکل بے فکر ہو کر ملازمت کرو۔ میں عائشہ کا پورا خیال رکھوں گی۔ ویسے بھی وہ اب مجھ سے بڑی مانوس ہو گئی ہے۔"

شیر خان نے راولپنڈی کے جوہری کے ہاں ملازمت کر لی۔ صرف اتوار کو وہ اپنے گاؤں بچی کے پاس آجاتا اور دوسرے دن واپس پنڈی چلا جاتا۔ یہ پاکستان کی پہلی دہائی کا زمانہ تھا اور ابھی بازار اتوار کو ہی بند ہوا کرتے تھے۔ شیر خان قیمتی پتھروں کی زبردست پہچان رکھتا تھا۔ ابھی راولپنڈی میں اس سے زیادہ کام میں مہارت رکھنے والے نہیں پہنچے تھے۔ چنانچہ وہ ترقی کرتا چلا گیا۔ بازار میں اس کی بڑی ساکھ بیٹھ گئی۔ ملازمت کے ساتھ ہی ساتھ اس نے اپنے طور پر زمردوں کی خرید و فروخت کا کام شروع کر دیا۔ سوات میں وہ زمرد کی کانوں کا بھی چکر لگا آیا۔ دیانت داری اور عہد کی پابندی کو اس نے اپنا شعار بنا رکھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھا۔ دو سال کے اندر اندر اس کے پاس روپے پیسے کی ریل پیل شروع ہو گئی۔ کرم دین والے پہاڑی گاؤں کے قریب ہی اس نے چھ کنال کی زمین کا ٹکڑا خرید کر وہاں چار پکے کمرے ڈال لیے اور کرم دین اور اس کی بیوی داراں کو بھی وہیں اپنے ساتھ لے آیا۔ ان کی وجہ سے شیر خان کو عائشہ کی طرف سے بے فکری ہوتی تھی۔ داراں کی بھی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ وہ عائشہ کو اپنی بیٹی کی طرح پال رہی تھی۔ شیر خان نے انہیں روپے پیسے کی طرف سے بھی بے نیاز کر دیا تھا۔ کرم دین کی تھوڑی سی زمین گروی پڑی تھی۔ شیر خان نے وہ بھی چھڑوا کر اس کے حوالے کر دی۔ کرم دین بڑا خوش تھا۔ جوں جوں شیر خان کے کاروبار میں ترقی ہو رہی تھی اس کے گھر میں خوش حالی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ شیر خان نے ملازمت چھوڑ دی اور ساری توجہ اپنے کاروبار کی طرف لگا دی۔ اب وہ ہفتے میں دو تین بار اپنے گاؤں آتا۔ روبی کی قبر پر ہر جمعرات کو دیا جلاتا۔ قبر پر پھولوں کے تازہ ہار ڈالتا اور فاتحہ پڑھ کر اس کی روح کو ثواب پہنچاتا۔ عائشہ بڑی ہو رہی تھی جب وہ چار سال کی ہوئی تو شیر خان نے گاؤں کی ایک عورت کو معقول ماہانہ پر رکھ لیا۔ یہ عورت روزانہ آ کر عائشہ کو قرآن پاک کا پہلا سیپارہ پڑھاتی۔ شیر خان کو اللہ نے اتنی ترقی دی کہ اس نے زمرد کی ایک کان میں شراکت داری کر لی۔ اس کا کاروبار سارے پاکستان میں پھیلتا چلا گیا۔ اس کا چھ کنال والا مکان ابھی تک چار کمروں پر ہی مشتمل تھا۔ اس کے گرد شیر خان نے دو مرد اونچی پتھر کی دیوار بنا دی تھی اور صنوبر کے درخت لگا دیے تھے۔ مکان کے باہر اس نے روبی ہاؤس کے نام کی سلور کی تختی بھی لگا دی تھی۔ وہ ہفتے میں جب بھی اپنے مکان پر آتا تو عائشہ کو گودی میں اٹھا کر سب سے پہلے روبی کی قبر پر جاتا۔ قبر کو اس نے پختہ کروا کر سنگ مرمر کا چبوترہ بنوا دیا تھا۔ سنگ مرمر کی قبر پر روبی کے نام کا کتبہ بھی لگوا دیا تھا۔ وہاں جا کر وہ خود بھی فاتحہ پڑھتا اور عائشہ کے معصوم ہاتھ اٹھوا کر کہتا۔

"بیٹی اپنی ماں کی روح کو ثواب پہنچاؤ۔"

کمرے کو اس نے جدید آسائش کے سارے سامان سے سجا دیا تھا۔ ساتھ والے چھوٹے کمرے میں اس نے عائشہ کے واسطے سب چیزیں لا کر رکھ دی تھیں۔ داراں کا پلنگ بھی اسی کمرے میں تھا اور رات کو عائشہ کے ساتھ سوتی تھی۔ کوہ مری کو جانے والی

سڑک روبی ہاؤس کے قریب ہی سے گزرتی تھی۔ شیر خان نے کافی رقم خرچ کر کے وہاں لگے ہوئے بجلی کے کھمبے سے محکمے کی اجازت کے ساتھ بجلی کے تار اپنے مکان تک کھینچ لیے تھے اور میٹر لگوا لیا تھا جس کے بعد روبی ہاؤس میں بجلی کے بلب بھی روشن ہوتے اور دو ریفریجریٹر بھی چلتے تھے۔ شیر خان کوئی مرد خانساماں یا ملازم رکھنے کے حق میں نہیں تھا۔ اس نے گھر میں داراں اور اس کے خاوند کرم دین کا ہاتھ بٹانے کے لئے ایک عورت کو وہیں رکھوا دیا تھا۔ کرم دین نے جگہ جگہ پھولوں کے پودے اور بیلیں لگا دی تھیں۔ ایک طرف باڑے میں چار بھینسیں بھی آ گئی تھیں جن کی دیکھ بھال بھی کرم دین ہی کے سپرد تھی۔ شیر خان کا کاروبار اتنا بڑھا کہ اس نے زمرد اور دوسرے قیمتی پتھر ملک سے باہر بھی برآمد کرنے شروع کر دیے۔ اپنا ایک دفتر اس نے راولپنڈی صدر میں قائم کر رکھا تھا۔ اب ایک دوسرا دفتر کراچی میں بھی کھول دیا۔ اس زمانے میں ہر ماہ کی آمدنی ہزاروں سے نکل کر لاکھوں تک پہنچ گئی۔ شیر خان نے ایک گاڑی بھی خرید لی تھی۔ اب وہ اسی پر سفر کرتا تھا۔

عائشہ پانچ برس کی ہوئی تو شیر خان نے اسے کوہ مری کے ایک اعلیٰ سکول میں داخل کروا دیا جہاں لڑکیوں کے لئے بورڈنگ ہاؤس کا انتظام بھی تھا اور جہاں انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔ ہفتے کو شیر خان خود گاڑی لے کر عائشہ کو بورڈنگ ہاؤس سے گھر یعنی روبی ہاؤس لے آتا۔ عائشہ نے اس دوران قرآن پاک پورا پڑھ لیا تھا۔ شیر خان نے اپنے اور عائشہ کے کمرے میں روبی کی ایک ایک تصویر فریم میں جڑوا کر لگا رکھی تھی۔ وہ دیر تک عائشہ بیٹی کے ساتھ اس کی ماں کی باتیں کرتا رہتا اور تھوڑا تھوڑا اسے بتاتا رہتا کہ اس کی ماں کتنی دلیر اور خوددار عورت تھی۔ وہ عائشہ کو کیا بتانا چاہتی تھی۔ عائشہ اپنی ماں کے بارے میں ساری باتیں بڑے غور سے سنتی' اسے اپنی ماں سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ ماں کی قبر پر جاتی تو خود بھی فاتحہ پڑھتی۔ وہ دس گیارہ سال کی ہو گئی تھی۔ شیر خان اگرچہ کوئی زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا مگر وہ ایک سچا' بہادر اور غیرت مند شخص تھا۔ اسے اپنے مذہب' اپنے وطن اور اپنے وطن کے لوگوں سے محبت تھی۔ کاروبار میں اس نے ہمیشہ دیانتداری اور شخصی وقار کو اپنے پیش نظر رکھا تھا۔ وہ روبی کی وصیت اور خواہش کے مطابق ان ہی نقوش اور انہی خطوط پر اپنی بیٹی عائشہ

کی پرورش اور تربیت کر رہا تھا۔ وہ اسے کوئی ڈاکو کی لڑکی نہیں بنانا چاہتا تھا۔ ایسی بات نہیں تھی۔ وہ جرائم کی دنیا سے نکل آیا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ اس گناہ آلود دنیا کی کبھی ہوا بھی اس کی بیٹی کو لگے۔

شیر خان کی زندگی کا صرف ایک ہی مقصد باقی رہ گیا تھا وہ یہ کہ اپنی بیٹی کو ایک ایسی بلند کردار عورت بنائے جو اپنے اور دوسروں کے حقوق کی حفاظت کرنا جانتی ہو۔

جو ظلم کے آگے چھوئی موئی بن کر اپنا سر نہ جھکا دے بلکہ ظلم کے سامنے چٹان بن جائے۔ اس کا مقابلہ کرے اور اگر حق و باطل کی جنگ میں اس کی جان بھی چلی جائے تو پروانہ کرے۔

جو اپنی عزت کرنا جانتی ہو۔

جس کی نظروں میں خود اپنا بڑا احترام ہو۔ جو بزدل نہ ہو۔

جو برائی کے ساتھ کسی حالت میں بھی سمجھوتہ نہ کرے بلکہ جب اس کی عزت خطرے میں پڑے تو شیرنی بن کر یا دشمن کو چیر پھاڑ کر رکھ دے اور یا خود ہلاک ہو جائے۔

یہی شیر خان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد تھا اور یہی اس کی مرحومہ محبوبہ بیوی روبی کی آخری وصیت تھی۔ بیٹی عائشہ کو اس نے مارشل آرٹ کی بھی ہلکی پھلکی تربیت دینی شروع کر دی تھی تاکہ وقت پڑنے پر وہ اپنا دفاع کر سکے۔ شیر خان کو دولت کا کوئی لالچ نہیں تھا۔ دولت کمانے کے لئے اس نے ضرورت سے زیادہ کبھی کوشش بھی نہیں کی تھی لیکن دیانت محنت اور سچائی کے اصولوں پر سختی سے عمل کرنے اور کچھ جواہرات اور پتھروں کی پہچان کی وجہ سے اس کے ہاں دولت کی ریل پیل ہو گئی تھی اور دولت چلی آ رہی تھی۔ اب اس کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ اپنی بیٹی عائشہ کو مناسب حد تک تعلیم دلوانے اور بہتر سے بہتر تربیت دینے کے بعد کسی نیک اور شریف لڑکے سے اس کی شادی کر دے اور سب کچھ ان دونوں کے حوالے کر کے خود دنیا کے ہنگاموں سے کنارہ کش ہو جائے۔

جیسے جیسے عائشہ جوان ہوتی گئی شیر خان اپنی کتاب ماضی کے اوراق اس کے سامنے پلٹتا چلا گیا۔ وہ اپنی بیٹی سے اپنی اور اس کی والدہ کے ماضی کی زندگی کا کوئی بھی گوشہ نہیں چھپانا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چاہتا تھا۔ عائشہ کو اپنے باپ سے بھی بڑا پیار تھا وہ اس کا بے حد ادب کرتی تھی۔ مگر اسے اپنی مری ہوئی ماں سے والہانہ محبت ہو گئی تھی۔ باپ نے بیٹی کو اس کی بہادر ماں کے ایک ایک کارنامے اور اس کے کردار کی عظمت سے روشناس کرا دیا تھا۔ عائشہ کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کی ماں اسے ظلم کے مقابلے اور مظلوموں کے حقوق کے تحفظ کے لئے ایک بے خوف شیرنی دیکھنا چاہتی تھی۔

عائشہ نے بھی اپنے باپ کے روبرو' اپنی والدہ کی قبر کے پاس کھڑے ہو کر عہد کیا تھا کہ وہ اپنی ماں کی وصیت کے مطابق' پاکیزگی' حیاداری' عزت نفس' غیرت اور شجاعت کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے اپنے کردار کو بلند سے بلند تر بنائے گی اور اپنے دین اسلام' اپنے وطن پاکستان اور اپنی عزت کے تحفظ کی خاطر اگر اسے جان بھی قربان کر دینی پڑی تو خوشی خوشی موت کو گلے لگا لے گی۔ شیر خان نے کرم دین اور اس کی بیوی داراں کے لئے کچھ زمین اور اس پر بنا ہوا مکان ان کے نام کر دیا ہوا تھا۔ اب اس نے باقی کی اپنی ساری منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد اپنی بیٹی عائشہ کے نام کر کے اپنی وصیت بھی لکھوا کر بینک کے لاکر میں جمع کروا دی تھی لیکن اس کے بارے میں اس نے عائشہ کو نہیں بتایا تھا۔ صرف اس کے خاص اور رازدار وکیل کو اس کا علم تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ عائشہ جوان ہوتی گئی۔ شیر خان اسے گھر میں شیرنی بیٹی کہہ کر ہی بلاتا تھا۔ عائشہ ہو بہو اپنی ماں کی تصویر نکلی۔ وہی قد کاٹھ ویسا ہی گورا چٹا رنگ سنہری بال اور گول معصوم چہرہ لیکن آنکھوں میں خونخوار شیرنیوں والی چمک ..... چال میں شاہ زادیوں والا وقار۔ چہرے پر حیاداری کا جلال۔ آواز میں متانت اور طور طریقوں میں ایک خاص قسم کا سلیقہ اور شائستگی ..... اس نے کوہ مری انگلش میڈیم اسکول اور پھر اسی کالج سے بی اے کر لیا۔ انگریزی زبان پر اسے پورا عبور تھا۔ اب وہ فرانسیسی زبان سیکھ رہی تھی اس کے لئے وہ اپنی گاڑی میں روبی ہاؤس سے دوپہر کے بعد ایک گھنٹے کے لئے کالج جاتی۔ ایک فرنچ ٹیچر اسے فرانسیسی زبان سکھا رہی تھی جسے عائشہ کے باپ شیر خان کی طرف سے ڈبل فیس ادا کی جاتی تھی عائشہ کو فرانسیسی زبان بہت پسند تھی اور وہ فرانس کے لٹریچر کو اوریجنل حالت میں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پڑھنا چاہتی تھی۔ باپ نے روبی کی وصیت کے مطابق عائشہ کی جن خطوط پر تربیت کی تھی اس نے عائشہ کو سوائے اللہ کے خوف کے باقی ہر خوف سے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ اب بھی روزانہ صبح اٹھ کر کلام پاک کی تلاوت کرتی نماز پڑھتی اور پھر اپنی کشادہ اور عالی شان پہاڑی کوٹھی کے عقبی لان میں اپنے باپ شیر خان سے مارشل آرٹ اور کمانڈو کورس کی ٹریننگ حاصل کرتی۔ اس کے بعد خوبانی کے پیڑ تلے جا کر اپنی والدہ کی قبر پر فاتحہ پڑھتی۔ قبر پر باسی پھولوں کی جگہ تازہ پھولوں کے ہار ڈالتی۔ دوپہر کا کھانا وہ اپنے باپ کے ساتھ کھاتی۔ بچی کے جوان ہو جانے کے بعد شیر خان نے اپنی کاروباری مصروفیات بہت کم کر دی تھیں اور وہ صرف ہفتے میں ایک بار راولپنڈی اپنے ہیڈ آفس میں جاتا تھا۔ وہ بھی صبح کو جاتا اور دوپہر تک واپس آجاتا۔ کوٹھی میں چند ایک نوکر تھے۔ دو نوکرانیاں تھیں۔ ایک خانساماں تھا جن کا سارا انتظام اور خبر گیری کرم دین کے ذمے تھی۔ شام کو کبھی کبھی عائشہ کی کالج کی سہیلیاں آجاتیں۔ رات کا کھانا وہ اکٹھے کھاتیں۔ پھر شیر خان کے خاص محافظ ان سب لڑکیوں کو ان کے گھروں تک چھوڑ کر آتے۔ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو وہیں آس پاس ہی تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر ہی اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی تھیں۔ شیر خان کے پاس کچھ لائسنس یافتہ اسلحہ بھی تھا۔ ان میں دو بندوقیں' دو پستول اور ایک شاٹ گن تھی۔ شیر خان نے عائشہ کو نہ صرف یہ اسلحہ چلانا سکھا دیا تھا بلکہ اسے ٹھیک ٹھیک نشانہ لگانے میں بھی ماہر کر دیا تھا۔ اب شیر خان اس تلاش میں تھا کہ کوئی پڑھا لکھا شریف لڑکا اسے مل جائے جس کے ساتھ عائشہ کا بیاہ کر کے وہ اس فرض سے سبکدوش ہو جائے۔

اب ہم تھوڑی دیر کے لئے آپ کو واپس اس مقام پر لے جانا چاہتے ہیں جہاں سے شیر خان اور روبی کی کہانی شروع ہوئی تھی۔ یہ کہانی سری لنکا کے شمال مشرقی گھنے جنگلوں سے شروع ہوئی تھی جہاں وہ اسمگلروں کے ایک بہت بڑے بین الاقوامی گروپ سے وابستہ تھے۔ دونوں لڑکپن سے نکل کر نوجوانی کی رنگین وادیوں میں ابھی داخل ہی ہوئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ برستی گولیوں میں وہ کوکین اور دیگر منشیات کا اسٹاک اسمگل کرتے۔ ان کے گروہ میں فلپائنی' برمی' سنہالی اور جاوا سماٹرا کے اسمگلر بھی تھے۔ شہاب اور فیروز کا تعلق پنجاب کے شہر فیروز پور سے تھا۔ یہ دونوں ایک طرح سے

روبی اور شیر خان کے باس تھے۔ کیونکہ شمالی علاقوں کے جزیروں کی طرف اسمگلنگ کا سارا مال ان ہی کی نگرانی میں اسمگل ہوتا تھا۔ اس وقت بھی دونوں ایک جنگل میں کوئی دو کروڑ روپے کی کوکین کے تھیلے لیے درختوں کے نیچے جھاڑیوں میں چھپے اس ایجنٹ کے اسٹیمر کا انتظار کر رہے تھے جس نے دو کروڑ کی رقم ادا کر کے ان سے کوکین اپنے ساتھ لے جانی تھی۔ روبی نے شیر خان سے کہا تھا۔

"شیر خان! بس ابھی اسی وقت سے ہم اس گھناؤنے کاروبار سے توبہ کرتے ہیں۔"

شیر خان کا ضمیر پہلے ہی اسے کچوکے لگاتا رہتا تھا اس نے فوراً کہا

"ٹھیک ہے۔ چلو کوکین کے اس منحوس اسٹاک کو اسی جگہ ضائع کر کے ہم انڈیا کی طرف نکل جاتے ہیں۔ لنکا اور انڈیا کے درمیان جو سمندر ہے وہاں اسٹیمر آتے جاتے رہتے ہیں۔"

پھر انہوں نے اسی وقت اپنے فیصلے پر عمل کر دیا کوکین کے تھیلوں کو ایک گڑھے میں ڈال کر آگ لگا دی اور جنگل میں شمال کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔ پیچھے ایسا ہوا کہ جب طے شدہ وقت پر اسمگلروں کی لانچ مال لینے آئی تو شہاب اور فیروز بھی موقع پر آگئے۔ لیکن شیر خان اور روبی کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ پھر اچانک وہاں چھاپہ پڑ گیا۔ گولیاں چلنے لگیں اسمگلروں میں بھگدڑ مچ گئی۔ شیر خان اور روبی اس وقت کافی دور نکل چکے تھے۔ بعد میں جب شہاب اور فیروز کو پتا چلا کہ شیر خان اور روبی دونوں فرار ہو گئے ہیں اور متعلقہ اسمگلروں کو کوکین بھی نہیں پہنچائی گئی اور موقع پر کوکین کے تھیلے بھی موجود نہیں ہیں تو لا محالہ وہ اسی نتیجے پر پہنچے کہ شیر خان اور روبی دو کروڑ روپے مالیت کی کوکین ساتھ لے کر فرار ہو گئے ہیں۔ شہاب اور فیروز دونوں نے شیر خان اور روبی کو جنگل میں بہت تلاش کروایا۔ وہ خود ان کے کھوج میں انڈیا کے شہر مدراس تک ہو آئے مگر شیر خان اور روبی ان کی پہنچ سے بہت دور نکل چکے تھے ان دونوں کا ارادہ شیر خان اور روبی کی تلاش میں پنجاب جانے کا تھا کہ یہ دونوں سمگلنگ کے جرم میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پولیس کے ہاتھ بھی آگئے۔

مقدمہ چلا پانی کی طرح روپیہ بہایا گیا لیکن دونوں کو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ عمر قید ہو گئی۔ جس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وقت روبی اور شیر خان پاکستان میں شادی شدہ زندگی بسر کر رہے تھے اور روبی کے ہاں بیٹی عائشہ جنم لے چکی تھی اس وقت شہاب اور فیروز لنکا میں عمر قید کاٹ رہے تھے۔ انہوں نے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ وہ جیل سے رہا ہونے کے بعد شیر خان کو ضرور تلاش کریں گے اور اس سے دو کروڑ روپے کی کوکین کا پورا پورا حساب لیں گے۔

چنانچہ جب شیر خان کی بیٹی عائشہ اٹھارہ برس کی ہوئی تو شہاب اور فیروز کی عمر قید بھی ختم ہو گئی۔ دونوں جیل سے باہر نکلے تو دنیا ہی بدل چکی تھی۔ پرانے ساتھیوں میں سے کچھ مرکھپ گئے تھے اور کچھ جرائم کی دنیا سے کنارہ کش ہو چکے تھے۔ مگر شہاب اور فیروز کا جس گروہ سے تعلق تھا اس کی ایک بین الاقوامی حیثیت بھی تھی۔ اس کا مرکزی مقام اٹلی ک ایک شہر تھا۔ شہاب اور فیروز کی عمریں چالیس پینتالیس کو پہنچ رہی تھیں۔ مگر جیل میں ر کر بھی ان کی صحت بڑی ٹھیک ٹھاک تھی اور جسم مضبوط تھے۔ انہوں نے چھوٹی چھوٹ داڑھیاں رکھ لی تھیں۔ فیروز نے شہاب سے کہا۔

"اور کوئی نہ آتا مگر سیٹھ کے کسی آدمی کو ضرور آنا چاہئے تھا ہمیں لینے۔" شہاب بولا

"ہو سکتا ہے سیٹھ بھی لنکا میں نہ ہو۔ چل کر اس کی کوٹھی میں پتا کرتے ہیں۔ اب جا تو اسی کے پاس ہے۔"

"دیکھ شہاب..... بھولنا نہیں۔ شیر خان اور اس کی روبی سے دو کروڑ روپے کی کوکین پورا پورا حساب لینا ہے۔" فیروز چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر ہوئے کہا۔

"شیر خان کو کیسے چھوڑ سکتے ہیں ہم پھوجے۔ پائی پائی کا حساب لیں گے اس سے پ چل کر سیٹھ سے اپنی روزی روزگار کا معاملہ سیٹ کرا لیں پھر پہلا کام پنجاب میں شیر خا کے گاؤں جا کر اس کا سراغ لگانا ہو گا۔"

وہ لنکا کے شمالی شہر کے فٹ پاتھ پر ناریل کے درختوں کے نیچے چلے جا رہے تھے ا جگہ سے انہوں نے بس پکڑی اور ریلوے اسٹیشن آ گئے۔ یہاں سے ایک ٹرین میں سوار کر کولمبو شہر پہنچ گئے۔ یہاں شہر کے جس بنگلے میں کبھی اسمگلروں کا ہیڈ کوارٹر ہوا کر وہاں پر اب ایک سرکاری بینک کھل گیا تھا۔ شہاب اور فیروز اسمگلروں کے دوسرے ٹھکا

پر گئے یہاں سے بھی لوگ ادھر ادھر چلے گئے تھے۔ معلوم ہوا کہ حکومت کی شدید کارروائی اور منشیات کی اسمگلنگ کے خلاف مسلسل مہم کے نتیجے میں ان کے تقریباً سبھی ساتھی جنوب مشرقی ایشیا اور اٹلی کی طرف چلے گئے ہیں۔ کچھ ہندوستان کی طرف فرار ہو گئے ہیں۔

بلیو اسٹار کلب میں فیروز اور شہاب کی ملاقات اپنے پرانے اسمگلر ساتھی سنگھا سے ہو گئی اس نے بتایا کہ منشیات کا سارا دھندا تقریباً ختم ہو چکا ہے کوکین کی اسمگلنگ کا مرکز اب ہانگ کانگ ہے۔ شہاب اور فیروز سنگھا کی باتیں بڑے غور سے سن رہے تھے۔ چودہ برس میں ساری فضا بدل چکی تھی۔ وہ بکھری ہوئی کڑیوں کو آپس میں ملانے کی کوشش کر رہے تھے۔ فیروز نے سنگھا سے ٹونی کے بارے میں پوچھا۔

"ہمارا ایک ساتھی ٹونی ہوا کرتا تھا وہ کہاں ہے؟" سنگھا نے مشروب کا گلاس ہونٹوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"ارے وہ تو اب کروڑوں میں کھیل رہا ہے۔ ہانگ کانگ میں کوکین کی ساری اسمگلنگ اسی کے ذریعے ہوتی ہے۔ وہ تو کوکین کا بے تاج بادشاہ ہے۔"

ٹونی سے شہاب اور فیروز کی بڑی دوستی ہوا کرتی تھی جب انہیں پتا چلا کہ ٹونی کے پاس بڑی دولت آ گئی ہے اور علاقے کا پورا مافیا اس کے کنٹرول میں ہے تو انہوں نے ہانگ کانگ جا کر ٹونی سے ملنے کا پروگرام بنا لیا۔ شہاب اور فیروز کا اصل نشانہ شیر خان اور روبی تھے۔ ان کی اصل دولت شیر خان اور روبی کے پاس ہی تھی جن سے وہ اپنا حصہ وصول کرنا چاہتے تھے مگر ابتدائی ضروریات کے لئے انہیں کافی روپوں کی ضرورت تھی جو انہیں ٹونی سے ہی مل سکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے کولمبو میں ہی اپنے غیر قانونی اور اثر و رسوخ سے پاسپورٹ بنوائے اور ہانگ کانگ کی طرف پرواز کر گئے۔

ٹونی نے شہر کے ایک ماڈرن کاروباری علاقے میں اپنا امپورٹ ایکسپورٹ کا دفتر کھول رکھا تھا بظاہر وہ کمپیوٹرز اور الیکٹرک ٹائپ رائٹرز کی ایکسپورٹ کا کاروبار کرتا تھا مگر در پردہ اس کا اصل دھندا کوکین اور جواہرات کی اسمگلنگ کا تھا۔ سنگھا نے شہاب اور فیروز کو ٹونی کے دفتر کا پورا پتہ بتا دیا تھا ہانگ کانگ پہنچ کر شہاب اور فیروز کو ٹونی تک پہنچنے میں کوئی خاص

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دشواری پیش نہ آئی۔ ٹونی کی چینی سیکرٹری لڑکی نے شہاب اور فیروز سے ان کا وزیٹنگ کارڈ مانگا تو شہاب نے کہا۔

"اپنے باس سے کہو کہ کولمبو سے شہاب اور فیروز ملنے آئے ہیں۔"

سیکریٹری نے انٹر کام پر ٹونی کو اطلاع کی تو وہ کمرے سے باہر آگیا۔ وہ بہترین سمر سوٹ میں ملبوس تھا اور اس کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہو گئی تھی۔ اس نے شہاب اور فیروز کو فوراً پہچان لیا اور گرمجوشی سے ان کے گلے ملا اور اپنے کمرے میں لے گیا۔ اس شام ہانگ کانگ کے ایک اعلیٰ درجے کے کلب میں ٹونی نے دونوں دوستوں کی دعوت کی۔ دعوت کے بعد ٹونی کہنے لگا۔

"اب تم دونوں میرے ساتھ ہی کام کرو۔ تم جتنی تنخواہ کہو گے میں تمہیں دے دیا کروں گا۔ بے شک اپنا کمیشن بھی مقرر کر لینا۔"

مگر شہاب اور فیروز کی نظریں ان کروڑوں روپے پر تھیں جو ان کے خیال کے مطابق شیر خان اور روبی کولمبو سے فرار ہوتے وقت اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ شہاب نے ٹونی کو شیر خان اور روبی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"ٹونی! ہم ایک بار پنجاب اپنے گاؤں جانا چاہتے ہیں وہاں ہماری کچھ آبائی زمین ساہوکار کے پاس رہن ہے۔ ہم اسے چھڑا کر اپنی دو بہنوں میں تقسیم کر دینا چاہتے ہیں اس کام سے فارغ ہو کر ہم تمہارے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ لیکن اس وقت ہمیں کچھ رقم کی ضرورت ہے۔"

ٹونی نے ہوانا کا قیمتی سگار سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"کتنی رقم چاہئے تمہیں؟" شہاب نے سارا حساب پہلے ہی لگا رکھا تھا کہنے لگا۔

"پچاس ہزار روپے پاکستانی کرنسی کی شکل میں مناسب رہیں گے۔"

بس؟ ٹھیک ہے۔ پاکستانی کرنسی یہاں میرے پاس تو اس وقت نہیں ہے میں تمہیں چیک لکھے دیتا ہوں اسے تم کولمبو کے سٹی بینک میں کیش کروا کر وہیں سے پاکستانی کرنسی میں تبدیل کروا لینا۔ مگر میرے پاس واپس ضرور آجانا۔ مجھے تم دونوں پرانے دوستوں کو اپنے کاروبار میں شامل کر کے بڑی خوشی ہو گی۔"

شہاب اور فیروز نے وعدہ کیا کہ وہ واپسی پر اسی کے پاس آئیں گے۔ دو دن بعد یہ دونوں ہانگ کانگ سے کولمبو روانہ ہو گئے۔ یہاں انہوں نے ٹونی کا چیک کیش کروا کر رقم کو پاکستانی کرنسی میں تبدیل کروایا اور کراچی جانے والے ایک بحری جہاز میں سوار ہو گئے۔

شیر خان کبھی کبھی شہاب کو اپنے پنجاب کے گاؤں کے بارے میں بتایا کرتا تھا اور شہاب کو اس کے گاؤں کا ضلع اور نام بھی یاد تھا۔ چنانچہ دونوں ساتھی شیر خان کے گاؤں پہنچ گئے وہاں شیر خان کے اکثر رشتے دار مرکھپ گئے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر کا آدمی زندہ تھا جس نے بتایا کہ شیر خان اپنی جوان بیوی کو لے کر ایک بار گاؤں آیا تھا مگر کچھ عرصے بعد یہاں سے چلا گیا۔ فیروز نے پوچھا۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ اب وہ کہاں ہے ہم اس کے پرانے دوست ہیں اور ہمارا اس سے ملنا بہت ضروری ہے۔" ادھیڑ عمر کسان نے کچھ سوچ کر بتایا۔

"اس بات کو کافی سال گزر گئے ہیں۔ شیر خان ادھر تو پھر کبھی نہیں آیا۔ ہاں، ایک بار کسی نے بتایا تھا کہ اس کے پاس بڑی دولت آگئی ہے اور اس نے کوہ مری کے پاس اپنا شاندار بنگلہ بنا لیا ہے۔ سنا ہے ہیرے جواہرات کی تجارت کرتا ہے۔"

شہاب اور فیروز کے لئے اتنی معلومات ہی بہت تھیں۔ وہ سیدھا راولپنڈی پہنچے یہاں صرافہ بازار میں انہوں نے ایک جوہری سے شیر خان کے بارے میں بات کی تو جوہری بولا۔

"جناب خان صاحب تو بڑے آدمی ہیں ہم ان کا مقابلہ کہاں کر سکتے ہیں۔"

جوہری کی زبانی شہاب اور فیروز کو پتا چلا کہ شیر خان ارب پتی بن چکا ہے۔ اس کی بیوی روبی کا انتقال ہو گیا ہے اور اس کی ایک بیٹی بھی ہے جس کا نام عائشہ ہے جو کوہ مری میں ہی کسی کالج میں پڑھتی ہے۔ اس کا عالی شان بنگلہ کوہ مری کے نزدیک سڑک سے ذرا ہٹ کر واقع ہے اور اس کا نام روبی ہاؤس ہے۔ شہاب نے جوہری کی دکان سے باہر نکلتے ہوئے دانت پیس کر فیروز سے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"پھوجے! یہ سب اسی کوکین کی رقم کا کرشمہ ہے جو شیر خان لے کر بھاگ گیا تھا۔ ساری جاگ اسی کی لگی ہوئی ہے۔ ہم اسے معاف نہیں کریں گے۔" فیروز کہنے لگا۔

"ہم اس سے اپنا حصہ طلب کریں گے۔"

شہاب نے شیر خان کو گالی دیتے ہوئے کہا۔

"اس کے پاس جتنی دولت ہے اس کا آدھا حصہ ہمارے حوالے کرنا ہو گا۔" فیروز نے شہاب کا بازو دباتے ہوئے کہا۔

"ہمیں جلد بازی یا غصے سے کام نہیں لینا چاہئے شہاب! سیدھی انگلی سے گھی نکالنے کی کوشش کریں گے۔"

"لیکن اگر شیر خان نے انکار کر دیا؟" شہاب نے ایک بار پھر شیر خان کو گالی دیتے ہوئے کہا۔ فیروز بولا۔

"تو پھر سوچ لیں گے۔ غور کر لیں گے مگر بھائی میرے ابھی خاموش رہو۔ شانت رہو۔ چل کر اس سے بات تو کریں۔"

دونوں سب سے پہلے شیر خان کے راولپنڈی والے آفس میں گئے پتا چلا کہ شیر خان ہفتے میں صرف دو ایک دن ہی دفتر آتا ہے باقی وقت وہ اپنے بنگلے پر ہی گزارتا ہے۔ انہوں نے ٹیکسی پکڑی اور کوہ مری کی طرف چل پڑے۔ اس وقت دن کے دس بج چکے تھے۔ پہاڑ کا سیزن ختم ہو چکا تھا۔ اترائی شروع ہو گئی تھی۔ ٹیکسی میدانی علاقے سے نکل کر پہاڑی علاقے میں داخل ہوئی تو موسم خنک ہو گیا۔ ٹیکسی والا شیر خان سیٹھ کے روبی ہاؤس کو جانتا تھا کوہ مری سے کچھ پہلے ٹیکسی سڑک کے کنارے چیڑھ کے درختوں میں رک گئی۔ ڈرائیور نے دائیں جانب درختوں میں سے نظر آتے ایک گیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ روبی ہاؤس ہے جناب۔"

شہاب اور فیروز ٹیکسی سے اتر آئے۔ انہوں نے ڈرائیور کو ایک طرف انتظار کرنے کے لئے کہا اور خود اس راستے پر چل پڑے جو شیر خان کے بنگلے روبی ہاؤس کی طرف جاتا تھا۔ اس کی دونوں جانب چیڑھ کے اونچے اونچے درخت تھے۔ گیٹ لوہے کا تھا جس کی ایک جانب سلور کی تختی پر روبی ہاؤس لکھا تھا۔ گیٹ کے ساتھ ہی ایک ادھیڑ عمر کا چوکیدار آگ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جلائے اسٹول پر بیٹھا ہاتھ تاپ رہا تھا شہاب اور فیروز کو اپنی طرف آتا دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے سلام کر کے پوچھا کہ صاحب آپ کو کس سے ملنا ہے؟ شہاب نے کہا۔

"بھائی ہمیں سیٹھ شیر خان سے ملنا ہے۔ انہیں جا کر کہو کہ ان کے دو بڑے پرانے دوست کولمبو شہر سے انہیں ملنے آئے ہیں۔"

چوکیدار نے وہیں دیوار میں لگے ٹیلی فون پر اندر بوڑھے خانساماں کو اطلاع کر دی۔ ایک منٹ بعد شیر خان نے چوکیدار کو کہا کہ انہیں فوراً اندر بھیج دو۔ شہاب اور فیروز بنگلے کی شان و شوکت دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ تین گاڑیاں ایک طرف کھڑی تھیں۔ شیر خان خود ان سے ملنے کے لئے برآمدے میں موجود تھا۔ اس نے شہاب اور فیروز کی طرف غور سے دیکھا پھر لپک کر ان سے بغل گیر ہو گیا۔

"شہاب فیروز ..... آپ لوگ کیسے آ گئے؟ اتنی مدت گزر گئی۔ آؤ آؤ اندر آ جاؤ۔" شہاب نے کہا۔

"شیر خان! تم بھی کافی بدل گئے ہو۔" ڈرائنگ روم کی سجاوٹ اور قیمتی سازو سامان نے بھی شہاب اور فیروز کو بڑا متاثر کیا۔ کارنس کے اوپر روبی کی آئل کلر تصویر لگی تھی فیروز کہنے لگا۔

"روبی بہن کی وفات کی خبر ہمیں پنڈی تمہارے دفتر ہی سے مل گئی تھی۔ بڑا افسوس ہوا۔"

"ہاں شیر خان۔" شہاب نے جھوٹی تعزیت کرتے ہوئے کہا۔ "روبی بھابی کی موت کا بڑا صدمہ ہوا۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔ یہاں آ کر تم دونوں نے شادی کر لی تھی؟"

"ہاں شہاب بھائی۔" شیر خان نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔ "ہم نے پاکستان آنے کے فوراً بعد شادی کر لی تھی۔ اللہ نے ایک بیٹی بھی دی مگر روبی مجھے اکیلا چھوڑ کر چل بسی۔"

"صبر کرو میرے بھائی۔" فیروز نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ "موت کا تو ایک دن مقرر ہوتا ہے۔" شہاب نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

"تمہاری بیٹی کہاں ہے شیر خان؟ اس سے ملواؤ وہ تو ہماری بھی بیٹی ہے۔" شیر خان بولا۔

"کالج گئی ہوئی ہے آئے گی تو ضرور ملواؤں گا۔ بالکل اپنی ماں پر گئی ہے۔ عائشہ نام

رکھا ہے اس کا۔ اب تو اس نے ایم اے بھی کر لیا ہے۔"

"ماشاء اللہ! ماشاء اللہ!"

شہاب اور فیروز بے اختیار پکار اٹھے۔ نوکر چائے لے آیا۔ بڑی پر تکلف چائے تھی۔ ساتھ کھانے کے لئے دنیا کی ہر نعمت موجود تھی۔ کمرے کے آتشدان میں ہلکی ہلکی آگ جل رہی تھی جس نے کمرے کی فضا کی سردی کو ختم کر دیا تھا۔ تینوں اپنے پرانے دنوں کی باتیں کرنے لگے۔ شہاب کہنے لگا۔

"تم تو روبی کو لے کر وہاں سے چلے آئے۔ پیچھے چھاپہ پڑا گرفتاریاں ہوئیں ہم بھی پکڑے گئے ہم دونوں پر قتل کے الزام لگے مقدمہ چلا پھانسی سے تو بچ گئے مگر عمر قید ہو گئی۔"

"اوہو۔ بڑا افسوس ہے مجھے۔" شیر خان افسوس کرنے لگا۔ شہاب نے ہاتھ کو ذرا سا جھٹک کر کہا۔

"چھوڑو یار۔ یہ تو ایک نہ ایک دن ہونا ہی تھا۔ ہمیں عمر قید ہو گئی تو کیا ہوا ہمیں تو اس بات کی خوشی ہے کہ ہمارا یار شیر خان کروڑ پتی بن گیا ہے۔" شیر خان نے اپنے کان کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا۔

"یہ سب میرے مولا کا کرم ہے ورنہ میں کس قابل ہوں۔ فیروز بھائی یہ کیک بھی لو۔" شہاب نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے خوشگوار طنز کے ساتھ کہا۔

"مولا کا کرم بھی تم پر ہی ہوا ہے شیر خان ہم نے تو جیل میں چودہ برس چکی ہی پیسی ہے۔ شیر خان نے کہا۔

"اس کا مجھے افسوس ہے میں اگر وہاں سے چلا نہ آتا تو مجھے بھی جیل ہو جاتی۔" فیروز نے فوراً کہا۔

"بڑی عقل مندی کی تم نے کہ سارا روپیہ بھی ساتھ ہی لے آئے۔" شیر خان ذرا سا چونکا۔

"کونسا روپیہ لالے؟" شہاب نے کیک کا ٹکڑا منہ میں ڈالنے کے بعد کہا۔

"وہی یار جو تم نے کوکین کے تھیلے دے کر وصول کیا تھا اور کون سا روپیہ۔ بھئی ہم

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تمہاری ہمت کی داد دیتے ہیں کہ تم سارا روپیہ پاکستان لانے میں کامیاب ہو گئے۔" شیر خان ابھی تک شہاب کا منہ تک رہا تھا کہ فیروز بولا۔

"وہاں سے تو تمہیں ڈالر ملے تھے۔ انڈیا میں کرنسی بدلوائی ہو گی تم نے۔" شیر خان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اس نے اپنے سر کو نفی میں ہلاتے ہوئے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے کسی سے کوئی رقم وصول نہیں کی تھی۔ اسٹیمر کے آنے سے پہلے ہی میں نے اور روبی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب ہم منشیات کا یہ گھناؤنا کام نہیں کریں گے ہم نے کوکین کے تھیلوں کو وہیں آگ لگا دی تھی جب اسٹیمر آیا تو ساتھ ہی چھاپہ بھی پڑ گیا۔ بس ہم خالی ہاتھ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کیا بتاؤں کس طرح مصیبتیں اٹھاتے ہم پاکستان پہنچے۔ یہاں رشتے داروں نے میرے حصے کی زمین بھی ہضم کر لی۔ جواہرات کی پہچان تھی پنڈی کے صرافے میں ایک جوہری کے پاس نوکر ہو گیا۔ دیانت داری اور محنت سے کام شروع کیا تھا اللہ نے بڑی برکت ڈالی۔" شہاب اور فیروز کو شیر خان کی کسی ایک بات کا بھی یقین نہیں آیا تھا۔ شہاب نے ہنس کر کہا۔

"شیر خان یارا ہمارے سامنے کوئی ایکٹنگ نہ کرو ہم سے تمہاری کونسی بات چھپی ہوئی ہے۔ ایمانداری سے کام کر کے بھلا کوئی کروڑوں روپے کا مالک بنا ہے کبھی؟"

شیر خان فوراً بولا۔

"میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ پنڈی شہر کے صرافہ بازار میں جا کر کسی سے پوچھ لو کہ شیر خان نے یہ دولت کیسے کمائی ہے وہ سب لوگ میری دن رات کی محنت اور دیانت داری کے گواہ ہیں۔" شہاب نے شیر خان کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"انہیں کیا معلوم کہ اصلی بات کیا ہے۔" فیروز بولا۔

"یہ جو تم نے کوکین کو آگ لگا کر بھاگ جانے والا ڈراما سنایا ہے اس پر تو کوئی بے وقوف ہی اعتبار کرے گا۔"

شیر خان کو ابھی تک اس بات کا احساس نہیں ہوا تھا کہ ان دونوں کی نیت کیا ہے اور وہ کیا ارادہ لے کر اس کے پاس آئے ہیں وہ اس طرح نفی میں سر ہلا کر کہنے لگا۔

"مگر میں سچ کہہ رہا ہوں فیروز بھائی میں نے اور روبی نے اپنے ہاتھوں کوکین کے

تھیلوں کو آگ لگائی تھی۔ ہماری آنکھوں کے سامنے ساری کوکین جل کر راکھ ہو گئی تھی ہم جب لنکا سے ہندوستان کے سامنے والے شمالی ساحل پر پہنچے تھے تو ہمارے پاس اسٹیمر کا کرایہ تک نہیں تھا۔"

اب شہاب کو غصہ آ گیا۔ اس نے شیر خان کا ہاتھ پکڑ کر ذرا دبا کر چھوڑ دیا اور تحکمانہ انداز میں بولا۔

"شیر خان! تم ہمیں الو نہیں بنا سکتے کوکین کم از کم پونے دو کروڑ ڈالر کی تھی اور تم ساری کی ساری رقم لے کر وہاں سے فرار ہوئے تھے۔ یہ ہم جانتے ہیں۔"

شیر خان کا خون بھی گرم ہو گیا۔ وہ کوئی روایتی قسم کا شریف آدمی نہیں تھا۔ وہ بھی شہاب اور فیروز کی طرح اپنی جرائم پیشہ زندگی میں کئی آدمیوں کا خون کر چکا تھا۔ پھر بھی وہ لوگ اس کے مہمان تھے۔ شیر خان نے اپنے ابلتے ہوئے جذبات کو بڑی مشکل سے دباتے ہوئے پوچھا۔

"تم لوگ کس نیت سے آئے ہو؟"

شہاب نے کرخت لہجے میں کہا۔"ہم تم سے صرف پونے دو کروڑ ڈالر میں سے اپنا حصہ طلب کرنے آئے ہیں۔ آدھی رقم ہمارے حوالے کر دو جو ہمارا حق ہے اور ہم واپس چلے جائیں گے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم چودہ برس جیل میں مشقت کاٹتے رہے ہوں اور تم یہاں ہماری رقم سے عیش و عشرت کی زندگی بسر کرو۔"

شیر خان کا سر پھر گیا تھا۔ مگر اس نے کمال تحمل سے کام لیا۔ جیسے وہ کھولتے ہوئے آتش فشاں کو اپنے سینے میں دبائے ہوئے تھا۔ پھر بھی وہ جوش میں آ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ شہاب اور فیروز بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ شیر خان نے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اس وقت تم دونوں میرے مہمان ہو میں تمہیں یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہاں سے چلے جاؤ۔" تب فیروز نے آگے بڑھ کر شیر خان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بڑے متحمل اور نرم لہجے میں بولا۔

"شیر خان! ہم تمہارے گھر میں محبت کے ساتھ آئے ہیں اسی محبت کے ساتھ واپس جائیں گے دولت آنی جانی ہوتی ہے۔ ہماری دوستی قائم رہنی چاہئے۔" شہاب کچھ کہنے ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

والا تھا کہ فیروز نے گردن پھیر کر اس کی طرف دیکھا آہستہ سے آنکھ کا اشارہ کیا اور بولا۔

"شہاب! تم چاہے اعتبار کرو یا نہ کرو لیکن میرے بھائی اب میرا دل کہہ رہا ہے کہ شیر خان سچا ہے۔ یہ جھوٹ نہیں بول رہا۔ اس نے جو کچھ کمایا ہے اپنی محنت اور ایمانداری سے کمایا ہے۔" شہاب کے ہونٹ کچھ کہنے کو ہلے ہی تھے کہ فیروز نے جیسے اسے ڈانٹ کر کہا: "بس اب آگے کچھ نہ کہنا۔ ہم نے عمر قید کاٹی یہ ہماری قسمت تھی۔ شیر خان کو اللہ نے دولت دی یہ اس کی قسمت تھی۔ بس اب اسے گلے لگا لو ہماری دوستی میں فرق نہیں آنا چاہئے۔"

فیروز پہلے ہی شہاب کو آنکھ مار چکا تھا یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی دوسرا منصوبہ تیار ہو چکا ہے۔ شیر خان اپنے دل میں اس خیال سے مطمئن ہو گیا تھا کہ اس کی پرسکون وضع دار زندگی میں ایک طوفان آتے آتے ٹل گیا ہے۔ چنانچہ شہاب اور فیروز نے جب اسے گلے لگایا تو شیر خان نے بھی بڑی گرم جوشی سے اس کا جواب دیا۔ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھتے ہوئے شہاب اور فیروز ایسی اداکاری کرنے لگے جیسے وہ اس بات پر بڑے نادم ہیں کہ انہوں نے شیر خان سے اپنا حصہ کیوں مانگا۔ شیر خان اپنی جگہ پر صحیح ندامت محسوس کر رہا تھا کہنے لگا۔

"مجھے بڑا افسوس ہے کہ میرے منہ سے ایسا جملہ نکل گیا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔"

فیروز نے چہرے پر بڑی مخلصانہ سی مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں شیرے یار۔ بات ہم نے بھی غلط کر دی تھی۔ لیکن ہمیں بھی تو اصلیت کا علم نہیں تھا۔ اب تم نے ساری بات کھول کر بتائی تو معاملہ صاف ہو گیا۔ مٹی ڈالو یار سب باتوں پر جو ہو گیا سو ہو گیا۔ چائے اور منگواؤ۔"

شیر خان نے صوفے کے ساتھ لگا ہوا بٹن دبا کر نوکر کو بلایا شہاب نے بھی اب اپنے آپ کو سنبھال لیا تھا اور وہ فیروز کی منصوبہ بندی کے مطابق عمل کر رہا تھا۔ اگرچہ اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ فیروز کے ذہن میں اچانک کیا اسکیم آ گئی ہے۔ شیر خان بولا۔

"اب آپ لوگ میرے ہاں ہی رہیں گے۔ اوپر والا مہمان خانہ ابھی کھلوا دیتا ہوں۔"

فیروز کے ذہن میں جو اسکیم تھی اس کا تقاضا تھا کہ وہ شیر خان سے رخصت لے کر چلے

جائیں چنانچہ وہ بولا۔

"نہیں یار شیر خان! ہم نے پنڈی میں ایک آدمی کو ٹائم دے رکھا ہے۔ وہاں سے ہمیں کل کراچی بھی جانا ہے۔ کراچی میں دو چار دن لگ جائیں گے۔ وہاں سے کولمبو واپس جانے سے پہلے تمہارے پاس آ کر ایک دو روز ضرور قیام کریں گے۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں اب۔" شیر خان مسکراتے ہوئے بولا۔ اتنے میں باہر گاڑی کے ہارن کی آواز بلند ہوئی۔ شیر خان نے کھڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری بیٹی عائشہ کالج سے آ گئی ہے۔"

فیروز نے ایک سیکنڈ کے لئے آنکھیں گھما کر شہاب کو دیکھا۔ پھر جلدی سے نگاہیں شیر خان کی طرف کر لیں اور بڑا خوش ہو کر بولا۔

"اچھا ہوا بیٹی سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔" باوردی نوکر اندر آ گیا تھا شیر خان نے اسے کہا۔

کھانا ہم سب اکٹھے کھائیں گے اور عائشہ بیٹی کو یہیں بھیج دو۔" نوکر ادب سے سر کو ذرا سا جھکا کر باہر نکل گیا۔ شیر خان کہنے لگا۔

"تم بیٹی کو دیکھو گے تو کہو گے یہ تو روبی ہے۔ بالکل اپنی ماں کی شکل ہے۔"

عائشہ جب نشست گاہ میں داخل ہوئی تو ایک بار شہاب اور فیروز بھی ٹھٹک سے گئے۔ انہیں یکبارگی یوں لگا جیسے ان کے سامنے سری لنکا کے جنگلوں والی نوجوان لڑکی روبی کھڑی ہے۔ اگر کوئی فرق تھا تو صرف اتنا کہ عائشہ کے چہرے پر وہ چنچلتا اور جذبات کی بے باکی نہیں تھی جو روبی کے چہرے پر بڑی نمایاں ہوا کرتی تھی۔ یہ لڑکی جو شیر خان اور روبی کی بیٹی تھی اس کے چہرے پر نوجوانی میں ہی ایک متین پختگی اور پختہ عزم کے آثار بڑے واضح تھے۔ آنکھوں میں مقناطیسی چمک اور نگاہ میں ایسا تسلسل تھا جیسے ایک کرن کسی جگہ مسلسل پڑ رہی ہو اور اس جگہ کو کرن نے اپنے اثر میں اپنے سحر میں لے رکھا ہو۔ روبی کی بیٹی کو پہلی بار دیکھنے پر شہاب اور فیروز دونوں کے ذہنوں پر ایک ہی قسم کا رد عمل ہوا تھا۔

"آؤ میری بیٹی! اپنے انکل سے ملو۔ یہ دونوں تمہارے انکل ہیں۔"

عائشہ نے گرم شلوار قمیص کے اوپر گہرے براؤن رنگ کی اونی جیکٹ پہن رکھی تھی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور گردن کے گرد شیر کی کھال کی طرح کا گرم مفلر لپٹا ہوا تھا۔ اس مفلر کی وجہ سے عائشہ کا چہرہ بالکل شیرنی کی طرح لگ رہا تھا عائشہ نے شہاب اور فیروز کو ادب سے سلام کیا۔ دونوں نے آگے بڑھ کر عائشہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر جیب سے کچھ روپے نکال کر دینے لگے تو عائشہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔

"شکریہ انکل میں ان رسموں کی قائل نہیں ہوں یہ روپے میری طرف سے کسی ضرورت مند کو دے دیجئے گا۔"

شہاب اور فیروز نے آگے سے کچھ نہ کہا اور روپے جیب میں واپس رکھ لیے شیر خان بڑے فخر سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔

"میں اپنی بچی کو ایک مثالی پاکستانی لڑکی دیکھنا چاہتا ہوں۔ وہ سوائے اپنے حق کے کسی سے کچھ نہیں لے گی۔"

شہاب چپ رہا فیروز نے شیر خان کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔

"واقعی شیر خان! تمہاری بچی نے مجھے بڑا متاثر کیا ہے۔ یہ اپنی ماں کی طرح بہادر اور دلیر نکلے گی۔" عائشہ نے اپنے والد سے پوچھا۔ "ابا جان! میرے لائق خدمت ہو تو بتایئے۔" شیر خان نے اپنی بچی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹی! اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جا کر آرام کرو۔"

عائشہ اسی طرح بڑے ادب سے سلام کر کے چلی گئی۔ وہاں کافی کا دور چلنے لگا اتنی دیر میں ساتھ والے کمرے میں سے کسی لڑکی کے قرات کے ساتھ قرآن شریف پڑھنے کی آواز سنائی دی۔ شہاب اور فیروز نے کس قدر تعجب سے شیر خان کی طرف دیکھا شیر خان نے آہستہ سے کہا۔ "عائشہ کالج سے واپس آ کر روزانہ قرآن پاک پڑھتی ہے۔ اگلے رمضان تک انشاء اللہ وہ قرآن پاک حفظ کر لے گی۔" اس کا شہاب اور فیروز پر کوئی اثر نہ ہوا۔ ان کی ساری زندگی دین مذہب سے دور ایک اجنبی اور بت پرست ملک میں گزری تھی۔ اپنے مذہب کے ساتھ ان کا واسطہ صرف اتنا ہی تھا کہ کبھی کبھی وہ کوئی نیا کام شروع کرنے سے پہلے خدا کو یاد کر لیا کرتے تھے۔

دوپہر کا کھانا شہاب اور فیروز دونوں نے شیر خان کے ساتھ کھایا اس دوران دونوں میں

سے کسی نے کوئی ایسی بات نہ کی کہ جس سے وہاں بدمزگی پیدا ہوتی۔ بلکہ جب دونوں وہاں سے رخصت ہونے لگے تو فیروز نے ایک بار پھر شیر خان سے معذرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"شیرے! بھائی ہم نے جس بات کا ذکر شروع میں کیا تھا اسے بھول جانا۔ کیونکہ ہم بھی اسے بھول گئے ہیں۔ ہم کچھ روز بعد واپس سری لنکا چلے جائیں گے کیونکہ اب ہمارا مرنا جینا وہیں پر ہے۔ تمہارا خلوص اور تمہاری محبت ہمیں یاد رہے گی۔"

شیر خان کہنے لگا۔ "مگر تم لوگوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ کراچی سے واپس آ کر دو ایک دن میرے ہاں ٹھہرو گے۔"

شہاب بولا۔ "شیر خان بھائی! کچھ کہہ نہیں سکتے واپس جا کر بھی بڑے کام کرنے ہیں جو کچھ ہماری قید کے دوران بکھر چکا ہے اسے پھر سے جمع کرنا ہے۔" شیر خان نے کہا۔

"اگر تمہیں کچھ پیسوں کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ بے شک بطور قرض لے لو۔ جب ہوں گے واپس کر دینا۔"

شہاب نے دل میں نفرت سے کہا۔ "ہمارے پیسوں پر عیش کر رہا ہے اور ہمیں بھکاری سمجھ کر قرض بھی دے رہا ہے۔" اس نے دل میں شیر خان کو بڑی موٹی سی گالی دے ڈالی۔ فیروز نے شکریہ ادا کیا اور کہا۔

"نہیں شیرے یار! خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس سنگاپور ہانگ کانگ کے دو چار پھیرے لگانے پڑیں گے۔ ویسے ہم کوشش کریں گے کہ کراچی میں فارغ ہونے کے بعد تمہارے لئے دو ایک دن نکالیں۔ مگر وعدہ نہیں کرتے۔ کولمبو پہنچ کر تمہیں خط ضرور لکھیں گے۔"

شیر خان کے اصرار پر ٹیکسی کو انہوں نے فارغ کر دیا تھا۔ شیر خان نے بہت کہا کہ رات اس کے ہاں گزار کر صبح پنڈی چلے جائیں مگر وہ نہ مانے شیر خان نے اپنی خاص گاڑی اور ڈرائیور ان کے ساتھ کر دیا۔ دونوں ایک بار پھر شیر خان سے بغل گیر ہو کر ملے اور گاڑی انہیں لے کر راولپنڈی کی طرف چل دی۔

شہاب کے دماغ میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ فیروز سے یہ معلوم کرنے کو بے تاب تھا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کہ اس نے کیا سوچ کر شیر خان کے ساتھ اپنے حصے کی کروڑوں روپے کی رقم لینے کی بات ختم کر دی تھی۔ مگر شیر خان کے ڈرائیور کی موجودگی میں وہ اس سے کچھ نہ پوچھ سکتا تھا دن راستے میں ہی ڈھلنے لگا تھا۔ جب شہاب کا پیمانہ صبر بالکل ہی لبریز ہو گیا تو اس نے گاڑی ایک جگہ رکوائی اور فیروز کو ساتھ لے کر درختوں کے پیچھے آ گیا یہاں آتے ہی اس نے فیروز کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"آخر کیا سمجھ کر تم نے شیر خان کو کہہ دیا تھا کہ شیرے اب ہم تم سے اپنے حصے کی رقم طلب نہیں کریں گے؟ وہ تمہارا ماما لگتا ہے؟ میں ساری رقم اب تم سے وصول کروں گا۔" فیروز نے شہاب کا ہاتھ جھٹک دیا۔ اپنے بازو کو سہلایا اور شہاب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"تم مجھے بدھو سمجھتے ہو؟ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں شیر خان کو اپنے حصے کی دولت سے عیش و عشرت سے رہتے دیکھ کر خاموش بیٹھا رہوں گا؟ کیا میں اپنی جوانی کے وہ چودہ سال بھلا سکتا ہوں جو میں نے جیل میں سلاخوں کے پیچھے بالس کاٹتے' پتھر توڑتے گزارے ہیں؟ نہیں شہاب میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا یہ شخص ہماری دولت سے عیش کر رہا ہے ہم نے اس کے کیے ہوئے جرم میں سزا کاٹی ہے اور یہ ہماری کمائی ہوئی دولت سے گلچھرے اڑا رہا ہے۔" شہاب نے منہ پھاڑ کر کہا۔

"تو پھر سوچا کیا ہے تم نے؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔" فیروز نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر کے نفی میں سر ہلایا۔

"ابھی نہیں شہابو۔ ابھی نہیں۔ ابھی میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتا۔ پنڈی پہنچ لینے دو۔"

یہ کہہ کر فیروز گاڑی کی طرف چلا جس کا باوردی ڈرائیور بونٹ سے ٹیک لگائے کھڑا سگریٹ پی رہا تھا۔ شیر خان کی سیاہ رنگ کی ائر کنڈیشنڈ نئے ماڈل کی بیوک شہاب اور فیروز کو لے کر پنڈی کی طرف ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ ابھی سورج پوری طرح سے غروب نہیں ہوا تھا کہ وہ پنڈی صدر میں اپنے ہوٹل پہنچ گئے۔ ہوٹل میں آ کر فیروز نے شہاب کو اس خطرناک منصوبے سے آگاہ کر دیا جو اس کے جرائم پیشہ ذہن نے تیار کر رکھا تھا۔ شہاب کی

آنکھوں میں ایک نئی چمک آ گئی اس طرف اس کا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ کہنے لگا۔

"فیروز! تم نے بڑے کمال کی اسکیم سوچی ہے۔ اگر ہماری اسکیم کامیاب ہو گئی تو اپنا حصہ کیا ہم تو شیر خان سے اس کی اپنے حصے کی دولت بھی اپنے قبضے میں کرنے کی پوزیشن میں ہوں گے۔"

"یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔" فیروز خان اپنی بات پر زور دیتے ہوئے بولا۔" جب شیر خان نے ہمارے حصے کی رقم دینے سے انکار کر دیا تھا تو میں اسی وقت اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ یہ شیر خان کا اپنا ملک ہے۔ یہاں اس کے اپنے لوگ ہیں اس کے پاس پیسہ ہے وہ اگر نہ چاہے تو ہم اس سے ایک کوڑی بھی وصول نہیں کر سکتے اس لئے ہمیں کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا کہ جس پر عمل کرنے سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ پہلے میں نے ایک اور ترکیب سوچی تھی لیکن جب میں نے شیر خان کی بیٹی کو دیکھا تو پہلی اسکیم ترک کر دی اور نئی اسکیم سوچ لی۔ یہ ایسا تیر ہے جو ٹھیک نشانے پر بیٹھے گا۔" شہاب کا چہرہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ کہنے لگا۔

"مگر یہ کام کون کرے گا؟ ہمیں تو اس سارے ڈرامے سے باہر رہنا پڑے گا۔" فیروز نے کہا۔

"یار شہابو تم فکر کیوں کرتے ہو۔ اس وقت پیسہ ہمارے پاس بھی ہے ہمیں دو ایسے آدمی مل جائیں گے جو پندرہ بیس ہزار روپے میں یہ کام بڑے خوش ہو کر دیں گے۔ پندرہ بیس ہزار کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں ہے اور پھر انہیں کسی کا خون تو کرنا نہیں۔"

"مگر ہم یہاں اجنبی ہیں۔ ہمیں ایسے آدمی یہاں کہاں سے ملیں گے؟" شہاب کے اس سوال پر فیروز نے سگریٹ کی راکھ جھٹک کر کہا۔

"یہ کام تم مجھ پر چھوڑ دو۔ یہ ہمیں معلوم ہو ہی چکا ہے کہ شیر خان کی بیٹی دن کے بارہ بجے کے قریب کالج سے واپس آتی ہے۔ بس یہی کافی ہے اب تم ہوٹل میں آرام کرو۔ میں ذرا حالات کا جائزہ لے کر آتا ہوں۔"

ایک جرائم پیشہ آدمی کے لئے کسی شہر میں دوسرے جرائم پیشہ لوگوں کا سراغ لگانا کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہوتا۔ یہ لوگ ایک دوسرے کی بو سونگھ لیتے ہیں۔ دوسرے ان لوگوں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کو ایک دوسرے کے ٹھکانوں کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کہاں کہاں ہو سکتے ہیں۔ فیروز صرف جرائم پیشہ ہی نہیں تھا بلکہ وہ ایک عیار اور تیز ذہن کا مالک بھی تھا اس نے بہت جلد جرائم پیشہ لوگوں کا ایک اڈہ تلاش کر لیا۔ یہ اڈہ شہر سے دور ایک جھلار کے پاس ٹیبے کے پہلو میں واقع تھا۔ یہاں چرس اور ناجائز طریقے سے کشید کی گئی دیسی شراب چوری چھپے فروخت ہوتی تھی۔ فیروز کی مجرم شناس نگاہوں نے دو آدمیوں کو اپنے منصوبے کے واسطے چن لیا۔ یہ دو بدمعاش ٹائپ آدمی تھے جن میں سے ایک چار سال جیل کاٹ چکا تھا اور دوسرے پر قتل کے دو مقدمے چل رہے تھے۔ فیروز ان دونوں کو ٹبے کے پیچھے لے گیا اور بغیر کسی تمہید کے بولا۔

"ایک عورت کو اغوا کرنا ہے۔ اگر تم لوگ یہ کام کر دو تو دونوں کو میں بیس ہزار روپے دوں گا۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

یہ وہ جرائم پیشہ لوگ تھے جو پانچ ہزار پر کسی کو قتل بھی کر سکتے تھے یہاں تو صرف ایک عورت کو اغوا کرنا تھا۔ جو آگے سے جوابی کارروائی بھی نہیں کر سکتی۔ عورت تو ویسے ہی بڑی نازک اور کمزور ہوتی ہے۔ اس کے عوض انہیں دس دس ہزار روپے کی رقم مل رہی تھی۔ فیروز نے اپنے کوٹ کی جیب میں سے چار ہزار روپے کے نوٹ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیے ساتھ ہی دوسری جیب سے پستول بھی نکال کر نوٹوں کے اوپر رکھ دیا اور بولا۔

"یہ چار ہزار کی رقم تم دونوں کو میں ایڈوانس دوں گا یہ پستول اس لئے ہے کہ اگر تم نے ایڈوانس لے کر فرار ہونے کی کوشش کی تو اس کی گولی تمہارا پیچھا کرے گی اور تم جہاں کہیں بھی ہو گے تمہیں موت کی نیند سلا دے گی۔ بولو کیا کہتے ہو؟ اس کام کے لئے تیار ہو یا میں کوئی دوسرا آدمی تلاش کروں؟"

دونوں جرائم پیشہ آدمی سمجھ گئے تھے کہ ان کا واسطہ کسی شریف آدمی سے نہیں بلکہ ایک چھٹے ہوئے بدمعاش سے پڑ رہا ہے۔ رقم بیس ہزار کی تھی کام معمولی تھا ان میں سے ایک بدمعاش نے جس کا نام سانولا تھا فیروز سے پوچھا۔

"عورت کو کہاں سے اغوا کر کے کہاں پہنچانا ہو گا؟" فیروز نے پستول اٹھا کر کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ چار ہزار روپے ان دونوں میں ایڈوانس کے طور پر تقسیم کر دیے اور پھر

سب سمجھا دیا کہ انہیں کیا کرنا ہو گا۔ جانے سے پہلے فیروز نے انہیں ہدایت کی کہ وہ کل صبح نو بجے اسی ٹبے کے پاس تیاری کر کے آجائیں۔" سانولا کے ساتھی نے کہا۔

"کیا اس لڑکی کے ساتھ کوئی باڈی گارڈ بھی ہوتا ہے؟" فیروز بولا۔

"نہیں۔ وہ کالج سے اپنی گاڑی میں اکیلی گھر آتی ہے۔ تمہیں راستے میں ایک خاص جگہ گھات لگا کر اس کا انتظار کرنا ہو گا اور پھر اسے جس طرح بھی تم کر سکو بے ہوش کر کے اغوا کرنا اور اپنی گاڑی میں ڈال کر ہماری بتائی ہوئی جگہ پر پہنچانا ہو گا۔ وہیں تمہیں باقی کے سولہ ہزار روپے کی رقم ادا کر دی جائے گی۔ ایک بار پھر غور کر لو سوچ سمجھ لو۔" سانولا سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"بادشاہو! ہاں کر دی ہے تو پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ آپ گاڑی لے کر کل یہاں آجائیں۔ ہم تیار ہوں گے۔ ہمیں گاڑی چلانی آتی ہے۔" فیروز نے واپس اپنے ہوٹل پہنچ کر یہ خوشخبری شہاب کو سنائی تو وہ مشکوک انداز میں بولا۔

"کچھ پتا بھی کر لیا تھا ان لوگوں کا کہ یونہی چار ہزار ی رقم دے آئے ہو؟ فیروز جیب سے پستول نکال کر سرہانے کے نیچے چھپاتے ہوئے مسکرایا۔

"شہابو! تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ میں کوئی شریف آدمی تو نہیں ہوں۔ بس کل سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اس کے بعد شیر خان اپنے آپ ہمارے حصے کی رقم لے کر ہمارے پاس پہنچ جائے گا۔"

شہاب صوفے میں دھنستے ہوئے بولا۔ "میں چاہتا ہوں کہ اغوا کے فوراً بعد ہم شیر خان کی بیٹی کو لے کر کراچی روانہ ہو جائیں وہ بااثر آدمی ہے۔ اغوا کے فوراً بعد پولیس حرکت میں آجائے گی۔" فیروز نے کہا۔ "یار تم اتنا گھبراتے کیوں ہو؟ گاڑی ہمارے پاس ہو گی۔ ہم منٹوں میں کہیں سے کہیں نکل جائیں گے اور ایک بار غیر علاقے میں داخل ہو گئے تو پولیس بھی ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ غیر علاقے میں جس شخص کے بارے میں میں نے تمہیں بتا رکھا ہے وہ نہایت قابل اعتبار آدمی ہے۔ سارا ڈراما وہیں ہو گا۔ شیر خان وہیں رقم لے کر اپنی بیٹی کو واپس لے جانے آئے گا۔ بس تم بے فکر ہو جاؤ۔"

شہاب نے اٹھ کر کمرے کی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر ہوٹل کے پچھواڑے جو احاطہ تھا وہاں

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نگاہ ڈالی اور کہنے لگا۔

"ہاں صبح سے ایک ویگن بھی کھڑی ہے میرا خیال ہے ہم یہ ویگن لے جائیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔ مگر کہیں یہ خراب نہ ہو۔" فیروز اٹھ کر کھڑکی میں آگیا۔ نیچے جھانک کر دیکھا۔

"یہ ہوٹل والوں کی ویگن ہے شام کو اس میں کچھ سامان آیا تھا۔ گاڑی چالو حالت میں ہے صبح دیکھیں گے۔" شہاب بولا۔

"مگر گاڑی ہمیں عین وقت پر اٹھانی ہو گی۔ تاکہ گاڑی کی گمشدگی کی خبر ہونے تک ہم شہر سے دور نکل چکے ہوں۔"

"ایسا ہی ہو گا۔ اب ذرا نیچے فون کر کے کھانا منگواؤ مجھے بڑی بھوک لگ رہی ہے۔"

دونوں نے کمرے میں ہی کھانا کھایا۔ پھر اپنے منصوبے پر مزید غور و فکر کرنے لگے۔ پستول دونوں کے پاس تھے گولیاں بھی مناسب تعداد میں موجود تھیں۔ رات گیارہ بجے کے بعد وہ سو گئے صبح اٹھے تو ساڑھے سات بج رہے تھے۔ واردات شروع کرنے میں صرف ایک گھنٹہ باقی تھا۔ انہیں پورے نو بجے گاڑی لے کر دونوں بدمعاشوں کے پاس ان کے اڈے پر پہنچنا تھا۔ ہوٹل والوں کو کسی قسم کے بل ادا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد دونوں پوری طرح تیار ہو چکے تھے۔ پستول انہوں نے جیکٹ کے اندر کمر کے گرد باندھ لیے تھے۔ رقم فیروز نے اپنے پاس رکھی ہوئی تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی اور بولا۔

"ٹھیک پندرہ منٹ بعد ہمیں یہاں سے نکل جانا ہو گا۔" شہاب نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔

ہوٹل کی ویگن وہیں کھڑی تھی۔ اتنے میں ایک نیلے رنگ کی کار احاطے میں آکر رکی۔ اس میں سے ایک عورت ایک مرد اور ان کے دو بچے باہر نکلے۔ مرد نے اٹیچی کیس ہاتھ میں پکڑا۔ عورت نے گاڑی کے دروازے بند کئے مگر تالہ نہیں لگایا۔ فیروز بولا۔

"یہ گاڑی ٹھیک رہے گی۔ احمق عورت نے دروازے لاک نہیں کئے۔ جلدی سے نیچے اترو۔"

دونوں لفٹ کے ذریعے ہوٹل کی لابی میں آگئے یہاں سے تیز تیز قدم چلتے ہوٹل کے

عقبی احاطے میں پہنچے۔ نیلے رنگ کی گاڑی وہیں کھڑی تھی۔ دونوں بڑے آرام سکون سے گاڑی کے پاس گئے۔ دروازے کھول کر اگلی سیٹوں پر بیٹھے فیروز نے انجن اسٹارٹ کیا۔ گاڑی کو تھوڑا سا پیچھے لے جا کر گھمایا اور ہوٹل کے سامنے سے گزرتے ہوئے گاڑی کو بڑی سڑک پر ڈالا اور اس کی رفتار بڑھا دی۔

"بھائی ویگن کا کوئی اعتبار نہیں تھا کیا پتا اسٹارٹ ہی نہ ہوتی یہ چلی چلائی گاڑی ہے۔ پیٹرول کی سوئی بتا رہی ہے کہ ٹینکی آدھی سے زیادہ بھری ہوئی ہے۔"

دونوں جرائم پیشہ آدمی یعنی سانولا اور اس کا ساتھی پوری طرح تیار ہو کر ٹیلے کے پاس ایک درخت تلے بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے اور فیروز کا انتظار کر رہے تھے سانولا کہہ رہا تھا۔

"کام بڑا آسان ہے اتنی رقم تو ہمیں کسی کو قتل کرنے پر بھی نہیں مل سکتی۔" اس کا ساتھی بولا۔

"پوری رقم پہلے پکڑ لینی چاہئے۔ آدمی بڑا کایاں ہے۔ کہیں جل نہ دے جائے۔" سانولا ہنسا ہاتھ کو جھٹک کر بولا۔

"پاگل ہو گئے ہو۔ تمہیں بندے کی پہچان نہیں ہے یہ مجھے لاکھوں کا معاملہ لگتا ہے لڑکی کو یونہی اغوا نہیں کرایا جا رہا باقی رقم کام ہوتے ہی مل جائے گی۔" ساتھی بدمعاش کہنے لگا۔

"اگر ایسی ویسی بات ہوئی تو میں اس کا لحاظ نہیں کروں گا۔" سانولا بولا۔

"تم کیا لحاظ نہیں کرو گے۔ میں وہیں موقع پر اسے ختم کر دوں گا۔ چاقو میں نے نیفے میں چھپا لیا ہے۔"

"گاڑی ادھر ہی آرہی ہے سانولے۔" دونوں بدمعاش کھڑے ہو گئے۔ نیلے رنگ کی گاڑی ذرا فاصلے پر کچی سڑک پر آکر رک گئی تھی فیروز باہر نکلا دوسرے بدمعاش نے سانولے سے کہا۔

"اوئے اس کے ساتھ دوسرا آدمی بھی ہے۔"

"پھر کیا ہوا یار؟" اتنی دیر میں فیروز ان کے قریب آچکا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"سب ٹھیک ہے؟" اس نے سانولے سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ سانولا نے سگریٹ پھینک دیا ہنس کر بولا۔

"سب اوکے ہے بادشاہو۔"

فیروز نے دونوں بدمعاشوں کو گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی بڑی تیزی سے کچے راستے سے نکل کر کوہ مری جانے والی سڑک پر چل پڑی۔ فیروز خود گاڑی چلا رہا تھا شہاب ایک بدمعاش کے ساتھ پیچھے بیٹھا تھا دوسرا بدمعاش سانولا فیروز کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ شہر سے باہر نکلتے ہی فیروز نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ پھر مری کی چڑھائی شروع ہو گئی۔ راستے میں انہیں کوئی ٹریفک کا سپاہی نہ ملا جو چوری کی گاڑی کا نمبر نوٹ کرتا۔ گاڑی پہاڑی موڑ کاٹتی اپنی منزل کی طرف بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ موسم بھی ٹھیک تھا۔ آسمان بھی صاف تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ آگے صرف ایک مشکل مقام آنے والا تھا جہاں شہاب اور فیروز کو احتیاط کی ضرورت تھی۔ یہ وہ مقام تھا جہاں گاڑی کو شیر خان کے بنگلے روبی ہاؤس کے سامنے سے گزرنا تھا۔ اگر اتفاق سے شیر خان بنگلے کے باہر سڑک پر کھڑا ہوا تو وہ ان دونوں کو دیکھ سکتا تھا۔ لیکن ایسا چانس ہزاروں میں سے ایک تھا کہ شیر خان اتنی سردی میں اپنے گرم کمرے سے نکل کر باہر سڑک پر کھڑا ہو۔ پھر بھی جب شیر خان کا بنگلہ قریب آیا تو فیروز اور شہاب نے اپنے سر تھوڑے نیچے کر لئے۔ گاڑی فراٹے بھرتی روبی ہاؤس کے آگے سے نکل گئی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ کافی آگے جا کر ایک جگہ پہاڑی کا ایک موڑ تھا جہاں تھوڑی سی کھلی جگہ تھی اور درختوں کے نیچے پتھر کا ایک بینچ پڑا تھا۔ ایک طرف چیڑ کے درختوں کے جھنڈ اوپر کی جانب چلے گئے تھے۔

یہاں پہنچ کر فیروز نے گاڑی روک دی اور گھڑی دیکھی۔ شیر خان کی بیٹی کے کالج سے واپس آنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ فیروز نے گاڑی کو گھما کر سڑک کی ایک طرف اس طرح لگا دیا کہ واپسی پر اسے بڑی آسانی سے اسٹارٹ کر کے واپس لے جایا جا سکتا تھا۔ فیروز اور شہاب گاڑی کے اندر ہی بدمعاشوں کے ساتھ بیٹھے رہے۔ فیروز نے سانولے سے کہا۔

"میں نے تمہیں لڑکی کی گاڑی کا رنگ اور لڑکی کا حلیہ بتا دیا ہے ہم اوپر درختوں کے پیچھے بیٹھے ہوں گے تم دونوں کو اسی جگہ واردات کرنی ہے ہم تمہیں دیکھ رہے ہوں گے

جونہی تم لڑکی کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالو گے ہم بھی نیچے اتر آئیں گے۔ بے ہوش کرتے وقت اس بات کا خیال رکھنا کہ لڑکی کے سر میں زیادہ شدید چوٹ نہ آئے اور خون بھی نہ نکلے۔" سانولا بولا۔

"آپ بے فکر رہیں بادشاہو۔ آپ کا بندہ آپ کو بالکل صحیح حالت میں ملے گا۔"

فیروز اور شہاب کے اندازے کے مطابق جب شیر خان کی بیٹی عائشہ کے وہاں تک پہنچنے میں بیس منٹ رہ گئے تو وہ دونوں چڑھائی چڑھ کر اوپر کچھ فاصلے پر درختوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے۔ دونوں بدمعاش گاڑی میں ہی بیٹھے رہے۔ سانولا ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا ان کی نگاہیں اوپر کوہ مری سے آتی پہاڑی سڑک پر لگی تھیں اس دوران ایک لاری اور ایک ٹرک اوپر سے آ کر گزر گیا سیزن چونکہ ختم ہو چکا تھا اس لئے سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ سانولے کو خاص طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ لڑکی کو بے ہوش ضرور کرنا ہے اس کام کے لئے سانولے نے اپنے بھاری چاقو کے دستے کا انتخاب کیا تھا۔ اس کے ساتھی نے لڑکی کے اوپر کھیس ڈال کر اسے قابو میں کرنا تھا اور سانولے نے اس کے سر کے پیچھے ضرب لگا کر اسے بے ہوش کرنا تھا۔ ان دونوں مضبوط جسم والے بدمعاشوں کے لئے یہ کام بظاہر کوئی مشکل نہیں تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ ان دونوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ جس لڑکی کو وہ اغوا کرنے والے ہیں وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے وہ ایک ایسی لڑکی ہے جس کو اس کے باپ شیر خان نے کمانڈو کی پوری ٹریننگ دے رکھی تھی اور جو بھرا ہوا پستول گاڑی چلاتے وقت ڈیش بورڈ میں ساتھ رکھتی تھی۔

شہاب اور فیروز اوپر درختوں کے پیچھے بیٹھے بے چین نظروں سے اوپر سے آتی سڑک کو تک رہے تھے۔ شہاب نے فکر مند ہو کر کہا۔

"کیا معلوم آج وہ کالج ہی نہ گئی ہو۔" فیروز نے سگریٹ کی راکھ چٹکی بجا کر جھاڑتے ہوئے کہا۔

"تو کوئی بات نہیں۔ یہی واردات کل ہو جائے گی مگر شیر خان کو ہم چھوڑیں گے نہیں اس سے اپنے حصے کی پائی پائی وصول کر کے رہیں گے۔"

"میرا خیال ہے گاڑی آ گئی ہے پھوجے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہاب نے ایک طرف سڑک پر ٹکٹکی باندھ رکھی تھی۔ فیروز نے چہرہ اٹھا کر دیکھا۔ اور سڑک پر نیلے رنگ کی گاڑی چلی آرہی تھی۔ روبی کی شیرنی بیٹی نے اس روز چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ وہ اپنی کالج کی فرنچ ٹیچر سے فرانسیسی زبان کا درس لے کر آرہی تھی۔ گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے گاڑی کے اندر کی فضا میں ہلکی ہلکی گرماہٹ تھی۔ بس ایک آخری پہاڑی موڑ رہ گیا تھا اس کے بعد عائشہ نے اپنے بنگلے والی سڑک کی طرف گھوم جانا تھا۔ وہ بڑی تن آسانی سے بیٹھی تھی۔ گاڑی کا انجن اس نے بند کر دیا تھا۔ کیونکہ گاڑی اترائی پر جا رہی تھی۔ اسے گھر جانے کی زیادہ جلدی بھی نہیں تھی۔ جونہی اس کی گاڑی یوٹرن والے آخری پہاڑی موڑ پر آئی عائشہ کا جو پاؤں بریک پر تھا اپنے آپ نیچے دب گیا۔ گاڑی کی رفتا ایکدم کم ہو گئی۔ سامنے سڑک کے بیچ میں ایک کار اس طرح کھڑی تھی کہ عائشہ اپنی گاڑی آگے نہیں نکال سکتی تھی۔ ایک آدمی نے گاڑی کا بونٹ کھول رکھا تھا اور انجن پر یوں جھکا تھا جیسے اس کی مرمت کر رہا ہو۔

عائشہ نے گاڑی روک لی اور دو تین بار اوپر تلے ہارن بجایا۔ سانولے کا ساتھی گاڑی کے پیچھے سے نکل کر سامنے آگیا۔ وہ عائشہ کی گاڑی کی طرف بڑھا اور بولا۔

"بیگم صاحبہ گاڑی کا انجن خراب ہو گیا؟ ابھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

اتنے میں سانولا بھی بونٹ نیچے کر کے عائشہ کی گاڑی کی طرف بڑھا۔ ان دونوں کی شکلیں عائشہ کو کچھ مشکوک سی لگیں مگر یہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان لوگوں نے یہ سارا ڈرامہ اس کو اغوا کرنے کے لیے رچایا ہوا ہے۔ سانولا گاڑی کی کھڑکی پر جھک کر بولا۔

"بیگم صاحبہ آپ کے پاس چھوٹا پلاس ہو گا؟" اس کے ساتھ ہی سانولا گاڑی کے دروازے کو کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ عائشہ کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا۔ اس نے کسی قدر اونچی آواز میں کہا۔

"میرے پاس پلاس نہیں ہے۔ دروازہ کیوں کھول رہے ہو؟" اتنے میں سانولے کے ساتھی نے پوری طاقت سے پتھر مار کر دوسری طرف سے کھڑکی کا شیشہ چکنا چور کر دیا۔ اب کچھ بھی سوچنا' سمجھنا باقی نہیں رہ گیا تھا۔ گاڑی میں ڈرائیونگ سیٹ پر اب عائشہ نہیں

بیٹھی تھی۔ شیرنی کی بچی شیرنی بیٹھی تھی۔ پلک جھپکنے میں اس کا ہاتھ ڈیش بورڈ کی طرف بڑھا۔ دوسرے لمحے بھرا ہوا پستول اس کے ہاتھ میں تھا پستول سے دو فائر ہوئے۔ دونوں گولیاں سانولے کے ساتھی کے جسم سے پار ہو گئیں۔ وہ خون میں لت پت ہو کر سڑک پر گرا اور تڑپنے لگا۔ سانولے نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ اس لڑکی کے پاس پستول بھی ہو سکتا ہے ایک لمحے کے لئے وہ گھبرا سا گیا۔ مگر پھر فوراً ہی جیب سے کمانی دار چاقو نکال کر عائشہ پر حملہ کر دیا۔ شیرنی غافل نہیں تھی۔ اس کا پستول ایک اور فائر کر چکا تھا۔ یہ گولی سانولے کے بازو میں لگی اور وہ نیچے جھک گیا۔ عائشہ اب گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔ سانولے نے موت اپنے سامنے دیکھی تو اپنے آپ کو جھاڑیوں میں نیچے کی طرف لڑھکا دیا۔ عائشہ نے اوپر سے تین فائر جھونک دیئے۔ مگر سانولا فائرنگ کی زد سے محفوظ ایک جگہ کھڈ میں جھکے ہوئے بڑے پتھر کے پیچھے چھپ چکا تھا۔ شیرنی عائشہ نے جھک کر سانولے کے ساتھی بدمعاش کو دیکھا۔ اس پر غشی طاری تھی۔ وہ جلدی سے سڑک کے درمیان کھڑی گاڑی کی طرف آئی۔ اندر جھانک کر دیکھا چابی لگی ہوئی تھی۔ اس نے چابی گھمائی تو انجن اسٹارٹ ہو گیا۔ وہ سمجھ گئی کہ ان بدمعاشوں نے صرف اسے اٹھانے یا ہلاک کرنے کے واسطے یہ سارا منصوبہ بنایا تھا۔ عائشہ نے گاڑی کو ریورس کر کے سڑک پر ایک جانب کھڑا کر دیا اور اپنی گاڑی کو وہاں سے تیزی سے نکال کر لے گئی۔ وہ اس واردات سے اپنے باپ شیر خان کو جلدی سے جلدی آگاہ کرنا چاہتی تھی۔

درختوں کے پیچھے چھپے ہوئے شہاب اور فیروز نے جب کھیل کا پانسہ پلٹتے دیکھا تو وہ حیران پریشان سے ہو کر رہ گئے۔ شہاب گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"پھوجے! اب یہاں سے جتنی جلدی ہو سکے بھاگ چلو۔ عائشہ اپنے باپ شیر خان کو لے کر یہاں پہنچنے والی ہے۔" فیروز بولا۔

"ایک ضروری کام کر کے یہاں سے واپس جائیں گے۔ میرے ساتھ آؤ۔ وہ جلدی جلدی جھاڑیاں پھلانگتے نیچے آگئے۔ سڑک کنارے زخمی بدمعاش کے سینے سے خون ابھی تک ابل رہا تھا۔ وہ آخری سانس لے رہا تھا۔ شہاب کہنے لگا۔

"یہاں سے بھاگ چلو۔ تم کیا سوچ رہے ہو۔ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ کر نکل چلو۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شیر خان آگیا تو ہمارے سارے راستے بند ہو جائیں گے۔" فیروز نے جھڑک کر کہا۔

"خاموش رہو تھوڑی دیر....." پھر اس نے نیچے اترائی پر اگی ہوئی جھاڑیوں کی طرف منہ کر کے سانولے کو آواز دی۔

"سانولے! جلدی سے اوپر آجاؤ۔ یہاں پولیس آنے والی ہے۔ جلدی کرو۔" سانولا بڑے پتھر کے پیچھے سے نکل کر اوپر چڑھائی چڑھنے لگا۔ اتنی دیر میں فیروز نے اپنی جیکٹ کے اندر ہاتھ ڈال لیا تھا۔ ابھی تک شہاب کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ فیروز کیا کرنے والا ہے۔ جونہی سانولا بدمعاش جس کے بازو میں گولی لگنے کی وجہ سے خون نکل رہا تھا اس کے سامنے آیا۔ فیروز نے جیکٹ کے اندر سے اپنا ہاتھ باہر نکالا۔ جتنی تیزی سے اس نے ہاتھ باہر نکالا اس سے دوگنی تیزی کے ساتھ فیروز نے سانولے کے دل کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ گولی سانولے کے دل میں لگی اور پار ہو گئی۔ وہ تو ہکا بکا سا ہو کر رہ گیا۔ خون کا فوارہ اس کے سینے سے ابل پڑا اور وہ پیچھے کی جانب جھاڑیوں میں جا گرا۔ فیروز لپک کر اس کے قریب گیا۔ اس کے سر کے ساتھ پستول کی نالی لگائی اور دوسرا فائر کر دیا۔ سانولا وہیں مر گیا۔ شہاب عجیب نظروں سے فیروز کی اس خونی کارروائی کا جائزہ لے رہا تھا۔ فیروز لپک کر سڑک کنارے پڑے سانولے کے ساتھی بدمعاش کے پاس آگیا۔ وہ شدید زخمی حالت میں آخری سانس لے رہا تھا۔ فیروز نے گولی مار کر اس کی کھوپڑی بھی اڑا دی۔

"جلدی سے گاڑی کا رخ کوہ مری کی طرف کرو میرا منہ کیا تک رہے ہو شہاب؟"

روبی کی بیٹی عائشہ شیرنی نے گاڑی کا رخ راولپنڈی کی طرف کر کے اسے سڑک کنارے کھڑا کیا تھا۔ شہاب نے دوڑ کر گاڑی کا دروزہ کھولا اسے ریورس کر کے اس کا منہ کوہ مری کی طرف کیا اب فیروز بھی اس کی ساتھ والی سیٹ پر لپک کر بیٹھ چکا تھا۔ گاڑی کو فل تھروٹل دیا اور تیزی سے مری کی جانب سڑک کی چڑھائی طے کرنی شروع کر دی۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ سیزن گزر جانے کی وجہ سے پیچھے سے بھی کوئی گاڑی ابھی تک نہیں آئی تھی۔ دور انہیں ایک ٹرک آتا نظر آیا۔ فیروز نے شہاب سے کہا۔

"لیے چلو۔ لیے چلو۔ گاڑی فسٹ گیر میں ہی رہنے دو۔"

ٹرک پر لکڑی کے شہتیر لدے ہوئے تھے۔ وہ تیزی سے ان کی گاڑی کے قریب سے

گزر گیا۔ گاڑی جتنی تیزی سے چل سکتی تھی چڑھائی پر چلی جا رہی تھی۔ مری میں بادل چھا رہے تھے۔ بادلوں کا ایک ٹکڑا دھند کی شکل میں ان کے آگے سے گزر گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سٹی بینک میں سے گزر رہے تھے۔ چوک میں آکر فیروز نے شہاب سے کہا۔

"ایجنسی کی طرف نہیں جانا سیدھے سوار گلی کی طرف نکل چلو۔"

شہاب نے فیروز کے کہنے پر گاڑی دوسری چھوٹی سڑک پر ڈال دی جو نتھیا گلی کی طرف جاتی تھی۔ فیروز ان علاقوں سے واقف تھا۔ اس کا تعلق ان ہی علاقوں سے تھا۔ یہ سڑک ویران تھی۔ ایک جگہ بہت بڑی چٹان کا موڑ آگیا۔ دوسری جانب گہری کھڈ تھی۔ فیروز نے شہاب کو گاڑی کھڑی کرنے کو کہا دونوں گاڑی سے باہر نکل آئے۔ فیروز نے نیچے کھڈ میں جھانک کر دیکھا پھر کہنے لگا۔

"ہم اگر گاڑی اس جگہ ہی رہنے دیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اگر تم کہتے ہو تو ہم گاڑی یہاں سے کھڈ میں بھی گرا سکتے ہیں۔ شہاب نے گاڑی کو گالی دیتے ہوئے کہا

"اس کو ختم ہی کر دو۔"

گاڑی کو آہستہ آہستہ چلاتے کھڈ کے کنارے پر لے آئے۔ اس کے بعد انہوں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ کم از کم ان کے آس پاس کوئی انسان نہیں تھا۔ اب گاڑی کو ذرا سا دھکیلنے کی ہی ضرورت تھی۔ دوسرے لمحے گاڑی تیزی سے لڑھکتی جھاڑیوں کو کچلتی تھوڑی دور نیچے کو گئی اور پھر لڑھکنیاں کھاتی دور نیچے کھڈ کی تہہ میں پتھروں سے ٹکرائی اور آگ کے شعلوں میں تبدیل ہو کر ادھر ادھر بکھر گئی۔ شہاب اور فیروز اس دوران وہاں سے جا چکے تھے۔ ایک جگہ آکر انہوں نے سڑک چھوڑ دی اور چھوٹی سی پگڈنڈی پر ہو گئے جو درختوں کے درمیان سے ہوتی ہوئی اوپر سٹی بینک کی کوٹھیوں کی طرف چلی گئی تھی۔ یہاں انہوں نے آکر کچھ سکون کا سانس لیا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھتے ہوئے باتیں بھی کر رہے تھے۔

"اب کیا کرنا ہو گا؟" شہاب نے فیروز سے پوچھا۔ فیروز بولا۔

"ذرا اوپر چل کر کسی جگہ آرام سے بیٹھتے ہیں سب بتا دوں گا کہ آگے کیا کرنا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سنی بینک کی کوٹھیاں سیزن ختم ہو جانے کی وجہ سے خالی پڑی تھیں۔ ڈھلوانوں کی جھاڑیوں اور درختوں میں کہیں کہیں کوئی مقامی آدمی لکڑیاں کاٹتا یا کلہاڑی کندھے پر ڈالے چلتا نظر آجاتا تھا۔ وہ دونوں سنی بینک کے علاقے کے پہاڑی اور بہت حد تک دشوار گزار علاقے میں سے گزر کر اوپر مری جنرل پوسٹ آفس کے چوک میں نکلنا چاہتے تھے۔ شہاب ایک جگہ دم لینے کے لئے رک گیا۔ پہاڑ کی چڑھائی چڑھتے ہوئے اس کا سانس پھول گیا تھا۔ ذرا دم لینے کے بعد تعجب سے کہنے لگا۔

"تم نے ایک بات نوٹ کی ہے؟"

"کیا؟" فیروز نے شہاب کی طرف دیکھا۔ شہاب بولا۔

"شیر خان کی بیٹی نے کس دیدہ دلیری سے ایک خون کر دیا۔ وہ تو اپنی طرف سے سانولے کے ساتھی کو ہلاک کر کے گئی تھی۔ اگر سانولا پہلی گولی کھا کر بھاگ نہ جاتا تو وہ اسے بھی زندہ نہ چھوڑتی۔ اس لڑکی کو قابو میں کرنے کے لئے ہمیں بڑی ہوشیاری سے کام لینا پڑے گا۔" فیروز نے سگریٹ سلگا لیا تھا۔ فضا میں سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہنے لگا۔

"جیسا شیر خان ہے اور جیسی اس کی بیوی روبی تھی قدرتی بات ہے کہ ان کی بیٹی کو بھی ایسا ہی ہونا چاہئے۔ یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں ہے۔" شہاب نے ہونٹوں کو یوں سکیڑا جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ہو۔ کہنے لگا۔

"تم جانو ..... میرا تو خیال ہے کہ اس لڑکی کے اغوا کے لئے کوئی زبردست قسم کی اسکیم تیار کرنی پڑے گی۔" فیروز نے شہاب کے گھٹنے کو اپنے ہاتھ سے دبا کر کہا۔

"میرے یار شہابو! عورت چاہے۔ بہرام ڈاکو بن جائے۔ آخر وہ عورت ہی ہوتی ہے۔ وہ مرد کا مقابلہ کبھی نہیں کر سکتی۔ میں تمہیں اسے اغوا کر کے دکھاؤں گا۔"

"میرا خیال ہے پولیس ضرور وہاں پہنچی ہو گی۔ جب ہی تو لاش سڑک پر نہیں تھی۔" شہاب جیسے اپنے آپ سے ہمکلام تھا۔ فیروز نے کہا۔

"شیر خان نے پولیس کو رپورٹ ہی نہیں کی ہو گی اسے رپورٹ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ قتل اس کی کوٹھی سے ایک فرلانگ پیچھے ہوا ہے۔ کوئی ثبوت پیش کرنے والا ہی نہیں کہ قتل شیر خان کی بیٹی نے کیا ہے۔ ہمارے پکڑے جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

شہاب نے بھی سگریٹ سلگا لیا۔ وہ کچھ دیر کسی گہری سوچ میں غرق سگریٹ کے کش لگاتا رہا۔ پھر بولا۔

"کیا ان دونوں کا خون کرنا ضروری تھا؟ فیروز نے دائیں بائیں ایک نگاہ ڈالی اور بولا۔

"شہاب! تم آدمی ضرور دلیر ہو مگر تمہارے دماغ میں عقل کی کمی ہے۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھ سکے کہ ہم نے کروڑوں روپے داؤ پر لگا رکھے ہیں اگر ہم انہیں زندہ چھوڑ دیتے تو یہ کسی بھی جگہ کسی بھی پوزیشن میں ہمیں پہچان سکتے تھے۔ یقین کرو اگر وہ شیر خان کی بیٹی کو اغوا کر کے ہمارے حوالے کر دیتے تو میں نے ان دونوں کو ختم کر دینے کا پروگرام بنایا ہوا تھا۔"

شہاب نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب وہ چلنے لگے تو شہاب نے ایک بار پھر پوچھا کہ اب آگے کیا پروگرام ہے؟ فیروز پتھروں پر احتیاط سے چل رہا تھا کہنے لگا۔

"آج کی رات ہم کوہ مری میں ہی کسی جگہ گزاریں گے کل دن میں شیر خان سے ملاقات کریں گے اور اس پر یہ ظاہر کریں گے کہ ہم کراچی جانے سے پہلے اس سے آخری بار ملنے آئے ہیں۔"

"اس کے بعد؟" شہاب نے سوال کیا۔

فیروز نے جواب دیا۔ "یہ تمہیں شیر خان سے ملاقات کے وقت معلوم ہو جائے گا کہ میں نے آگے کیا پروگرام بنایا ہے۔ اتنی دیر تک میں اپنے پروگرام کو آخری شکل بھی دے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

لوں گا۔"

سنی بینک کی چڑھائی ختم ہوئی تو وہ ڈاک خانے والے چوک میں نکل آئے تھے۔ آج کل یہ دشوار گزار راستہ ایک چھوٹی سی پختہ سڑک میں تبدیل کر دیا گیا ہے مگر بہت غیر ہموار پتھریلا راستہ تھا۔ جہاں سے زیادہ تر مقامی لوگ ہی شاٹ کٹ کے خیال سے گزرتے تھے۔ مری کا آسمان بادلوں میں چھپ گیا تھا۔ سرد ہوا تھی۔ مال روڈ پر اکا دکا آدمی ہی دکھائی دیتا تھا۔ شہاب نے کہا کہ ہمیں یوں آزادی سے نہیں پھرنا چاہئے چلو کسی ہوٹل میں کمرہ لے لیتے ہیں۔ فیروز پنڈی پوائنٹ کی طرف نکل گیا۔ یہ علاقہ نسبتاً زیادہ خاموش اور ویران ویران تھا۔ یہاں ایک ہوٹل میں انہوں نے ایک کمرہ لے لیا۔ دوپہر کا کھانا کھایا اور کمرے میں ہی آرام کرنے لگے۔

رات انہوں نے اسی ہوٹل میں بسر کی۔ دوسرے دن دوپہر تک ہوٹل کے کمرے میں ہی رہے پھر تیار ہو کر نیچے آئے۔ ہوٹل کا بل ادا کیا اور ایک لاری میں سوار ہو کر پنڈی کی طرف روانہ ہو گئے۔ لاری جب اسی پہاڑی موڑ پر سے گزری جہاں انہوں نے دو بدمعاشوں کا خون کیا تھا تو باہر جھانک کر دیکھا۔ جہاں سانولا کے ساتھی کی لاش گری تھی وہاں خون کے دھبے موجود تھے مگر لاش نہیں تھی۔ سانولا تو گولی کھا کر پہلے نشیب کی جھاڑیوں میں گرا تھا۔ اس کی لاش بھی انہیں کہیں نظر نہ آئی۔ لاری شیر خان کے بنگلے کے سامنے سے ہو کر پنڈی کی طرف آگے نکل گئی۔ کوئی ایک فرلانگ گزر جانے پر فیروز نے لاری رکوائی اور دونوں لاری سے اتر کر شیر خان کے بنگلے روبی ہاؤس کی طرف چل پڑے۔ بنگلے کے چوکیدار نے انہیں دیکھتے ہی بڑے ادب سے سلام کیا اور ٹیلی فون پر اندر اطلاع کی۔ شیر خان نے دونوں کو اندر بلا لیا۔ حسب سابق اس بار بھی شیر خان ڈرائنگ روم سے نکل کر برآمدے میں ان کے خیر مقدم کو موجود تھا۔ فیروز اور شہاب نے بڑی خندہ پیشانی سے آگے بڑھ کر شیر خان سے مصافحہ کیا اور اسے باری باری گلے لگایا۔ فیروز بولا۔

"شیر خان! پہلے تو یہی ارادہ تھا کہ کراچی نکل جائیں اور وہاں سے سری لنکا کی فلائیٹ پکڑیں مگر پھر تمہاری محبت نے جوش مارا۔ ہم نے ارادہ بدل لیا۔ سوچا نہ جانے پھر زندگی میں ملنے کا کبھی اتفاق ہو کہ نہ ہو چل کر آخری بار اپنے پرانے ساتھی سے مل لیتے ہیں۔"

شیر خان نے بھی بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ کہنے لگا۔

"بڑا اچھا کیا کہ تم آ گئے۔ اب کچھ روز میرے ساتھ گزارو۔ پرانے دنوں کی یادیں تازہ کریں گے۔"

وہ ایک ڈرائینگ روم میں جا کر بیٹھ گئے۔ شیر خان نے کھانے کا پوچھا۔ شہاب نے کہا۔

"کھانا تو ہم پنڈی سے ہی کھا کر آئے ہیں۔" فیروز بولا۔

"زیادہ نہیں یارا بس دو دن تمہارے پاس رہیں گے۔ اسی لئے ہم نے ٹیکسی بھی واپس کر دی ہے۔" شیر خان نے مٹھائی اور چائے منگوائی اور شہاب اور فیروز سے باتیں کرنے لگا۔

"مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے کہ تم کچھ وقت میرے ہاں گزارو گے۔ ایک مدت ہو گئی ہے کبھی ہم اکٹھے رہا کرتے تھے۔" فیروز نے منافقانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"شیر خان! پیارے ہم تو اب بھی اکٹھے ہی ہیں۔ دل ملے ہوئے ہوں تو فاصلہ کوئی چیز نہیں ہوتا۔" شیر خان نے ایک بار پھر پرانی دوستی کا احترام کرتے ہوئے کہا۔

"اگر تم لوگ چاہو تو پاکستان میں رہ کر اپنا کوئی باوقار کاروبار شروع کر سکتے ہو۔ میں حاضر ہوں۔ جتنی مدد ہو سکے گی کروں گا۔"

فیروز نے دل میں کہا ہمارا سارا مال ہڑپ کر کے اب ہمیں اسی میں سے ادھار دے کر احسان کر رہے ہو؟ ہم تو تیری ساری جائیداد ساری دولت پر قبضہ کریں گے۔ ایک طرح سے یہ ساری دولت ہماری ہی ہے اوپر سے مشکورانہ انداز میں کہنے لگا۔

"ارے نہیں شیرے یارا اتنی مدت سے لنکا میں رہ رہے ہیں۔ اب یہاں آ کر کیا کریں گے۔ وہیں اپنا کوئی کاروبار شروع کر دیں گے۔ اللہ مالک ہے۔"

شہاب اور فیروز دونوں اس بات کو محسوس کر رہے تھے کہ شیر خان کی بیٹی کے ساتھ اتنا بڑا واقعہ ہو گزرا ہے مگر اس بارے میں شیر خان نے ابھی تک کسی قسم کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ شیر خان کی بیٹی عائشہ نے اپنے ساتھ گزرے سانحے کا باپ سے ذکر ہی نہ کیا ہو؟ مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ عائشہ کی کار کا شیشہ بھی ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔ اس پر مجرمانہ حملہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس نے باپ سے ضرور بات کی ہو گی تو کیا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر شیر خان انہیں اس واقعے کے بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا؟ دونوں یہی ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔ ان کے دماغوں میں اس لمحے ایک ہی طرح کے خیالات گردش کر رہے تھے۔ وہ اپنی طرف سے کوئی ذکر چھیڑ کر شیر خان کو کسی شک میں مبتلا بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ شیر خان اتنا بااثر آدمی تھا کہ اگر پولیس کو واقعے کی اطلاع مل بھی گئی ہو تو وہ اسے رفع دفع کرا دے۔ شہاب اور فیروز کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ شیر خان کو ان دونوں پر ذرا سا بھی شبہ نہیں تھا پھر بھی فیروز سے نہ رہا گیا۔ وہ قتل کی واردات کی کچھ نہ کچھ سن گن ضرور لینا چاہتا تھا۔ چائے کی پیالی میں چمچ ہلاتے ہوئے آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔

"شیرے یارا ہم نے پنڈی میں سنا تھا کہ یہاں اوپر کوہ مری کے پاس دو لاشیں ملی ہیں کہتے ہیں دونوں غنڈہ ٹائپ آدمی تھے۔" شیر خان نے بے نیازی سے سگار کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہاں سے تھوڑی دور یہ واقعہ ہوا تھا۔ پولیس کو دو لاشیں بھی ملی ہیں۔ کسی نے گولی ماری تھی انہیں۔ میرا خیال ہے کوئی پرانی دشمنی کا کیس تھا۔ مٹھائی اور لوناں یار۔"

اس کا مطلب ہے کہ شیر خان نے اس واردات کو دبا دیا ہے۔ وہ کسی کو اس بارے میں کچھ نہیں بتانا چاہتا۔ فیروز یہ سوچ کر خاموش ہو رہا۔ شہاب نے شیر خان سے پہاڑ کے موسم کے بارے میں گفتگو شروع کر دی تھی۔ اتنے میں شیر خان کی بیٹی عائشہ آ گئی۔ اس کی گاڑی وہی تھی۔ شہاب اور فیروز نے کھڑکی میں سے دیکھا۔ گاڑی کے دروازے کا شیشہ بدلوا دیا گیا تھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے کی جگہ اب نیا شیشہ چڑھا ہوا تھا۔ گویا شیر خان نے معاملے کو دبا دیا ہے۔ وہ اس پوزیشن میں ہے وہ بڑی آسانی سے ایسا کر سکتا ہے۔ فیروز نے سوچا۔

رات کا کھانا ان سب نے ڈرائنگ روم میں اکٹھے بیٹھ کر کھایا۔ گیارہ بجے تک وہ تینوں آپس میں لنکا اور وہاں گزارے ہوئے پرانے دنوں کی باتیں کرتے رہے پھر شیر خان اپنے بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شہاب نے فیروز کی طرف دیکھا۔ گہرا سانس بھرا اور بولا۔

"اب بتاؤ۔ کیا سوچا ہے تم نے؟" فیروز نے نیا سگریٹ سلگانے کے بعد بڑے سکون سے جواب دیا۔

"دشمن کی بیٹی کے بیڈ روم کا جائزہ لینا ہو گا۔ واردات وہیں ہو گی۔ جب وہ گہری نیند سو رہی ہو۔ جاگتے میں اسکیم فیل ہو جانے کا خطرہ برابر موجود ہے۔" شہاب نے پوچھا۔

"تمہارا مطلب ہے یہ کام ہمیں ہی کرنا ہو گا؟"

"ہاں۔" فیروز کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "اب ہم کسی پر بھروسا نہیں کر سکتے۔ کیا ہم یہ کام نہیں کر سکتے؟"

"کیوں نہیں؟" شہاب نے آہستہ سے کہا۔ "لیکن منصوبہ کیا ہو گا؟"

فیروز اٹھ کر کمرے کی کھڑکی کے پاس گیا۔ باہر برآمدہ اور سامنے والا باغیچہ بجلی کی روشنی میں خالی پڑا تھا۔ یہ چھوٹا سا سجا سجایا گیسٹ ہاؤس تھا جہاں شیر خان نے اپنے دوستوں کو بڑی عزت و تکریم کے ساتھ ٹھہرایا تھا۔ فیروز نے گرم جیکٹ پہن کر سر پر مفلر لپیٹا اور شہاب سے کہا۔ "تم بھی کوٹ پہن لو۔ ہم برآمدے میں چل پھر کر باتیں کریں گے۔ تاکہ یہ خطرہ ہی نہ رہے کہ ہماری باتیں کوئی سن رہا ہے۔" شہاب نے بھی کوٹ پہن کر سر پر اونی ٹوپی اوڑھ لی کیونکہ باہر دھند اور سردی تھی۔ دونوں برآمدے میں آ گئے۔ فیروز نے جب یہ یقین کر لیا کہ وہاں ان کے سوا کوئی نہیں ہے تو کہنے لگا۔

"اب میری اسکیم کو غور سے سنو۔ شیر خان کے گھر کے جو چار چھ نوکر ہیں وہ تقریباً سبھی ادھیڑ عمر اور بوڑھے ہیں۔ رات کے کھانے کے بعد یہ لوگ اپنے اپنے کوارٹروں میں چلے جاتے ہیں۔ دوسری بات جو میں نے نوٹ کی ہے اور جس کی وجہ سے ساری اسکیم میرے دماغ میں آئی ہے یہ ہے کہ شیر خان کی بیٹی عائشہ اپنے کمرے میں اکیلی سوتی ہے اور کھانے کے بعد وہ کافی اپنے بیڈ روم میں منگواتی ہے۔ میں نے موقع نکال کر باتوں ہی باتوں میں نوکرانی سے پوچھ لیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ بی بی سونے سے پہلے کافی ضرور پیتی ہیں۔ رات کو پڑھتی بھی ہیں۔ اب منصوبہ یہ ہے کہ ہمیں عائشہ کو اس کے بیڈ روم میں پہلے بے ہوش کرنا ہو گا۔ اس کے بعد ہم اسے وہاں سے اٹھا کر لے جائیں گے۔"

شہاب بڑے غور سے فیروز کی باتیں سن رہا تھا۔ دونوں برآمدے میں ٹہلتے بھی جاتے تھے اور چاروں طرف سے چوکنے بھی تھے۔ شہاب نے کہا۔

"اوئے یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ تم عائشہ کو بے ہوش کیسے کرو گے؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"میں نے سارا پروگرام سوچ لیا ہے۔" فیروز نے دھیمے لہجے میں کہا۔"میں صبح راولپنڈی جارہا ہوں۔ تمہیں شاید یاد نہ ہو ایک دوائی ہوتی ہے جسے ہمارا چینی باس اپنے دشمنوں کو بے ہوش کرنے کے لئے استعمال کیا کرتا تھا۔ مجھے اس کا نام اور شکل یاد ہے۔ یہ پانی کی طرح ہوتی ہے۔ باس نے مجھے ایک بار بتایا تھا کہ نہ اس کا کوئی ذائقہ ہوتا ہے نہ کوئی بو ہوتی ہے۔ یہ جس شے میں بھی ڈال دی جائے اس شے کا اپنا ذائقہ اور بو بھی نہیں بدلتی۔ اب ساری اسکیم کا دارومدار اس دوائی پر ہے اگر مجھے راولپنڈی کی کسی دکان سے یہ دوائی مل گئی تو پھر سمجھو کہ شیر خان ہمارے قبضے میں ہو گا۔"

"اس کا نام کیا ہے؟" شہاب نے پوچھا۔

"تم نام کو چھوڑو۔ مجھے یاد ہے۔ تم یہ بات غور سے سنو کہ تمہیں کیا کرنا ہو گا اگر میں یہ بے ہوشی کی دوائی لانے میں کامیاب ہو گیا تو تم میرے آنے کے فوراً بعد یہاں اوپر کوہ مری چلے جاؤ گے وہاں سے کوئی ٹیکسی یا کوئی دوسری گاڑی جیسے بھی ہو حاصل کر کے شیر خان کے بنگلے سے تھوڑا آگے کسی جگہ کھڑی کر دو گے۔ یہ خیال رہے کہ گاڑی میں سوائے تمہارے کوئی دوسرا ڈرائیور نہیں ہو گا۔" شہاب نے فیروز کی طرف گردن گھما کر دیکھا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ مجھے ....." اس کی بات کاٹ کر فیروز بولا۔

"ہاں تم ڈرائیور کو راستے میں ہی کہیں گہرے کھڈ میں پھینک دو گے۔ اگر اسے قتل کرنا پڑا تو اس سے بھی دریغ نہ کرنا۔ یہ ہماری زندگی اور ہمارے مستقبل کا سوال ہے۔ میں تمہیں وہ جگہ بتا دوں گا جہاں تم رات کو گاڑی لا کر کھڑی کرو گے۔ میں عائشہ کو لے کر وہیں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔" شہاب نے سگریٹ لان کے گھاس پر پھینکتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے یار سب کچھ ہو جائے گا۔ خون کرنا پڑے گا تو وہ بھی کر دوں گا۔ اس دھوکے باز شیر خان کو اپنے حصے کی دولت سے عیش کرتے نہیں دیکھ سکتا۔"

"شاباش۔" فیروز نے شہاب کے کندھے کو تھپتھپا کر کہا۔" اب تم آئے ہو سیدھی راہ پر۔"

شہاب نے پوچھا۔ "اگر تمہیں بے ہوش کرنے والی دوا نہ ملی تو کیا کریں گے؟"

فیروز بولا۔ "پھر کوئی دوسری ترکیب سوچ لیں گے اور کچھ نہیں تو میں کسی دکان سے

کلوروفارم حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ چینی باس والی دوائی میں یہ خوبی ہے کہ اس کے ایک قطرے سے پورے گھر کو بے ہوش کیا جا سکتا ہے اور کسی کو احساس تک نہیں ہوتا کہ چائے یا کافی میں کوئی دوائی بھی اس کے معدے میں جا رہی ہے۔ چلو اندر چلتے ہیں۔ باتیں بھی کر لی ہیں ہم نے اور سردی بھی زیادہ ہو گئی ہے۔"

دونوں کمرے میں آ گئے۔ کمرہ گرم تھا۔ انہوں نے کوٹ وغیرہ اتار کر ایک طرف ڈالے اور اپنے اپنے پلنگ پر چڑھ کر کمبل اوپر کر کے لیٹ گئے۔

اگلے دن فیروز ایک ضروری کام کا بہانہ بنا کر ناشتہ کرتے ہی پنڈی روانہ ہو گیا۔ صدر میں آتے ہی اس نے سیدھا کیمسٹ کی دکانوں کا رخ کیا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد اسے ایک کیمسٹ شاپ سے اپنی مطلوبہ دوائی مل گئی۔ یہ چھوٹی سی شیشی میں پانی کی شکل کی تھی اور درد چوٹ والی جگہ کو سن کرنے کے لئے استعمال کی جاتی تھی لیکن اس کا ایک قطرہ کسی کو پلا دیا جائے تو کم از کم بارہ گھنٹے سے پہلے اسے ہوش نہیں آ سکتا تھا۔ بڑی چالاکی سے فیروز نے یہ بات بھی کیمسٹ سے معلوم کر لی تھی۔ وہ بڑا خوش ہوا تھا کیونکہ عائشہ کو سات آٹھ گھنٹے سے پہلے ہوش بھی نہیں آنا چاہئے تھا۔ دوائی لے کر وہ الٹے قدموں واپس کوہ مری کی طرف چل پڑا۔ دوپہر کے کھانے سے پہلے پہلے وہ شیر خان کے بنگلے میں تھا۔ یہ خوشخبری اس نے شہاب کو سنائی تو وہ بڑا خوش ہوا لیکن اب اسے وہاں سے پنڈی کے لئے کھسکنا تھا۔ ایک طرح سے ان کا ایکشن پلان شروع ہو چکا تھا۔

تیسرے پہر انہوں نے چائے شیر خان کے ساتھ باغیچے میں ہلکی ہلکی دھوپ میں بیٹھ کر پی۔ یہیں شہاب نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ کوہ مری کا ایک چکر لگانا چاہتا ہے۔ شیر خان نے فوراً کہا کہ گاڑی لے جاؤ اور جا کر مری کی سیر کر آؤ۔ گاڑی کی یہ پیشکش اس نے فیروز کو بھی پنڈی جاتے وقت کی تھی مگر اس نے بھی یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ مجھے کولمبو میں دوستوں کے واسطے کچھ سوغاتیں دیکھنی ہیں۔ جانے کہاں کہاں پھرنا پڑے اور شہاب نے یہ کہہ کر گاڑی نہ لی کہ وہ آزادی سے گھومنا پھرنا چاہتا ہے گاڑی ساتھ ہوئی تو اسے کہاں کہاں سنبھالتا پھرے گا۔

شیر خان نے کہا۔"ڈرائیور تمہارے ساتھ ہو گا۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہاب ہنس کر کہنے لگا۔"یار! میں کسی کو اپنے سر پر سوار نہیں کرنا چاہتا۔" اس نے ہنسی مذاق میں بات کو ٹال دیا اور پھر ایک گھنٹے بعد یہ کہہ کر کوہ مری کی طرف چل دیا کہ رات کے کھانے پر واپس آجائے گا۔ شیر خان کی بیٹی عائشہ اور ہماری شیرنی اس وقت اپنے کمرے میں ہی تھی اور چائے پینے کے بعد کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ اسے باپ نے ہر قسم کی تعلیم دلائی تھی۔ اسے ہر لحاظ سے اس قابل بنایا تھا کہ وہ وقت پڑنے پر اپنی ناموس کی بھرپور طریقے سے دلیری اور بہادری کے ساتھ حفاظت کر سکے مگر عائشہ شیرنی ابھی تجربے کی بھٹی سے نہیں گزری تھی۔ وہ لوگوں کے چہرے ابھی نہیں پڑھ سکتی تھی۔ شہاب اور فیروز کے بارے میں شیر خان نے بیٹی کو اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ اس کے پرانے دوست ہیں اور سری لنکا سے اسے ملنے آئے ہیں۔ شیرنی عائشہ نے ان دونوں کو اپنے باپ کا دوست ہی سمجھ رکھا تھا اور ان کی بڑی تعظیم کرتی تھی۔

شہاب کے جانے کے بعد فیروز اپنے کمرے میں آگیا۔ اس نے بے ہوشی کی دوا والی چھوٹی سی نیلی شیشی اپنی واسکٹ کی جیب میں ڈال رکھی تھی۔ وہ ذہن میں ایک بار پھر اپنے منصوبے کا جائزہ لینے لگا۔ دوسری طرف شہاب نے کوہ مری پہنچتے ہی گاڑی یا ٹیکسی کی تلاش شروع کر دی۔ سیزن ختم ہو جانے کی وجہ سے وہاں گاڑیاں نظر ہی نہیں آتی تھیں۔ کوہ مری کو دونوں نے اس لئے چنا تھا کہ پنڈی میں وہ گاڑی اٹھانے کی ایک واردات کر چکے تھے اور پنڈی دور بھی تھا۔ شہاب نے اوپر کا علاقہ دور تک چھان مارا۔ سب کوٹھیاں بند پڑی تھیں۔ مال پر بھی کوئی کار وغیرہ نہیں آجا رہی تھی۔

وہ پنڈی پوائنٹ کی طرف گیا تو اس نے دیکھا کہ ایک کلینک کے احاطے میں سفید رنگ کی ویگن کھڑی ہے۔ یہ ایمبولینس ویگن تھی۔ شہاب کے قدم وہیں رک گئے۔ وہ ایک طرف ہٹ کر سڑک کی ریلنگ پر بیٹھ گیا اور کلینک کی ایمبولینس کو غور سے دیکھنے لگا۔ یہ گاڑی ان کے لئے بڑی فائدہ مند ثابت ہو سکتی تھی۔ جس وقت وہ شیر خان کی بیٹی کو اغوا کر کے لے جائیں گے تو وہ بے ہوش ہو گی۔ یوں اگر کسی جگہ انہیں چیک بھی کیا گیا تو وہ یہ کہہ کر بڑی آسانی سے نکل سکیں گے کہ ان کی بہن بے ہوش ہو گئی ہے وہ اسے اسپتال لے جا رہے ہیں۔ کسی کو شک بھی نہیں پڑے گا۔ ایمبولینس پر انگریزی میں ایمبولینس کے

سرخ الفاظ لکھے تھے اور کراس کا نشان بھی تھا۔ شہاب نے یہ ایمبولینس رات کے بارہ بجے یہاں سے اڑائی تھی اور دس منٹ میں واپس نیچے اترائی پر شیر خان کے بنگلے روبی ہاؤس سے دس پندرہ قدم کے فاصلے پر پہنچ کر فیروز کا انتظار کرنا تھا۔

جب رات کے کھانے پر بھی شہاب کوہ مری سے واپس نہ آیا تو شیر خان نے فیروز سے کہا۔

"اس کو وہاں ایسا کونسا کام تھا؟ اپنی گاڑی لے جاتا کہیں اسے وہاں ٹیکسی وغیرہ حاصل کرنے میں دقت پیش نہ آرہی ہو۔" فیروز نے بے نیازی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"ایک مدت بعد مری گیا ہے۔ کوئی پرانا ساتھی مل گیا ہو گا۔ آجائے گا گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک۔ نہیں تو صبح آجائے گا۔"

فیروز نے جان بوجھ کر اس موضوع کو ٹال دیا اور شیر خان کے ساتھ سری لنکا میں گزارے ہوئے دنوں کی باتیں شروع کر دیں۔ عائشہ نے اپنے بیڈ روم میں ہی کھانا منگوا لیا تھا۔ کھانے کے بعد فیروز اور شیر خان چائے پیتے ہوئے باتیں کرنے لگے۔ موسم ابر آلود ہو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد انہیں بادلوں میں ہلکی سی گرج سنائی دی پھر ہلکی ہلکی بارش شروع ہو گئی۔ شیر خان بولا۔

"مجھے شہاب کا خیال آرہا ہے۔ میں ڈرائیور کو گاڑی دے کر مری بھیج نہ دوں۔ وہ اسے تلاش کر ہی لے گا۔" فیروز نے بے پروائی سے ہاتھ کو جھٹک کر کہا۔

"چھوڑو یار۔ وہ کوئی بچہ نہیں ہے۔ کسی ہوٹل میں ٹک گیا ہو گا۔" پھر شیر خان کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"کوئی ساتھی تلاش کر لیا ہو گا بدمعاش نے۔" اور خود ہی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ شیر خان بھی مسکرانے لگا۔ اس وقت رات کے دس بجنے والے تھے۔ فیروز نے ایک فرضی جمائی لی اور بولا۔

"یار مجھے تو نیند آرہی ہے۔" شیر خان بھی یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا کہ میں بھی سونے کے لئے چلتا ہوں۔"

شیر خان اپنے بیڈ روم کی طرف چل دیا اور فیروز برآمدے میں سے گزرتے ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گیسٹ ہاؤس میں آگیا۔ یہاں آتے ہی اس نے کھڑکیوں کے پردے کھینچ دیے اپنے بریف کیس کو کھول کر پستول نکالا۔ رومال سے اسے صاف کیا۔ اس میں گولیاں بھریں پھر بے ہوشی کی دوا والی شیشی کو روشنی کے سامنے کر کے غور سے دیکھا۔ اسے اپنی جیکٹ کے اندر والی جیب میں ڈالا۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ دراز میں سے نائیلون کی رسی کا چھوٹا سا گچھا نکال کر جیب میں رکھا۔ اس رسی سے وقت آنے پر اس نے عائشہ کے ہاتھ پاؤں باندھنے تھے۔ باہر بارش کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی۔ بریف کیس اس نے الماری میں رکھ کر تالا لگا دیا۔ اب وہ ساڑھے دس بجنے کا بے تابی سے انتظار کرنے لگا۔ یہ اس نے معلوم کر لیا تھا کہ شیر خان کی بیٹی کا یہ معمول ہے کہ وہ رات کو ساڑھے دس بجے کے بعد چائے منگواتی ہے پھر بارہ بجے تک پڑھتی ہے اور پھر سو جاتی ہے۔ جب ساڑھے دس بجنے میں تین منٹ باقی رہ گئے تو فیروز نے جیکٹ کے کالر اونچے کیے اور دروازے میں سے نکل کر برآمدے میں سے گزرتا پیچھے بنگلے کے کچن کی طرف آگیا۔ کچن میں روشنی ہو رہی تھی۔

خادمہ کی بجائے بوڑھا خانساماں برتن وغیرہ سمیٹ رہا تھا۔ گویا آج خادمہ کی بجائے خانساماں کو چائے لے کر عائشہ کے بیڈ روم میں جانا تھا۔ فیروز کو یہ خدشہ بھی ہوا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ خادمہ عائشہ کی چائے لے کر جا چکی ہو۔ خانساماں نے مالک کے دوست اور مہمان کو کچن میں آتے دیکھا تو سلام کر کے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ فیروز نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

"بابا تم اپنا کام کرتے رہو۔ سردی بڑی ہے میں نے سوچا کہ کچن میں چل کر ہی چائے کی ایک پیالی پی لی جائے۔"

بجلی کے چولہے پر پہلے سے پانی کی چمکتی ہوئی کیتلی رکھی ہوئی تھی خانساماں نے بڑی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

"سر! ابھی چائے حاضر کرتا ہوں۔ آپ اپنے کمرے میں تشریف لے چلیں۔ میں وہیں چائے لے آتا ہوں۔"

فیروز گدے دار اسٹول پر بیٹھ گیا۔ بولا۔

"ارے نہیں بھائی۔ تم سردی میں چائے کی پیالی لے کر کہاں جاؤ گے۔ میں خود ہی

تمہارے پاس آگیا ہوں۔ ایک پیالی بنا دو۔" اس دوران فیروز نے دیکھ لیا تھا کہ اسٹین لیس اسٹیل کی ٹرے میں چائے کا سامان لگا ہوا ہے۔ سوات کی ٹی کوزی الگ پڑی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ عائشہ کو ابھی چائے نہیں گئی پھر بھی فیروز نے اپنی تسلی کے واسطے پوچھ ہی لیا۔

"بابا! یہ چائے کا سامان کس کے لئے لگایا ہوا ہے؟ کیا ہمارا یار شیر خان رات کو بھی چائے پیتا ہے؟" خانساماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں جناب یہ ہماری بیٹی عائشہ بی بی کے لیے ہے۔ وہ رات ایک بار لائیٹ چائے کا ایک کپ ضرور پیتی ہے مگر میں آپ کو پہلے کپ بنائے دیتا ہوں۔" فیروز جلدی سے بولا۔

"ارے نہیں نہیں بابا۔ بیٹی کو پہلے چائے دے آؤ۔ میں بعد میں پی لوں گا۔" فیروز نے سارا منصوبہ پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ وہ اپنی جیکٹ کی جیبیں ٹٹولنے لگا پھر افسوس کے انداز میں بولا۔

"بابا ایک کام تمہیں کرنا پڑے گا۔"

"حکم کریں جناب۔" خانساماں نے بڑے ادب سے کہا۔

"اصل میں میں چینی کی جگہ چائے میں سکرین استعمال کرتا ہوں میرا خیال ہے میری سکرین کی شیشی کمرے کی میز پر ہی رہ گئی ہے۔ بس اتنی تکلیف دوں گا کہ میز پر سے شیشی اٹھا لاؤ۔ سبز رنگ کی چھوٹی سی شیشی ہے۔"

"ابھی لایا جناب۔" یہ کہہ کر خانساماں نے چائے کے لیے رکھے ہوئے پانی کی کیتلی چولہے سے اتار دی اور کچن کا دروازہ کھول کر گیسٹ ہاؤس کی طرف چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی فیروز اسٹول پر سے اٹھا۔ کھڑکی میں سے خانساماں کو برآمدے میں نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھا پھر جیب سے بے ہوشی کی دوائی والی شیشی نکال کر چائے کے برتنوں والے ٹرے کی طرف بڑھا۔ ٹی پاٹ کا ڈھکنا اٹھایا۔ اس میں شیشی میں سے دوائی کے چھ سات سفید قطرے گرائے۔ ٹی پاٹ کا ڈھکنا بند کیا اور بڑے سکون سے اسٹول پر واپس جا بیٹھا۔ بارش کی آواز میں اسے خانساماں کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ اندر آکر بولا۔

"جناب! وہاں تو مجھے کوئی شیشی نہیں ملی۔" فیروز نے کہا۔

"میرا خیال ہے میں نے کہیں ادھر ادھر رکھ دی ہو گی۔ کوئی بات نہیں۔ تم ایسا کرنا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میرے کپ میں چینی مت ڈالنا۔" اتنی دیر میں چولہے پر رکھی ہوئی کیتلی کا پانی کھولنے لگا خانساماں نے کیتلی میں سے کھولتا ہوا پانی اس چینک میں انڈیل کر اوپر ٹیکوزی ڈال دی جس میں فیروز نے تھوڑی دیر پہلے بے ہوشی کی دوائی ڈالی تھی۔ اس کے بعد خانساماں نے فیروز کو چائے کا کپ بنا کر دیا اور ٹرے اٹھاتے ہوئے بولا۔

"میں بی بی جی کو چائے دے آؤں۔ ان کا چائے کا وقت ہو گیا ہے۔"

ساڑھے دس بج چکے تھے۔ فیروز اسٹول سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چائے کا کپ اس کے ہاتھ میں تھا۔ کہنے لگا۔

"میں بھی اپنے کمرے میں چل کر چائے پی لیتا ہوں۔ آج سردی زیادہ ہے۔"

خانساماں ٹرے لے کر شیر خان کی بیٹی عائشہ کے بیڈ روم کی طرف چل دیا۔ فیروز اسے دیکھتا رہا۔ جب وہ عائشہ کے بیڈ روم میں داخل ہو گیا تو فیروز اپنے کمرے کی طرف تیز تیز قدموں سے چل پڑا۔ کمرے میں آتے ہی اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر بنگلے کے گیٹ کی طرف دیکھا اور کان لگا دیے۔ فضا میں بارش کی آواز کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔

فیروز اس طرف سے اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ شہاب گاڑی لے کر اپنی جگہ پر آ گیا ہو گا وہ وہاں سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ اور ابھی شہاب کے آنے میں طے شدہ وقت باقی تھا۔ فیروز نے اپنا بریف کیس کھول کر اپنی چیزوں کا ایک بار پھر جائزہ لیا۔ اسے بند کر کے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔ بھرا ہوا پستول اس کی جیکٹ کی جیب میں ہی تھا۔ اس نے جلدی سے چائے کے دو تین گھونٹ بھرے اور کھڑکی کے پاس بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ اس نے کھڑکی کے شیشے پر سے تھوڑا سا پردہ ہٹا دیا تھا جہاں سے اسے باغیچے کی روشنی میں بنگلے کے گیٹ کی طرف جاتا راستہ بارش میں دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ اس کے کان سڑک پر شہاب کی گاڑی کی آواز سننا چاہتے تھے مگر ابھی تک کسی بھی گاڑی کی آواز نہیں آئی تھی۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ فرض کر لیا اگر آج عائشہ کا چائے پینے کو دل نہ چاہا تو اس کا سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ جب رات کے سوا گیارہ کا وقت ہوا تو فیروز اپنے کمرے کے عقبی دروازے سے باہر چھوٹے باغیچے میں نکل آیا۔ بارش اب کافی ہلکی ہو گئی تھی۔ اس کی نگاہیں بے اختیار شیر خان کی بیٹی عائشہ کے

بیڈ روم کی طرف اٹھ گئیں۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اگر عائشہ نے چائے کا ایک کپ پی لیا ہے تو وہ ضرور بے ہوش ہو چکی ہو گی۔ فیروز گیلی جھاڑیوں کے پیچھے سے ہو کر عائشہ کے بیڈ روم کی کھڑکیوں کی طرف بڑھا۔ کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے تھے۔ کھڑکیاں اندر سے بند تھیں۔ کہیں سے اندر نظر نہیں پڑتی تھی۔ فیروز نے بند کھڑکی کے ساتھ کان لگا دیا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ گہرا سناٹا طاری تھا۔ فیروز کا دل وسوسوں میں پڑ گیا۔ وہ عائشہ کو ایک نظر دیکھنے کو بے تاب تھا کیونکہ اس کی بے ہوشی پر ہی ان کے سارے مشن کی کامیابی کا انحصار تھا۔ فیروز دبے پاؤں بیڈ روم کے دروازے کی طرف آ گیا۔ دروازہ اندر سے لاک تھا یہاں بھی کسی طرف سے اندر نظر نہیں پڑتی تھی۔ فیروز نے گردن ایک طرف اٹھا کر کچن کی طرف دیکھا۔ کچن کی بتی گل ہو چکی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ خانساماں بھی کچن بند کر کے اپنے کوارٹر میں جا چکا تھا اتنے میں اسے نیچے سڑک پر کسی گاڑی کے گزرنے اور پھر ذرا آگے جا کر اس کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ یقیناً شہاب گاڑی لے کر پہنچ گیا تھا۔

ایکشن شروع کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ فیروز نے جیب سے لوہے کی ایک چھوٹی سی پن نکالی۔ اسے دروازے کے لاک کے سوراخ میں ڈالا اور بڑی احتیاط سے اسے دائیں سے بائیں گھمانے لگا۔ تیسری کوشش میں لاک کھل گیا۔ فیروز نے آہستہ سے دروازے کو دھکا دیا۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ اگر عائشہ بے ہوش نہ ہوئی ہو گی تو وہ بڑی شفقت سے مسکرا کر اس سے کہے گا۔

"بیٹی میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تمہارے کمرے کا لاک اسی طریقے سے کھل سکتا ہے کہ نہیں اب میں تمہیں ہدایت کروں گا کہ اندر سے چٹخنی بھی لگا لیا کرو۔" یہ بھی فیروز کی خوش قسمتی تھی کہ عائشہ نے اندر سے چٹخنی نہیں لگائی تھی۔ وہ چٹخنی نہیں لگا کر سوتی تھی۔ دھکا دینے سے بیڈ روم کا دروازہ کھل گیا۔ کمرے میں ٹیبل لیمپ کی روشنی پھیلی تھی اور فضا میں کسی قیمتی پرفیوم کی خوشبو چھائی ہوئی تھی۔ فیروز نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس کی نظریں پلنگ کی طرف گئیں۔ چائے کی کیتلی میں ڈالی ہوئی دوائی نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ عائشہ ریشمی تکیوں کے ساتھ ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔ سینے تک

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کمبل پڑا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی ہوئی تھی۔ کتاب ہاتھ سے لڑھک کر نیچے گری ہوئی تھی۔

فیروز نے قریب جا کر عائشہ کی نبض دیکھی۔ نبض آہستہ چل رہی تھی۔ تپائی پر چائے کی پیالی میں ابھی تھوڑی سی چائے باقی تھی۔ فیروز نے ٹیبل لیمپ کو جلتے رہنے دیا۔ تیزی سے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں گیا۔ وہاں سے بریف کیس اٹھا کر واپس عائشہ کے بیڈ روم میں آیا۔ بریف کیس میں سے نائیلون کی باریک رسی نکال کر عائشہ کے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیے۔ کیونکہ ہوش کی حالت میں وہ اس شیرنی کا کمانڈو ایکشن دیکھ چکا تھا۔ یہ لڑکی آسانی سے قابو میں آنے والی چیز نہیں تھی۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی فیروز کمرے سے نکل کر برآمدے میں سے گزرتا باغیچے کی جھاڑیوں کے ساتھ ساتھ ہوتا بنگلے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ رات کو گیٹ پر تالا ڈال دیا جاتا تھا اور کوئی پہرے دار وہاں نہیں ہوتا تھا۔ بارش پھوار کی شکل میں ہو رہی تھی۔ فیروز نے گیٹ پر جلتے بلب کی روشنی میں ایک انسانی سائے کو بائیں جانب کے درختوں سے اپنی طرف آتے دیکھا۔ یہ شہاب تھا۔ گیٹ کے بنگلے کی ایک جانب لگ کر وہ جلدی جلدی باتیں کرنے لگے۔ پھر فیروز نے لوہے کی سلاخ کی مدد سے گیٹ کا تالا بھی کھول دیا۔ شہاب اندر آگیا وہ سڑک سے ہٹ کر اونچی جھاڑیوں کے پیچھے سے ہوتے ہوئے عائشہ کے کمرے میں آگئے۔ اب وہ ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ شہاب نے صرف اتنا کیا کہ بے ہوش عائشہ کے منہ پر اس کے ریشمی دوپٹے کی پٹی باندھ دی اس خیال سے کہ اگر اسے ہوش آجائے تو وہ شور نہ مچا سکے۔ انہوں نے عائشہ کو کمبل میں لپیٹ کر اٹھایا اور بجائے سامنے کی طرف سے باہر نکلنے کے وہ بیڈ روم کے عقبی دروازے سے گزر کر عقبی باغیچے کے نیم اندھیرے میں سے ہوتے ہوئے نیچے اترائی اترنے لگے۔

بنگلے سے تھوڑا آگے سڑک کے کنارے شہاب نے مری والی ایمبولینس کھڑی کر رکھی تھی۔ انہوں نے عائشہ کو ایمبولینس گاڑی کے اندر سیٹ پر لٹا دیا۔ دروازہ بند کر کے وہ اگلی سیٹوں پر آکر بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر بعد کوہ مری کے ایک کلینک سے اٹھائی ہوئی یہ ایمبولینس گاڑی ڈھلان پر بڑی تیزی سے رات کے اندھیرے میں راولپنڈی کی طرف

دوڑی چلی جا رہی تھی۔ جب گاڑی مری کے بلند پہاڑی سلسلے سے نکل کر چھتر پہنچی تو سڑک پر رکاوٹ لگی تھی۔ فیروز نے کہا۔

"دو سپاہی کھڑے ہیں۔ گھبرانا بالکل نہیں میں اپنی بیٹی کو اسپتال لے کر جا رہا ہوں۔"

گاڑی سڑک پر لگی رکاوٹ کے پاس آکر رک گئی۔ دونوں سپاہی گاڑی کی طرف آئے۔

"کہاں سے آرہے ہو؟" ایک سپاہی نے گاڑی کی کھڑکی کے پاس آکر شہاب سے پوچھا۔ شہاب نے وہی جواب دیا جو اسے کہنا چاہئے تھا۔ سپاہی کے کاندھے پر رائفل لگی تھی اس نے شہاب کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"پیچھے آکر دروازہ کھولو۔"

فیروز نے دونوں سپاہیوں کو باتوں میں لگا لیا۔

وہ شہاب کو موقع دینا چاہتا تھا کہ وہ گاڑی کے اندر جا کر بے ہوش عائشہ کے منہ پر بندھی ہوئی پٹی کھول ڈالے۔ شہاب نے ایسا ہی کیا وہ لپک کر گاڑی کے پیچھے آیا۔ دروازہ کھولا اور اندر جاتے ہی عائشہ کے منہ سے پٹی کھول دی۔ پھر باہر آ کر اپنی طرف آتے سپاہی کی طرف متوجہ ہو کر آواز کو غمناک بنا کر بولا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری بیوی کو کیا ہو گیا ہے۔ بس پیٹ میں درد اٹھا اور بے ہوش ہو گئی۔ مری وا۔ لے ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ اسے جتنی جلدی ہو سکے پنڈی اسپتال لے جاؤ۔ انہوں نے اپنی ایمبولینس گاڑی بھی ہمیں دے دی۔"

سپاہی نے گردن اندر ڈال کر دیکھا۔ ایک لڑکی سیٹ پر کمبل میں لپٹی بے ہوش پڑی تھی۔ سپاہی جلدی سے پیچھے ہٹ گیا اور جانے کا اشارہ کیا۔ فیروز بھی افسردہ سی شکل بنا کر وہیں کھڑا تھا۔ سپاہی کا اشارہ پاتے ہی انہوں نے گاڑی کا عقبی دروازہ بند کیا اگلی سیٹوں پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور وہاں سے نکل گئے۔

وہ پنڈی پہنچ کر بالکل نہ رکے بلکہ پچھلی رات کی سنسان سڑکوں پر آگے ہی آگے نکلتے چلے گئے۔ راستے میں ایک جگہ سے انہوں نے گاڑی میں پٹرول ڈلوایا اور دوبارہ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ رات کے پچھلے پہر فیروز نے گاڑی سڑک سے نکال کر ایک سنگلاخ علاقے میں ڈال دی۔ اس علاقے سے گزرے تو بائیں جانب کھیت آ گئے۔ یہاں موسم خوشگوار تھا۔ آسمان پر تارے جھلملا رہے تھے۔ موسم میں تھوڑا حبس تھا۔ گاڑی آگے نکلتی چلی گئی۔ یہ علاقہ بالکل غیر آباد تھا۔ زمین بنجر اور شور زدہ تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں نا؟" فیروز نے گاڑی کی ہیڈ لائیٹس میں سامنے کی طرف گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"بالکل ٹھیک جا رہے ہیں۔ بس ہم پہنچنے ہی والے ہیں۔" نشیب میں ایک نیم پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا جس کے کنارے زمین کے ساتھ ہی ملے ہوئے تھے۔ پانی ٹخنوں تک ہو گا۔ گاڑی نالے میں سے نکل گئی۔ سامنے ذرا داہنی جانب ایک ٹیلا تھا فیروز گاڑی کو ٹیلے کے پیچھے لے آیا۔ یہاں ایک قد آدم چار دیواری تھی جس کا لکڑی کا بوسیدہ گیٹ بند تھا۔ فیروز نے گاڑی ایک طرف کھڑی کی۔ دونوں گاڑی سے اتر آئے۔ اندر سے ایک شخص نے گاڑی کو آتا دیکھ لیا تھا۔ اس شخص نے سر پر رومال لپیٹ رکھا تھا۔ اس نے گیٹ کھول دیا۔ فیروز نے آگے بڑھ کر کہا۔

"شامدو اندر ہی ہے نا؟" وہ شخص بولا۔ "تمہارا انتظار کر رہا ہے۔" وہ گاڑی احاطے کے اندر لے گئے۔ یہاں گارے اور پتھروں سے بنا ہوا ایک پرانا دو منزلہ مکان تھا جس کے باہر دروازے پر لالٹین جل رہی تھی۔ شامدو گاڑی کی آواز سن کر باہر نکل آیا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا مضبوط جسم والا آدمی تھا۔ فیروز آگے بڑھ کر اس سے بغلگیر ہوا۔ شہاب کو متعارف کرایا۔ شامدو بولا۔

"سب ٹھیک ہے نا؟"

فیروز نے گردن اثبات میں ہلائی۔ "سب ٹھیک ہے لالا۔ ادھر آؤ ذرا۔" ایمبولینس میں سے انہوں نے مل کر بے ہوش عائشہ کو نکالا اور مکان کے اندر لے جا کر چارپائی پر لٹا دیا۔ شامدو کہنے لگا۔ "اب اس کے ہاتھ کھول دو، ہوش میں آ بھی گئی تو یہاں سے زندگی بھر باہر نہ نکل سکے گی۔" فیروز نے عائشہ کے ہاتھ کھول دیے۔ شہاب نے کچھ سوچ کر کہا۔

"یہ بڑی شیرنی قسم کی عورت ہے۔ اس کا کچھ پتا نہیں کیا کر بیٹھے؟" فیروز نے کہا۔

"مگر اسے ابھی ہوش کہاں آئے گا۔ دوائی کا اثر کم از کم چوبیس گھنٹے تک رہے گا۔" شامدو کہنے لگا۔

"ہوش میں آ کر یہ کیا کرے گی۔ ایسی کہاں کی شیرنی ہے یہ۔ ایسی کئی عورتوں کو تو میں ہاتھوں ہاتھ کہاں سے کہاں پہنچا چکا ہوں۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ دروازے پر تالا لگ جائے گا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اور باہر میرا باڈی گارڈ پہرہ دے گا۔ اب تم لوگ آرام کرو۔ صبح بات کریں گے۔" شامدو نے کوٹھری کا دروازہ بند کر کے باہر تالا ڈال دیا۔ وہی آدمی جس نے احاطے کا گیٹ کھولا تھا بندوق لیے باہر پہرے پر بیٹھ گیا۔ فیروز اور شہاب اپنے دوست شامدو کے ساتھ دوسرے کمرے میں سونے چلے گئے۔ اس وقت مشرقی افق پر صبح کا ہلکا ہلکا نور پھیلنے لگا تھا۔

کوہ مری کے راستے میں روبی ہاؤس میں بھی صبح ہو رہی تھی۔ شیر خان اپنے بیڈ روم میں سو رہا تھا۔ نوکروں کے کوارٹر میں روشنی ہو رہی تھی۔ خانساماں جاگ چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ عائشہ بی بی صبح صبح اٹھ کر چائے پیتی ہے اور اس کے بعد وضو کر کے نماز پڑھتی ہے۔ خانساماں کچن کی طرف آیا تو اس کی نگاہ عائشہ بی بی کے بیڈ روم کی طرف گئی۔ کھڑکیوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ عائشہ بی بی جاگ چکی ہے۔ وہ جلدی سے کچن میں آیا بتی جلا کر آگ روشن کی اور چائے کے لئے گرم پانی رکھ دیا۔ اس کا یہ معمول تھا کہ صبح جب عائشہ کے واسطے بیڈ ٹی لے کر جاتا تو رات کے چائے کے برتن واپس لے آتا تھا۔ رات بھر کی بارش کے بعد آسمان صاف ہو گیا تھا اور سردی بڑھ گئی تھی۔

خانساماں نے چھوٹی چینک میں چائے دم کر کے ٹرے میں رکھی اور عائشہ کے بیڈ روم کی طرف چلا۔ روز کی طرح خانساماں نے دروازے پر دو بار آہستہ سے دستک دی۔ جب وہ دستک دیتا تھا تو اندر سے عائشہ کی آواز آتی تھی کہ آجاؤ بابا۔ خانساماں نے چار پانچ مرتبہ دستک دی مگر اندر سے کوئی آواز نہ آئی۔ اس وقت تک دن کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ خانساماں نے غور سے دیکھا۔ دروازہ پوری طرح سے بند نہیں تھا۔ بلکہ دونوں کواڑوں کے درمیان تھوڑی سی درز تھی۔ اس نے سوچا ہو سکتا ہے عائشہ بی بی صبح کی تازہ ہوا میں تھوڑی دیر کو ٹہلنے کے لئے باہر آگئی ہو اور واپس جاتے وقت دروازہ پوری طرح سے بند نہ کیا ہو۔ اس نے دوبارہ دستک دی اور اس بار عائشہ بیٹی کہہ کر آواز بھی دی۔ اس کے باوجود جب اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو خانساماں کو خیال آیا کہ عائشہ بی بی ضرور قرآن پاک پڑھ رہی ہو گی۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔

کمرے میں ٹیبل لیمپ کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ عائشہ کا بستر خالی تھا۔ قالین پر بیڈ کے قریب اس کی کتاب گری ہوئی تھی۔ خانساماں کو تب بھی کوئی شک نہ ہوا۔ اس نے چائے تپائی پر رکھی۔ خالی برتن والا ٹرے اٹھایا اور یہ سوچتا ہوا باہر نکل آیا کہ عائشہ بی بی ضرور بنگلے کے عقبی باغیچے میں سیر کر رہی ہو گی۔ مگر اتنی سردی میں وہ کیسے سیر کر سکتی ہے؟ یہی سوچتا وہ کچن میں آیا۔ خالی برتن وہاں رکھے اور عقبی باغیچے میں آکر عائشہ کو ادھر ادھر تلاش کرنے لگا۔ اس نے بنگلے کا کونا کونا چھان مارا۔ عائشہ کہیں بھی نہ تھی۔ اب وہ کچھ فکر مند ہوا۔ وہ سیدھا شیر خان کے بیڈ روم کی طرف گیا۔ دروازے پر دستک دی۔ شیر خان جاگا ہوا تھا اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے خانساماں کو دیکھ کر بولا۔

"کیا بات ہے بابا۔" خانساماں نے کہا۔

"خان جی! عائشہ بیٹی کہیں نظر نہیں آرہی بستر خالی ہے۔" پورا گھر دیکھ ڈالا مگر کچھ پتا نہیں۔" شیر خان بولا۔

"اوپر درختوں میں سیر کرنے نہ چلی گئی ہو۔ ابھی آجائے گی۔" خانساماں نے کہا۔

"بی بی اوپر سیر کرنے کبھی نہیں جاتی۔" شیر خان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس کی بیٹی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ اس نے کہا۔

"بھئی بچی کا موڈ آگیا ہو گا وہ اوپر درختوں میں سیر کو چلی گئی ہو گی۔ تم میرے دوستوں کو جا کر چائے دو۔ میں ابھی آرام کروں گا۔" خانساماں چلا گیا۔ شیر خان واپس بستر پر آکر لحاف میں گھس گیا اور ایک بار پھر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ اپنی بیٹی عائشہ کے اغوا ہو جانے کا تو تصور بھی اس کے ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ چار پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ "کون ہے بھئی؟" اس کے سوال کے جواب میں خانساماں کی آواز آئی۔

"خان جی! مہمان تو چلے گئے ہیں۔" شیر خان ایک لمحے کے لئے ساکت سا ہو گیا۔ جلدی سے لحاف سے نکلا اور باہر آکر خانساماں سے کہا۔

"صبح صبح یہ لوگ کہاں چلے گئے اتنی سردی میں؟" خانساماں یہ کہتا ہوا ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

"پتا نہیں خان جی! ان کا بریف کیس وغیرہ بھی وہاں نہیں ہے۔" شیر خان گیسٹ ہاؤس میں شہاب اور فیروز والے کمرے میں گیا تو وہ خالی پڑا تھا۔ الماری کا پٹ کھلا ہوا تھا۔ اندر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ان دونوں کے کپڑے بھی نہیں تھے۔ بریف کیس بھی موجود نہیں تھا۔ شیر خان تیزی سے باہر نکل آیا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنی بیٹی کے بیڈ روم میں آگیا۔ اس نے غور سے کمرے کی ایک ایک چیز کو دیکھا۔ اس کا پرانا جرائم پیشہ دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ عائشہ کی کتاب قالین پر پڑی تھی۔ اس کا کمبل اس طرح آدھا بیڈ سے نیچے لٹک رہا تھا جیسے کسی کو بیڈ سے کھینچا گیا ہو۔

اسی اثنا میں شیر خان کے دیرینہ ملازم بھی اٹھ گئے تھے۔ سب نے جہاں جہاں متوقع ہو سکتا تھا اندر باہر دیکھا۔ عائشہ کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ عائشہ کے سلیپر بیڈ کے پاس ہی پڑے تھے۔ شیر خان نے بیٹی کی جوتیاں چیک کیں۔ اس کی ساری جوتیاں الماری میں پڑی تھیں۔ وہ ننگے پاؤں باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ شہاب اور فیروز بھی غائب تھے۔ شیر خان کا ذہن ایک نتیجے پر پہنچ گیا تھا مگر اسے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ شہاب اور فیروز جن کے ساتھ اس نے اتنا اچھا سلوک کیا تھا اور عائشہ کو بیٹی بیٹی کہتے جن کی زبان نہیں تھکتی تھی وہ عائشہ کو اغوا کر کے فرار ہو گئے ہیں۔ اس کا خون کھول رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کا جسم پھٹ جائے گا۔ مگر شیر خان نے بڑے تحمل سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالا۔ سب نوکروں کو اپنے کمرے میں بلایا اور کہنے لگا۔

"میں تمہیں اپنے گھر کے آدمی کی طرح سے سمجھتا ہوں۔ میں تم لوگوں سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ میں تمہیں واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ میری بیٹی اغوا ہو گئی ہے اور اسے ان لوگوں نے اغوا کیا ہے جو کسی زمانے میں میرے ساتھی رہ چکے تھے۔ اور اب مجھ سے اپنا حصہ مانگنے آئے تھے جو ایک ناجائز مطالبہ تھا۔ کیونکہ تم لوگ بھی اور اس علاقے کے سارے لوگ گواہ ہیں کہ میں نے یہ دولت اپنی محنت اور عزت سے کمائی ہے۔ میں نے شہر کے ایک صراف کے ہاں نوکری کر کے اپنی نئی زندگی کا آغاز کیا اور محنت اور دیانتداری سے کام کر کے آج یہاں تک پہنچا۔ چنانچہ میں نے اپنے پرانے ساتھیوں سے کہا کہ میری طرف ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ وہ لوگ مطمئن بھی ہو گئے۔ لیکن یہ سب کچھ انہوں نے ظاہر داری سے کیا۔ اندر ہی اندر وہ مجھ سے بدلہ لینے کا پروگرام بناتے رہے اور جہاں تک میرا خیال ہے وہی لوگ مجھ سے بدلہ لینے کے واسطے میری بیٹی کو اغوا کر کے کہیں لے گئے

ہیں۔ مجھے اپنی بیٹی پر اعتماد ہے۔ میں نے اسے جو تربیت دی ہے وہ ضائع نہیں جائے گی۔ میری بیٹی ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اپنی عزت کی حفاظت کرے گی اور اگر وہ کسی مقام پر بے بس ہو گئی تو بڑی آسانی سے موت کو گلے لگا لے گی مگر اپنی عزت پر داغ نہیں لگنے دے گی۔ لیکن میں اس کا باپ ہوں۔ میں خاموش نہیں بیٹھ سکتا۔ میں اپنی بچی کی عزت اور اس کی جان بچانے کے لئے وقت پڑنے پر اپنی جان بھی قربان کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔ میں کیا کرنے والا ہوں؟ اس بارے میں تم لوگوں کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ مگر تم سے صرف ایک وعدہ لوں گا کہ میری بچی کے اغوا کی خبر اس گھر کی چاردیواری سے باہر نہیں جائے گی۔ کیا تم مجھ سے یہ وعدہ کرتے ہو؟"

شیر خان کے جو چار چھ ملازم تھے وہ اس کے انتہائی وفادار تھے۔ سب نے ایک زبان ہو کر خدا کو حاضر ناظر جان کر وعدہ کیا کہ وہ بیٹی عائشہ کے اغوا کے بارے میں اپنی زبان پر ایک لفظ بھی نہیں آنے دیں گے۔ شیر خان بولا۔

"بس میں تم سے یہی چاہتا ہوں۔ میں پولیس کو بھی اطلاع نہیں کروں گا۔ ہم یہی کہیں گے کہ عائشہ اپنی خالہ سے ملنے بحرین گئی ہوئی ہے۔ اس سے زیادہ کوئی کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔ باقی میں جانوں اور میرا خدا۔ تم لوگ اس سے زیادہ ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالو گے۔ بس اب تم جاؤ اور جس طرح روز کام کرتے ہو اسی طرح کام کرو۔ جیسے کچھ نہیں ہوا۔"

نوکروں نے ایک بار پھر شیر خان کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور اپنے اپنے معمول کے کام میں لگ گئے خانساماں کی بوڑھی بیوی نے عائشہ کا کمرہ ٹھیک کر دیا۔ شیر خان نے وہاں تالا لگا کر چابی اپنی جیب میں رکھ لی۔ پھر وہ اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔ وہ اپنی بیٹی کے اغوا پر ایک ایسا آتش فشاں بن گیا تھا جس کے اندر کھولتا ہوا لاوا دھماکے سے پھٹنے ہی والا ہو۔ ایسی صورتحال میں اگر کوئی چیز اس کی مضطرب روح کو کسی حد تک تسکین بخش رہی تھی تو وہ یہ یقین تھا کہ عائشہ اپنی عزت اپنے ناموس کی خاطر مر جائے گی۔ اور مرنے سے پہلے دو چار آدمیوں کو ضرور ہلاک کر دے گی۔ شیر خان نے اسے ایسی ہی تربیت دی تھی اور اسے اپنی تربیت پر اور شیرنی کی بیٹی اپنی بیٹی عائشہ

پر پورا بھروسہ تھا۔ وہ نہ پولیس میں رپورٹ کرنا چاہتا تھا اور نہ کسی کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی اغوا ہو گئی ہے وہ عائشہ کی تلاش میں خود نکلنا چاہتا تھا۔

جب دن کی روشنی خوب پھیل گئی تو شیر خان خود بنگلے کے گیٹ پر آیا۔ یہاں پتھریلے راستے پر باریک بجری بچھی ہوئی تھی جس پر قدموں کے نشان نہیں پڑتے تھے۔ وہ نیچے سڑک پر آگیا۔ سڑک پکی تھی مگر رات بھر کی بارش نے اسے دھو کر صاف کر دیا تھا۔ وہ ذرا آگے گیا تو اسے ایک طرف کیچڑ میں گاڑی کے ٹائروں کے نشان دکھائی دیے یہ نشان سڑک کے کنارے سے نکل کر سڑک پر راولپنڈی کی طرف دور تک چلے گئے تھے۔ جس وقت شہاب اور فیروز عائشہ کو گاڑی میں ڈال کر لے گئے تھے اس وقت بارش رکی ہوئی تھی اور بعد میں بھی بارش نہیں ہوئی تھی۔ شیر خان ایک طرف کھڑا ہو کر سوچنے لگا۔

شہاب اور فیروز اس کی بیٹی کو گاڑی میں ڈال کر پنڈی کی طرف گئے ہیں۔ شہاب گاڑی لانے کے واسطے ہی کوہ مری گیا تھا۔ مگر شیر خان حیران تھا کہ عائشہ اتنی آسانی سے کیسے اغوا ہو گئی اس نے آواز تک نہ نکالی۔ وہ تو پستول اپنے سرہانے کے نیچے رکھ کر سوتی تھی۔ اس کا مطلب یہی نکلتا تھا کہ شہاب وغیرہ نے عائشہ کو اٹھانے سے پہلے کسی طریقے سے بے ہوش کیا ہو گا۔ شہاب اور فیروز کے اس علاقے میں زیادہ جاننے والے بھی نہیں ہیں۔ پھر وہ عائشہ کو کہاں لے کر گئے ہوں گے؟ شیر خان اسی قسم کے خیالات میں الجھا واپس بنگلے میں آگیا۔ اس نے راولپنڈی جانے کی تیاری شروع کر دی۔

دوسری طرف شہاب اور فیروز اپنے میزبان شامدو کی دور افتادہ پناہ گاہ میں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ عائشہ اندر کوٹھری میں بے ہوش پڑی تھی۔ شامدو کہنے لگا

"تمہیں نزدیکی شہر میں جا کر لڑکی کے باپ کو ٹیلی فون کر دینا چاہیے۔" شہاب نے فیروز کی طرف دیکھا۔

"کیا خیال ہے پھوجے؟ شامدو بھائی کا مشورہ بڑا مناسب ہے۔ شیر خان کے گھر فون لگا ہوا ہے اور میری کاپی میں اس کے گھر کا فون نمبر بھی لکھا ہوا ہے۔" فیروز نے ایک پل کے لئے کچھ سوچا پھر بولا۔

"مناسب خیال ہے۔ میں ابھی شہر جا کر فون کرتا ہوں۔ شیر خان نے پولیس کو اطلاع

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں دی ہو گی۔ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ اس طرح سے اس کی بڑی بدنامی ہو گی۔" شہاب بولا۔

"یہ بات ہمارے حق میں جاتی ہے۔ تم جلدی سے تیار ہو کر شہر کی طرف نکل جاؤ۔"

"مگر لڑکی کو ابھی تک ہوش نہیں آیا۔" فیروز نے کسی قدر تشویش کے ساتھ کہا۔

"کہیں میں نے دوائی کی زیادہ مقدار تو نہیں پلا دی؟" شہاب کہنے لگا۔

"اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ لڑکی مر بھی گئی تو ہم شیر خان کو تھوڑی بتائیں گے ہم اس سے اپنے حصے کی پوری رقم کا مطالبہ کریں گے رقم مل گئی تو لڑکی زندہ یا مردہ اس کے حوالے کر کے یہاں سے نکل جائیں گے۔" شامدو نے فیروز کو پوری طرح سے سمجھا دیا کہ اسے شہر کے پبلک ٹیلی فون سے فون کرنا ہو گا اور یہ ٹیلی فون اسے پوسٹ آفس میں ہی ملے گا۔ تھوڑی دیر بعد فیروز نے گاڑی نکالی اور شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

ادھر شیر خان بھی پنڈی جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا اس نے اپنا لائسنس والا پستول کمر کے ساتھ باندھ لیا تھا۔ وہ سب سے پہلے پنڈی کے ایک ایسے آدمی سے ملنا چاہتا تھا جو کسی زمانے میں جرائم پیشہ گروہ کا سرغنہ رہ چکا تھا مگر اب وہ شریفانہ زندگی گزار رہا تھا۔ وہاں سے شیر خان کو شہاب اور فیروز کا کوئی سراغ مل سکتا تھا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں آیا۔ یہاں اس کی بیوی روبی کی تصویر لگی تھی۔ اس نے تصویر کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا اور کہا

"میں قسم کھاتا ہوں کہ عائشہ کو ہر قیمت پر واپس لاؤں گا اور جنہوں نے اسے اغوا کیا ہے ان کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کروں گا۔ بس میں اس سے زیادہ تمہیں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔" یہ کہہ کر وہ واپس دروازے کی طرف مڑا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ شیر خان ٹھٹک سا گیا۔ ہو سکتا ہے پنڈی والے آفس سے کسی نے فون کیا ہو۔ اس نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے فیروز کی آواز آئی۔

"شیر خان! تم نے میری آواز پہچان لی ہو گی۔ تمہاری بیٹی ہمارے پاس ہے۔ آگے بولنے کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میری بات غور سے سنو ہمیں تمہاری بیٹی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ جس طرح تمہارے گھر میں تھی اسی طرح ہمارے پاس بطور یرغمال محفوظ ہے۔ ہمیں ہمارے حصے کی رقم ادا کر دو۔ تمہاری بیٹی تمہیں واپس کر دی جائے گی۔" شیر خان کے کان سرخ ہو رہے تھے۔ اس نے اپنے جذبات پر قابو پانے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"تم کتنی رقم مانگتے ہو؟" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"صرف ایک کروڑ امریکی ڈالر" فیروز نے کہا۔

"یہ رقم تمہیں کس طرح پہنچائی جائے؟" شیر خان نے کہا۔

"ساری تفصیل تمہیں شام کو بتا دی جائے گی۔ یاد رکھو۔ اگر تم نے پولیس کو اطلاع کی تو تمہیں اپنی بیٹی کی لاش کے ٹکڑے گھر واپس لے جانے ہوں گے۔" فیروز بولا۔

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تم مجھے بتاؤ عائشہ کو لے کر کہاں آؤ گے۔ میں رقم لے کر آجاؤں گا۔" شیر خان نے کہا۔

"تمہیں کہہ دیا ہے کہ شام کو تمہیں سب کچھ ٹیلی فون پر بتا دیا جائے گا۔ پانچ سے چھ بجے شام کے درمیان میں پھر فون کروں گا۔" اس کے ساتھ ہی ٹیلی فون بند ہو گیا۔

شیر خان نے ریسیور رکھا اور قریبی صوفے پر بیٹھ گیا۔ اب اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ شہاب اور فیروز نے ہی اس کی بیٹی کو اغوا کیا ہے اور اسے یرغمالی بنا کر رکھا ہوا ہے۔ عزت کے آگے ایک کروڑ ڈالر کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ شیر خان نے اسی وقت پنڈی آفس میں اپنے خاص آدمی کو فون کیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ بینک میں سے مطلوبہ رقم نکلوا کر آفس کے سیف میں بند کر کے رکھ دے۔ فیروز نے تو صرف ایک کروڑ ڈالر طلب کیے تھے اگر وہ اس کی ساری دولت بھی مانگ لیتا تو شیر خان اپنی بیٹی اپنے ناموس کی خاطر اپنی ساری دولت اس کے حوالے کر دیتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی شیر خان نے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ شہاب اور فیروز کو زندہ نہیں رہنے دے گا۔ وہ کمرے سے باہر آگیا۔ اس نے خانساماں سے کہا کہ وہ پنڈی جا رہا ہے۔ دوپہر تک واپس آجائے گا۔

اس نے گاڑی نکالی اور خود ڈرائیو کرتے ہوئے وہ راولپنڈی کی طرف چل پڑا۔

جب فیروز نے شامدو کے ڈیرے پر آکر شہاب کو بتایا کہ شیر خان ایک کروڑ امریکی ڈالر ادا کرنے پر راضی ہو گیا ہے تو وہ بڑا خوش ہوا۔ کہنے لگا۔

"یار دو کروڑ ڈالر کہہ دیتے تھے۔" فیروز آنکھ مار کر بولا۔

"اتنے ہی کافی ہیں۔ ہم ان ڈالروں سے واپس ہانگ کانگ جا کر اپنا الگ دھندا شروع

کر سکتے ہیں۔ میں نے شیر خان کو پانچ بجے شام کا وقت دیا ہے۔ اب یہ طے کرنا ہے کہ رقم کہاں وصول کر کے عائشہ کو اس کے حوالے کیا جائے۔ کیا اسے ہوش آگیا؟" شہاب نے کہا۔

"نہیں وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔ ہم نے نالی کے ذریعے دودھ پلا دیا ہے۔"

فیروز فکر مند ہو گیا۔

"اسے اب تک ہوش آجانا چاہئے تھا۔" شامدو نے پوچھا۔

"تم نے اسے کتنی دوائی پلائی تھی؟" فیروز بولا۔

"بس اتنی ہی جتنی بے ہوش کرنے کے لئے کافی تھی۔" شامدو نے کہا۔

"میرے خیال میں تم نے خوراک زیادہ دے دی ہے۔"

شہاب بولا۔

"یار بے ہوش ہی ہے نا۔ مرتو نہیں گئی۔ تم اب یہ سوچو لالے کہ شیر خان کو کہاں بلایا جائے؟ اس نے کہیں پولیس کو رپورٹ تو نہیں کی؟" فیروز نے کہا۔

"نہیں۔ میں نے اسے خبردار کر دیا ہے کہ اگر پولیس کو خبر کی گئی تو اسے بیٹی کی لاش کے ٹکڑے ہی ملیں گے۔"

شامدو شہاب اور فیروز تینوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور اس جگہ کے تعین کے بارے میں سوچنے لگے جہاں انہیں شیر خان سے مطلوبہ رقم حاصل کر کے اس کی بیٹی اس کے حوالے کرنی تھی۔ شامدو اس علاقے کا آدمی تھا۔ اس نے ایک جگہ طے کر دی۔ جب جگہ کا تعین ہو گیا تو شامدو کہنے لگا۔

"اب تم وہاں سے شیر خان کو فون نہیں کرو گے جہاں سے تم نے صبح فون کیا تھا۔ تم اس جگہ سے دس میل آگے ایک دوسرے شہر میں جاؤ گے۔ وہاں بھی تمہیں ڈاک خانے والوں کا ایک ٹیلی فون کا کھوکھا مل جائے گا۔ اس علاقے کے ایک وزیر اعلیٰ نے کسی زمانے میں ٹیلی فون کا سلسلہ بڑا زبردست کر دیا تھا۔ یہ میں تمہیں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ اگر شیر خان نے فون کے بارے میں پولیس کو اطلاع بھی کر دی ہو گی تو تم جگہ بدل کر جب فون کرو گے تو تمہارے علاقے کی نشاندہی نہیں ہو سکے گی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہاب اور فیروز نے شامدو کی زیرکی کی داد دی۔ اب وہ بے تابی سے دوپہر ڈھلنے کا انتظار کرنے لگے۔ دوسری طرف شیر خان بھی بے چینی سے شام ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ مطلوبہ رقم اس کے خاص منیجر نے بینک سے نکلوا کر آفس کے تہہ خانے والی لوہے کی الماری میں بند کر دی تھی۔ پولیس کو خبر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شیر خان کو رقم کا تھیلا گاڑی میں ڈال کر طے شدہ جگہ کی طرف روانہ ہو جانا تھا۔ وہاں رقم شہاب اور فیروز کے حوالے کرنی تھی اور عائشہ کو ان سے واپس لے لینا تھا۔ ہاں اس کے بعد شیر خان نے موقع پا کر ان دونوں جرائم پیشہ آدمیوں کو موت کے گھاٹ ضرور اتارنا تھا۔

یہ شیر خان کی غیرت گوارا ہی نہیں کر سکتی تھی کہ کوئی آدمی اس کی بیٹی کو اٹھا کر لے جائے اور پھر وہ دنیا میں زندہ حالت میں چلتا پھرتا بھی نظر آئے۔ اس مقصد کے لئے شیر خان نے بھرا ہوا پستول گاڑی کے ڈیش بورڈ میں پہلے ہی سے چھپا کر رکھ دیا تھا۔

ادھر تجربہ کار شامدو نے بھی شہاب اور فیروز کو خبردار کر دیا تھا کہ ایسے معاملوں میں دشمن پر کبھی اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے شیر خان نے پولیس کو خبر کر رکھی ہو اور پولیس وہیں کہیں چھپ کر بیٹھی ہو۔ یا پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شیر خان بیٹی کو واپس لے لینے کے بعد غیرت میں آکر تم دونوں کو قتل کرنے کی کوشش کرے۔ اس لئے تمہیں چاروں طرف سے چوکس ہو کر اور پورا انتظام کر کے طے شدہ جگہ پر جانا ہو گا۔" فیروز نے کہا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو لالا۔ ہم اس کی ساری چال بازیوں کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔" شہاب کہنے لگا۔

"مگر لڑکی کو ابھی تک ہوش نہیں آیا۔ اس طرح سے معاملہ گڑبڑ ہو سکتا ہے۔" اس کے بعد وہ تینوں اس کوٹھری میں گھس گئے۔ جہاں چارپائی پر عائشہ بالکل ویسی ہی حالت میں بے سدھ پڑی تھی۔ اسے تین بار انڈا پھینٹ کر دودھ پلا دیا گیا تھا۔ شہاب نے عائشہ کی آنکھوں کو کھول کر دیکھا آنکھیں بے جان سی تھیں۔

"نبض تو دیکھو اس کی۔" شہاب نے گھبرا کر کہا۔ فیروز نے نبض دیکھی اور بولا۔

"زندہ ہے یار۔ جسم بھی گرم ہے۔ لگتا ہے میں نے دوائی کچھ زیادہ ہی چینک میں

ڈال دی تھی۔" شامدو کہنے لگا۔

"ایک گھنٹہ اور دیکھ لیتے ہیں۔ اگر پھر بھی ہوش نہ آیا تو میں قصبے سے اپنے ایک راز دار حکیم جی کو بلا لاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" فیروز نے آہستہ سے کہا اور وہ تینوں کوٹھری سے باہر نکل آئے۔

اس وقت عائشہ کو ہوش آ چکا تھا۔ مگر اس نے جان بوجھ کر آنکھیں اوپر چڑھا لی تھیں۔ جب کوٹھری خالی رہ گئی تو عائشہ نے آنکھیں کھول کر اوپر روشندان سے آتی دن کی روشنی کی طرف دیکھا اس روشنی کو وہ آدھ گھنٹہ پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ یعنی اسے ہوش میں آئے آدھا گھنٹہ ہوا تھا۔ عائشہ سمجھ گئی تھی کہ اس کے ساتھ کیا کارگزاری ہوئی ہے۔ اس نے شہاب اور فیروز کو بھی دیکھ لیا تھا۔ رات کو اس نے جو چائے پی تھی اس میں بے ہوشی کی دوائی ملا دی گئی تھی۔ چائے پینے کے کچھ ہی دیر بعد اسے ایک زور دار چکر آیا تھا کہ پیشتر اس کے کہ وہ بستر سے اٹھ سکے کتاب اس کے ہاتھ سے گر گئی اور پھر اسے کوئی ہوش نہ رہا تھا۔ یہاں اس کوٹھری میں آدھا گھنٹہ پہلے جب اسے ہوش آیا تو اس پر یہ ہولناک حقیقت کھلی کہ اسے ہوش تو آ گیا ہے مگر وہ اپنے ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتی۔ اس کا خیال تھا کہ دوائی کا اثر آہستہ آہستہ زائل ہو رہا ہے اور اس کے ہاتھ پاؤں بھی ہوش میں آ جائیں گے مگر آدھا گھنٹہ گزر جانے پر بھی جب اس کے بازو اور دونوں ٹانگیں ویسی ہی سن رہیں تو اسے فکر لاحق ہوئی۔ خدا جانے ان لوگوں نے اسے کون سی دوائی پلا دی تھی۔ عائشہ کو اگرچہ اس کے باپ نے نہیں بتایا تھا مگر وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ یہ دونوں اسے یرغمالی بنا کر اس کے باپ سے کوئی رقم وصول کرنا چاہتے ہیں اور کچھ روز پہلے مری روڈ پر اس پر جو حملہ ہوا تھا وہ بھی اسی منصوبے کا شاخسانہ تھا مگر عائشہ نے دلیری سے کام لیتے ہوئے اس منصوبے کو ناکام بنا دیا تھا۔ اس نے تھوڑی سی کوشش کی اور چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مگر اس کی ٹانگیں ابھی تک سن تھیں۔ دونوں بازو بھی کہنیوں کے آگے سن ہو چکے تھے۔ وہ ذرا سا کھانسی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا گلا اس قدر خشک ہو گیا ہے کہ وہ اچھی طرح سے آواز بھی نہیں نکال سکتی۔ اسے باہر قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ جلدی سے چارپائی پر لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔ شہاب فیروز اور شامدو ایک بار پھر اندر داخل ہوئے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہاب عائشہ کی نبض ٹٹولنے لگا۔ اس خیال سے کہ یہ لوگ اس کے جسم کو زیادہ نہ ٹٹولنا شروع کر دیں عائشہ نے آنکھیں کھول دیں۔

ان لوگوں نے جب دیکھا کہ لڑکی کو ہوش آگیا تو وہ بڑے خوش ہوئے۔ فیروز نے بڑے صاف لفظوں میں کہا۔

"عائشہ! تم ہماری یرغمالی ہو۔ تمہارے باپ نے ہماری دولت سے سارا کاروبار شروع کیا تھا۔ ہم نے اس سے اپنا حصہ مانگا۔ اس نے انکار کیا۔ ہم تمہیں اٹھا کر یہاں لے آئے۔ اب تمہارا باپ ہمیں ہماری مطلوبہ رقم دے کر تمہیں ساتھ لے جانے پر راضی ہو گیا ہے۔ آج شام تم اپنے بنگلے پر واپس چلی جاؤ گی۔ بشرطیکہ شیر خان اپنے ساتھ پولیس کو نہ لایا۔ اگر پولیس اس کے ساتھ آئی تو ہم تمہیں تمہاری زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتے اب تم کھانا کھالو۔" عائشہ خاموشی سے ساری باتیں سنتی رہی پھر بیٹھی ہوئی خشک آواز میں بولی۔

"میری دونوں ٹانگیں اور کہنیوں کے نیچے دونوں بازو سن ہو گئے ہیں۔ میں انہیں ہلا جلا نہیں سکتی تم لوگوں نے مجھے کیا پلا دیا تھا؟"

شہاب نے فیروز کی طرف دیکھا فیروز بولا

"یہ بے ہوشی کی دوا کا اثر ہے۔ تھوڑی دیر بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس کے فوراً بعد وہ کوٹھری سے باہر آگئے۔ شہاب نے شامدو سے کہا۔

"جب تک لڑکی پر دوائی کا اثر ہے اس کی ٹانگیں سن ہیں تم کسی عورت کا بندوبست کر دو جو لڑکی کو کھانا وغیرہ بھی کھلائے اور اس کی صفائی وغیرہ کا بھی خیال رکھے۔ کیونکہ ابھی اسے چھ سات گھنٹے اس کوٹھری میں رہنا ہے۔" شامدو بولا۔

"ساتھ والے گاؤں میں میری ایک واقف اور بھروسے والی عورت رہتی ہے۔ وہ دایہ بھی ہے۔ میں ابھی جا کر اسے لے آتا ہوں۔" شامدو اسی وقت گھوڑے پر بیٹھ کر ساتھ والے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد واپس آیا تو دوسرے گھوڑے پر ایک پکی عمر کی بھاری جسم والی دیہاتی عورت بیٹھی تھی جس نے کالا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ شامدو نے اسے سب کچھ سمجھا دیا تھا۔ اسی وقت عائشہ کو اس عورت کے حوالے کر دیا گیا۔ جس نے

عائشہ کو تھوڑی روٹی بھی کھلائی اور اسے اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں مدد بھی کی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

جب سہ پہر کے چار بجے تو شیر خان ٹیلی فون کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کے کان بے تابی سے گھنٹی بجنے کا انتظار کرنے لگے۔ پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ شیر خان نے ریسیور اٹھا کر کان کے ساتھ لگاتے ہوئے کہا۔

"ہیلو۔" دوسری طرف سے فیروز کی شناسا آواز سنائی دی۔

"تم کون بول رہے ہو؟"

"شیر خان۔" شیر خان نے بڑی متانت کے ساتھ جواب دیا۔ فیروز نے کہا۔

"سنو شیرے!" شیر خان نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"پہلے یہ بتاؤ میری بیٹی کیسی ہے؟ میری اس سے بات کراؤ۔" عائشہ بالکل ٹھیک ہے ایک عورت اس کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ میں تمہیں ایک خاص جگہ پر آکر ٹیلی فون کر رہا ہوں۔ تم بہت جلد اپنی بیٹی کے پاس ہو گے۔ اب میری بات غور سے سنو۔ تمہیں مطلوبہ رقم ایک چھوٹے بریف کیس میں ڈال کر لانی ہو گی۔ تم پنڈی سے پشاور جانے والی سڑک پر روانہ ہو گے' سڑک پر جب....." فیروز نے جواب دیا۔

فیروز نے شیر خان کو سارا راستہ سمجھا دیا کہ اسے کہاں تک بڑی سڑک پر سفر کرنا ہے اور کہاں سے سڑک چھوڑ کر بائیں جانب گھوم جانا ہے۔ اور پھر کہاں پہنچ کر گاڑی سے باہر نکل کر مطلوبہ رقم والا بریف کیس گاڑی کے بونٹ پر رکھ کر وہاں سے کتنے گز کے فاصلے پر دونوں بازو کھول کر کھڑے ہو جانا ہے۔ شیر خان بڑے غور سے فیروز کی ایک ایک بات سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"ہم عائشہ کو گاڑی میں ڈال کر وہاں لائیں گے سب سے پہلے میں گاڑی سے باہر

نکلوں گا۔ عائشہ گاڑی میں بیٹھی رہے گی۔ تم کھڑکی میں اس کی شکل دیکھ سکو گے۔ اس کے بعد میں تمہاری گاڑی کے پاس آکر بونٹ پر رکھے بریف کیس کو کھول کر رقم چیک کروں گا جب میری تسلی ہو جائے گی تو میں بریف کیس وہیں رکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ جاؤں گا اور شہاب کو اشارہ کروں گا۔ شہاب تمہاری بیٹی کو لے کر گاڑی کی طرف آئے گا۔ اور تم اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑو گے اور ادھر میں مطلوبہ رقم والا بریف کیس اٹھالوں گا۔ اور پھر تم بیٹی کو لے کر وہاں سے نکل جاؤ گے۔ میں ایک بار پھر تمہیں متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ساتھ چالاکی کرنے کی کوشش نہ کرنا نہیں تو تمہاری بیٹی کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔"

شیر خان نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ تم جیسے کہہ رہے ہو میں ویسے ہی کروں گا۔ میں ابھی یہاں سے روانہ ہو رہا ہوں۔"

"ہم تمہارا انتظار کریں گے۔"

یہ کہہ کر فیروز نے فون بند کر دیا۔ دوسری طرف شیر خان نے بھی ریسیور فون پر رکھ دیا۔ اس کے جذبات میں ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ اس کی حالت اس شیر کی سی تھی جو لوہے کی موٹی سلاخوں والے تنگ پنجرے میں بند ہو اور جس کی آنکھوں کے سامنے اس کے بچوں کو ہلاک کیا جا رہا ہو۔ مگر وہ مجبور تھا۔ اونچی آواز میں بول بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ وہ کمرے میں بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ کبھی مٹھیاں بھینچتا کبھی کھول دیتا۔ اس کے پرانے دوستوں نے اسے دھوکا دیا تھا۔ اس کی عزت پر ڈاکا ڈالنے کی کوشش کی تھی وہ ان سے ایسا عبرت ناک انتقام لینا چاہتا تھا کہ ان کی آنے والی نسلیں صدیوں تک اسے بھلا نہ سکیں۔ مگر سب سے پہلے وہ اپنی بیٹی کو ان کے قبضے سے واپس لینا چاہتا تھا۔ مطلوبہ تاوان کی رقم شیر خان نے اپنے پاس رکھ لی تھی۔ بھرا ہوا پستول اس نے گاڑی کے ڈیش بورڈ میں چھپا دیا تھا تاکہ عائشہ کو اپنی حفاظت میں لینے کے فوراً بعد وہ شہاب اور فیروز کو یا جو کوئی بھی وہاں ہو گا اسے گولی سے اڑا کر اپنے انتقام کی آگ ٹھنڈی کر سکے۔

ان لوگوں نے رات کے پچھلے پہر کا وقت دیا تھا۔ اسی حساب سے شیر خان کو رات کے بارہ بجے کے بعد پنڈی سے روانہ ہو جانا تھا۔ گھر میں اس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تھی۔ رقم والا بریف کیس اس نے گاڑی کی اگلی سیٹ کے نیچے چھپا کر رکھ دیا۔ جب وہ رات بارہ بجے پنڈی سے روانہ ہونے لگا تو اس کے پنڈی والے آفس کا وفادار منیجر بھی جاگ رہا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کا مالک اتنی بھاری رقم لے کر کہاں جا رہا ہے مگر اتنا اندازہ اسے ہو گیا تھا کہ معاملہ خطرناک ہے اور اس کا مالک شیر خان جو ایک نہایت ایماندار اور شریف کاروباری آدمی ہے کسی بہت بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہے اور محض اپنی ساکھ کی وجہ سے پولیس کو کچھ نہیں بتا رہا۔

چنانچہ اس وفادار منیجر نے اپنے مالک شیر خان سے ہمدردی اور اس کی جان کی حفاظت کے خیال سے ایک گھنٹہ پہلے پولیس کو فون کر کے سارے حالات سے باخبر کر دیا تھا۔ انسپکٹر خالد نے منیجر کو ہدایت کی کہ وہ کسی سے کوئی بات نہ کرے۔ ہم خفیہ طور پر شیر خان کا پیچھا کریں گے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری لیتے ہیں اصل معاملے کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گے۔ انسپکٹر خالد بذات خود شیر خان کا بے حد احترام کرتا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ شیر خان پاکستان کا ایک ذمہ دار شریف النفس اور محب الوطن شہری ہے اور ضلع کی کئی رفاہ عامہ کی انجمنیں اس کے ڈونیشنز سے عوام کی خدمت کر رہی ہیں۔

چنانچہ جس وقت شیر خان اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اپنی بیٹی کو واپس لانے کے لئے شہر سے روانہ ہوا تو اس کے پیچھے پیچھے کچھ فاصلے پر انسپکٹر خالد بھی عام کپڑوں میں ایک پرانی گاڑی میں سوار چل پڑا۔ اگلے ضلع کی پولیس کو بھی چوکس کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ ابھی تک انسپکٹر خالد کو یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ شیر خان کی منزل کونسی ہے۔ انسپکٹر خالد کے ساتھ چار پولیس کمانڈو بھی عام کپڑوں میں بیٹھے تھے۔ ان کے پاس پستول تھے جو انہوں نے لباس کے اندر چھپا رکھے تھے۔ فیروز نے شیر خان کو جو مقام بتایا تھا جہاں سے شیر خان نے پکی سڑک کو چھوڑ کر کچے راستے پر اتر جانا تھا وہ مقام ابھی کافی دور تھا۔ شیر خان کی گاڑی رات کے سناٹے میں پوری رفتار کے ساتھ اڑی چلی جا رہی تھی۔ پھر بھی اسے خاص مقام تک پہنچتے پہنچتے ڈیڑھ گھنٹہ لگ گیا۔ یہ جگہ ایسی تھی کہ یہاں پرانے زمانے کے ایک مینار کا کھنڈر تھا۔ یہ نشانی فیروز نے شیر خان کو بتائی تھی۔ شیر خان نے گاڑی پکی سڑک سے اتار کر کچی سڑک پر ڈال دی۔ اس جگہ کوئی درخت نہیں تھے۔ سنگلاخ زمین تھی۔ اندھیرے میں کہیں کہیں

چھوٹے چھوٹے ٹیلے دکھائی دے رہے تھے۔ انسپکٹر خالد نے تھوڑا فاصلہ رکھ کر اپنی گاڑی شیر خان کے پیچھے لگا رکھی تھی۔ رات کی تاریکی کی وجہ سے پولیس کی گاڑی شیر خان کو نظر نہیں آسکتی تھی۔ ویسے بھی انسپکٹر خالد نے گاڑی کی ہیڈ لائیٹس بند کر رکھی تھیں۔ سنگلاخ زمین ختم ہوئی تو ایک چٹیل میدان آگیا۔ فیروز نے ٹیلی فون پر اسے بتا دیا تھا کہ جب چٹیل میدان آئے گا تو سامنے ایک ٹیلے پر روشنی ٹمٹماتی دکھائی دے گی۔ تم گاڑی ٹیلے کے عقب میں لے آنا۔ بس یہی وہ جگہ ہو گی جہاں تم رقم ہمارے حوالے کر کے اپنی بیٹی حاصل کرو گے۔ شیر خان نے دور ٹیلے پر روشنی ٹمٹماتی دیکھی۔ یہ ایک لالٹین کی روشنی تھی جسے فیروز نے شامدو کو کہہ کر وہاں رکھوا دیا تھا۔ شہاب فیروز اور شامدو پہلے سے یہاں موجود تھے۔ شیر خان ٹیلے کے عقب میں پہنچا تو اسے ستاروں کی ہلکی روشنی میں ایک کافی کھلی جگہ نظر آئی۔ یہاں کوئی گاڑی وغیرہ نہیں تھی۔ شیر خان اپنی گاڑی سے نکل کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اسے کوئی گاڑی وغیرہ نظر نہیں آرہی تھی۔ مگر شہاب اور فیروز نے اسے دیکھ لیا تھا۔ شیر خان ابھی گاڑی کے باہر ہی کھڑا تھا کہ سامنے کچھ فاصلے پر گاڑی کی بتیاں روشن ہو گئیں اور یہ گاڑی آہستہ آہستہ چلتی ایک جگہ کھلے میدان کے بالکل درمیان میں آکر رک گئی۔ گاڑی کی بتیاں اسی طرح روشن رکھی گئی تھیں۔ پھر فیروز کی آواز بلند ہوئی۔

"شیر خان رقم لائے ہو؟" شیر خان نے جواب میں سوال کیا۔

"میری بیٹی کہاں ہے؟ پہلے اس سے میری بات کراؤ۔" شہاب نے غصے میں کہا۔

"پہلے یہ بتاؤ ہماری رقم لائے ہو؟" شیر خان بولا۔

"شہاب! تم خوب جانتے ہو کہ میرے لئے عزت ہی سب کچھ ہے۔ رقم کی میں نے کبھی پروا نہیں کی۔ مگر تم مجھے بلیک میل کر رہے تھے۔ اور یہ بھی تم دونوں اچھی طرح جانتے ہو کہ مجھے کوئی بلیک میل نہیں کر سکتا۔" دوسری طرف سے فیروز کی آواز بلند ہوئی۔

"شیرے! یہ واعظ بند کرو اور ہمارے سوال کا جواب دو۔ رقم لائے ہو؟"

"ہاں۔" شیر خان نے جواب دیا۔ "مگر میری بیٹی کہاں ہے؟ میری اس سے بات کراؤ۔" شہاب کی آواز آئی۔

"تم صرف اس کی آواز ہی سن سکو گے اس سے ملاقات رقم ہمارے حوالے کرنے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کے بعد ہو سکے گی۔" اس کے ساتھ ہی کار میں پچھلی سیٹ پر نیم دراز عائشہ کو شہاب نے کہا کہ وہ اپنے باپ کو آواز دے۔ عائشہ اس وقت معذوری کی حالت میں تھی۔ بے ہوشی کی ضرورت سے زیادہ دی گئی دوائی کا اثر اس کی آواز پر بھی ہو چکا تھا۔ اس نے نقاہت بھری آواز میں اپنے باپ کو پکارا تو شیر خان اپنی بیٹی کی کمزور آواز سن کر تڑپ اٹھا۔ اس نے چلا کر پوچھا۔

"کیا یہ تم ہو عائشہ بیٹی؟ تمہاری آواز کو کیا ہو گیا ہے؟" عائشہ نے جواب میں کہا۔

"میں بیمار ہوں ڈیڈی!" اس پر شیر خان بھڑک اٹھا اس نے شہاب اور فیروز کو مخاطب کر کے غضبناک لہجے میں کہا۔

"تم نے میری بیٹی کے ساتھ کیسا سلوک کیا ہے میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔"

شیر خان سے یہ غلطی ہو گئی کہ وہ جوش میں آ کر کچھ فاصلے پر کھڑی کار کی طرف بڑھا۔ اسے اپنی طرف خالی ہاتھ آتا دیکھ کر فیروز یہ سمجھا کہ وہ رقم اپنے ساتھ نہیں لایا۔ شامدو بولا۔

"اس کے پاس اسلحہ بھی ہو گا۔ فائر کر دو۔" اور فیروز نے فائر کر دیا۔ گولی ایک دھماکے کے ساتھ شیر خان کے پاؤں کے قریب زمین میں دھنس گئی۔

اب جو غلطی انسپکٹر خالد کے ایک پولیس کمانڈو سے سرزد ہوئی اس نے سارا منظر ہی بدل ڈالا۔ پولیس کے تینوں کمانڈو تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گھات لگا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ شیر خان پر پستول کا فائر ہوا تو ایک سپاہی نے جوابی فائر کر دیا۔ تھری ناٹ تھری کی گولی اندھیرے میں ایک طرف بیٹھے فیروز کو قریب قریب چھوتے ہوئے نکل گئی۔

"شہابو۔ شیرا پولیس ساتھ لایا ہے۔"

فیروز گرجا اور ساتھ ہی دھڑا دھڑ فائرنگ کرتا گاڑی کی طرف دوڑا۔ شہاب نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ شامدو اور فیروز اس میں لپک کر گھس گئے اور گاڑی کچی زمین پر اندھیرے میں ایک طرف کو نکل گئی۔ شیر خان حیران تھا کہ پیچھے سے کس نے فائر کیا تھا وہ اپنی گاڑی کی طرف دوڑ کر گیا۔ ڈیشن بورڈ میں سے پستول نکالا اور بغیر نشانہ لیے اس طرف اندھا دھند فائر کرنے لگا جدھر شہاب اور فیروز کی گاڑی گئی تھی۔ پیچھے سے انسپکٹر خالد اور پولیس کے کمانڈو بھی فائرنگ کرتے گھات سے نکل آئے۔ شیر خان نے ستاروں کی دھندلی روشنی

میں انسپکٹر خالد کو پہچان لیا۔

"انسپکٹر! تم نے بیڑا غرق کر دیا ہے۔" انسپکٹر خالد نے شیر خان کا جواب دینے کی بجائے اپنے آدمیوں سے چیخ کر کہا کہ وہ بدمعاشوں کا تعاقب کریں۔ پولیس والوں کی گاڑی ٹیلے کے پیچھے کھڑی تھی۔ سپاہی بھاگ کر اس میں بیٹھے اور گاڑی کو تیزی سے نکال کر شہاب اور فیروز کی گاڑی کے پیچھے لگا دیا۔ انسپکٹر خالد نے شیر خان کو بازو سے پکڑ کر اس کی گاڑی کی طرف کھینچا اور کہا۔

"خان جی! گاڑی چلائیں۔"

شیر خان نے انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی نکالی۔ مگر اس دوران میں فیروز اور شہاب کی گاڑی بیمار عائشہ کو لے کر رات کی تاریکی میں ان ٹیلوں کی طرف نکل گئی تھی جن کے پیچیدہ راستوں کا صرف شامدو ہی کو علم تھا۔ عائشہ سمجھ گئی تھی کہ سارا کھیل بگڑ گیا ہے اور اب کچھ پتا نہیں کہ یہ لوگ اگلا قدم کیا اٹھائیں گے۔ صرف ایک ہی امید تھی کہ تعاقب میں آنے والی اس کے ڈیڈی کی گاڑی کسی طرح اس تک پہنچ جائے مگر پیچھے آنے والی گاڑی کی آواز بھی اب رات کے سناٹے میں کہیں دور رہ گئی تھی۔

شامدو کی ہدایت پر شہاب نے گاڑی کو ایک گہرے پہاڑی نالے کے اوپر بنے ہوئے لکڑی کے چھوٹے سے پل پر ڈال دیا۔ اس پل پر سے صرف ایک ہی گاڑی گزر سکتی تھی۔ نیچے کافی گہرائی تھی اور خشک نالے میں چھوٹے بڑے پتھر جگہ جگہ بکھرے پڑے تھے۔ یہ پل رسوں کی مدد سے بندھا ہوا تھا۔ پل کی دوسری طرف آتے ہی شامدو نے گاڑی ایک طرف رکوائی۔ لپک کر باہر نکلا۔ اس جگہ آیا جہاں موٹے موٹے رسے ایک ستون سے بندھے ہوئے تھے۔ ان رسوں کے سہارے یہ مختصر سا پل نالے کے اوپر کھڑا تھا۔ شامدو نے رسوں کو پستول کے فائر سے توڑ دیا۔ رسوں کے ٹوٹتے ہی پل ایک گڑگڑاہٹ کے ساتھ نالے میں گر گیا۔ "اب ان کا باپ بھی ہم تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور وہ گاڑی لے کر اندھیرے میں گم ہو گئے۔

ایک طرف انسپکٹر خالد اپنے سپاہیوں کے ساتھ اور دوسری طرف شیر خان اکیلا بپھرے ہوئے شیر کی طرح اپنی بیٹی کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ جب شامدو نے پل کے رسوں کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

فائرنگ سے اڑایا تو پستول کے دھماکے کی آواز پر پولیس اور شیر خان کی گاڑیاں اس طرف دوڑیں۔ دونوں گاڑیاں تھوڑے تھوڑے وقفے سے خشک نالے پر پہنچ گئیں۔ پل نالے میں گرا پڑا تھا۔ انسپکٹر خالد نے شیر خان کے قریب آکر کہا۔

"وہ لوگ پل توڑ گئے ہیں۔ ہمیں دوسری طرف سے ان کا تعاقب کرنا ہو گا۔" شیر خان نے انسپکٹر خالد کی طرف غضب ناک انداز میں دیکھا اور زہریلے لہجے میں بولا۔

"انسپکٹر تم نے میری بچی کو مجھ سے اتنی دور کر دیا ہے کہ اب میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔" انسپکٹر خالد نے پیشہ وارانہ انداز میں کہا۔

"شیر خان! پولیس اپنا فرض ادا کر رہی ہے۔ اگر ایک روز پہلے تم ہمیں حالات سے باخبر کر دیتے تو اس وقت تمہاری بچی تمہارے گھر میں ہوتی اور مجرم حوالات میں ہوتے۔" بہر حال وہ لوگ ہمارے چنگل سے بچ نہ سکیں گے۔" یہ کہہ کر انسپکٹر تیزی سے پولیس گاڑی کی طرف گیا اور گاڑی نالے کے کنارے کنارے مغرب کی طرف نکل گئی۔ شیر خان اپنی گاڑی کے پاس کچھ دیر کھڑا گہری خاموش نظروں سے نالے کی دوسری جانب تکتا رہا جہاں صبح کی ہلکی ہلکی روشنی میں ٹیلوں کے خاکے ابھرنے لگے تھے۔ پھر وہ گاڑی میں بیٹھا۔ انجن اسٹارٹ کیا اور جس طرف پولیس کی گاڑی گئی تھی اسی طرف تیزی سے نکلتا چلا گیا۔ یہ خشک نالہ کئی میل تک چلا گیا تھا۔ راستے میں کہیں بھی کوئی ایسی جگہ نہ تھی کہ جہاں سے گاڑی گزاری جا سکتی۔ سورج نکل آیا تھا۔ جب شیر خان نے بائیں جانب ڈھلان دیکھ کر گاڑی کو خشک نالے میں اتار دیا۔

تھوڑی دور تک نالے کے اندر گاڑی کو چلانے کے بعد ایک جگہ سے وہ اسے نالے سے باہر نکال کر دوسرے کنارے پر لے آیا۔ یہاں سے وہ واپس چل پڑا۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیل گئی تھی۔ یہ سارا علاقہ شیر خان کے لئے اجنبی تھا۔ اس سے پہلے وہ ادھر کبھی نہیں آیا تھا۔ وہاں سوائے اونچے نیچے سنگلاخ ٹیلوں اور جگہ جگہ اگی ہوئی خشک جھاڑیوں کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ شہاب اور فیروز کی گاڑی کے ٹائروں کے نشان تلاش کر رہا تھا جو اسے کہیں نہیں مل رہے تھے۔ ایک دم سے اس نے گاڑی کو بریک لگائی۔

اس کے سامنے ایک اور نالہ آگیا تھا یہ بھی برساتی نالہ تھا اور کافی گہرا تھا۔

شیر خان ٹوٹے ہوئے پل تک پہنچنا چاہتا تھا مگر اس نالے نے اس کا راستہ روک دیا تھا۔ شیر خان غصیلی نظروں سے گاڑی سے اتر کر نالے کو دیکھنے لگا پھر اس نے زور سے گاڑی کے بونٹ پر مکا مارا اور کھڑے کھڑے سر کو جھکا کر گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ اس کی بیٹی عائشہ اس کی پہنچ سے دور ہو چکی تھی۔ گاڑی میں مطلوبہ رقم ویسے کی ویسی بریف کیس میں پڑی تھی۔ وہ انتہائی مایوسی کے عالم میں گاڑی میں آکر بیٹھ گیا۔ انجن اسٹارٹ کر کے گاڑی کو ریورس کیا اور واپس روانہ ہو گیا۔ دن کے دس بج رہے تھے جب وہ پنڈی پہنچا۔ اپنے ہیڈ آفس میں شیر خان نے کسی سے زیادہ بات نہ کی بریف کیس اپنے خاص منیجر کے حوالے کر کے اسے رقم واپس بینک میں جمع کرانے کی بجائے لاکر میں بند رکھنے کی ہدایت کی اور گاڑی مری روڈ پر ڈال دی۔

اپنے بنگلے روبی ہاؤس میں آکر وہ سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور اپنے آپ کو شکست خوردگی کے عالم میں صوفے پر گرا دیا۔ پھر کسی جذبے کے زیر اثر ایک دم اٹھا اور بنگلے کے پیچھے اپنی بیوی روبی کی قبر پر آگیا۔ قبر پر تازہ پھولوں کے ہار پڑے تھے۔ شیر خان کی ہدایت پر روبی کی قبر پر روزانہ تازہ پھولوں کے ہار ڈالے جاتے تھے۔ شیر خان نے اپنی بیوی کی مغفرت کے واسطے فاتحہ پڑھی اور قبر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"میں عائشہ کو اپنے ساتھ نہ لا سکا۔ مجھے معاف کر دینا لیکن میں اس وقت تک تیری قبر کو اپنا منہ نہ دکھاؤں گا جب تک بیٹی کو واپس نہیں لے آتا۔ میں اپنے خون کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ شہاب اور فیروز میرے انتقام سے نہیں بچ سکیں گے۔" شیر خان نے بیوی کی قبر پر پڑے گلاب کے ہار کو اٹھا کر چوما اور تیزی سے واپس اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

پولیس کو چونکہ شیر خان کی بیٹی کے اغوا کی خبر ہو گئی تھی اس لئے ضابطے کی کارروائی بھی شروع ہو گئی تھی۔ چونکہ انسپکٹر خالد کے شیر خان کے ساتھ گہرے مراسم تھے اس لئے شیر خان کے کہنے پر انسپکٹر خالد نے عائشہ کے اغوا کی خبر اخباروں کو نہیں دی تھی۔ محکمے کو بھی ہدایت کر دی تھی کہ زیادہ سے زیادہ رازداری سے کام لیا جائے۔ شیر خان نے انسپکٹر سے یہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی کہ اسے یہ خبر کس نے دی تھی کہ میں تاوان کی رقم لے کر اپنی بچی کو چھڑانے جا رہا ہوں لیکن انسپکٹر خالد نے اس ضمن میں کچھ بتانے سے انکار

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر دیا تھا۔

شیر خان نے انسپکٹر خالد کو شہاب اور فیروز کے بارے میں ساری باتیں بتا دیں تھیں۔ پولیس شیر خان کے بیان کی روشنی میں تفتیش کر رہی تھی۔ مشکل یہ پیش آ رہی تھی کہ شہاب اور فیروز وہاں اجنبی تھے اور کسی بھی جرائم پیشہ گروہ کو ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ پولیس پارٹی نے دوسرے روز نالے کے پار والے سارے علاقے کو چھان مارا۔ وہاں ایک جگہ ریتلی زمین پر شہاب اور فیروز کی گاڑی کے ٹائروں کے نشان بھی مل گئے مگر تھوڑی دور آگے جا کر یہ نشان سخت زمین پر غائب ہو گئے۔ اس کے آگے پتھریلی زمین شروع ہو جاتی تھی۔ اس کے آگے میلوں تک کوئی آبادی نہ تھی۔ سوائے چھوٹی چھوٹی سوکھی جھاڑیوں والے ٹیلوں کے اور کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ ان ٹیلوں کے پار ایک دریا بہتا تھا جہاں سے دوسرے صوبے کی سرحد شروع ہو جاتی تھی۔ ایک پولیس پارٹی دوسرے صوبے کی طرف بھی روانہ کر دی گئی۔ مگر شہاب اور فیروز کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔

شیر خان کی حالت زخمی شیر کی سی تھی جسے پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔ اسے کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔ تیسرے دن سہ پہر چار بجے کے قریب ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ شیر خان زیادہ سے زیادہ اپنے آپ کو ٹیلیفون کے قریب رکھتا اسے یقین تھا کہ شہاب اور فیروز کا فون ضرور آئے گا۔ گھنٹی کے بجتے ہی شیر خان نے ریسیور اٹھا کر اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"کون؟" دوسری طرف سے فیروز کی آواز آئی۔ "شیر خان! تو نے اپنے وعدے کا پاس نہیں کیا۔" شیر خان نے جلدی سے کہا۔ "میں نے پولیس کو خبر نہیں کی تھی۔ میں قسم کھاتا ہوں۔ تمہاری رقم اب بھی میرے پاس ہے۔ مجھے بتاؤ میں کہاں رقم لے کر آؤں۔ میری بیٹی کس حال میں ہے؟" فیروز بولا۔

"وقت تمہارے ہاتھ سے نکل گیا ہے شیرے؟ تمہاری بیٹی بالکل ٹھیک ہے مگر اب تم اس کی شکل نہیں دیکھ سکو گے۔ اس کا انجام دیکھو گے۔" شیر خان نے فیروز کی بات کاٹ کر کہا۔

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں فیروز میں نے پولیس کو اطلاع نہیں کی تھی۔ میری ساری

جائیداد لے لو۔ میری ساری دولت لے لو۔ مگر میری بچی واپس کر دو۔" فیروز نے زہر بھرے لہجے میں کہا۔

"شیر خان! موقع تمہارے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ تم نے ہمارے لئے وہ جال پھیلایا تھا کہ اگر ہم اس میں پھنس جاتے تو شاید باقی ساری زندگی جیل میں سڑتے گزر جاتی لیکن قدرت نے ہمیں بچا لیا۔ اب ہم نے اپنا فیصلہ تبدیل کر لیا ہے۔ ہم تم سے اپنے حصے کی رقم نہیں لیں گے۔ ہم تم سے بدلہ لیں گے۔ انتقام لیں گے۔ ایسا انتقام کہ جس کے تصور ہی سے تمہارے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔ اس کے بعد تمہیں ہمارا فون نہیں آئے گا۔" اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔

شیر خان اپنی جگہ پر جیسے پتھر کا بت بن گیا تھا۔ ریسیور اس کے ہاتھ میں تھا اور آنکھیں سامنے دیوار کو تک رہی تھیں۔ اس نے گہرا سانس لے کر ریسیور ٹیلی فون پر رکھ دیا۔ کھیل ختم ہو گیا تھا۔ وہ شہاب اور فیروز کی کمینہ فطرت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کے اندر جیسے آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ بے چینی سے خالی کمرے کے قالین پر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ اس وقت شیر خان کے دل کو اگر کسی خیال سے ذرا سکون مل رہا تھا تو صرف اس خیال سے کہ اس کی بیٹی اپنی عزت کی خاطر زندگی کے آخری سانس تک زخمی شیرنی کی طرح لڑے گی اور اگر دشمن کو پچھاڑ نہ سکی تو خودکشی کر لے گی۔ عائشہ کو شیر خان نے یہی تربیت دی تھی۔ یہی تعلیم دی تھی۔ وہ اپنی ماں سے بڑھ کر بہادر اور دلیر تھی۔ وہ روبی سے زیادہ خونخوار شیرنی تھی۔

شیر خان نے اسی وقت انسپکٹر خالد کو فون کر کے اپنے گھر بلوایا اور فیروز کے ساتھ ٹیلی فون پر جو بات ہوئی تھی وہ ساری کی ساری بیان کر دی۔ انسپکٹر خالد بولا۔

"ہم نے سارے صوبوں کی پولیس کو خبردار کر دیا ہے۔ ریلوے اسٹیشنوں اور ہوائی اڈوں پر بھی پولیس تعینات کر دی ہے۔ یہ لوگ ملک سے باہر نہیں نکل سکیں گے ان کے خفیہ اڈے کی تلاش کے لئے بھی ہم سر توڑ کوشش کر رہے ہیں۔"

یہ پولیس کا روایتی بیان تھا۔ شیر خان کی اس بیان سے تسلی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے اسی لمحے اپنے دل میں ایک فیصلہ کر لیا۔ دوسرے دن منہ اندھیرے وہ اپنی جیپ نکال کر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس میں گولیوں کی بیلٹ اور پستول چھپا کر سوار ہوا اور اس سمت کو روانہ ہو گیا جس طرف وہ کچھ دن پہلے تاوان کی رقم لے کر گیا تھا۔ سورج کافی اوپر آگیا تھا جب وہ اس جگہ پہنچ گیا جہاں شہاب اور فیروز اس کی بیٹی عائشہ کو گاڑی میں ڈال کر لائے تھے۔ شیر خان کو اسی روز اندازہ ہو گیا تھا کہ فیروز اور شہاب کے ساتھ کوئی تیسرا آدمی بھی تھا۔ یہ تیسرا آدمی وہی ہو سکتا تھا جس کے خفیہ ٹھکانے پر وہ عائشہ کو لے کر چھپے ہوئے تھے۔ اصولی طور پر یہ ٹھکانہ اس مقام سے زیادہ دور نہیں ہونا چاہئے تھا۔

شیر خان نے جیپ کو اس طرف بڑھایا جس طرف پولیس مقابلے کے بعد شہاب اور فیروز گاڑی لے کر بھاگے تھے کافی آگے جا کر اسے ایک کچا راستہ دائیں جانب ایک ویران علاقے کی طرف جاتا نظر آیا۔ اس نے گاڑی اس راستے پر ڈال دی۔ میدان دو تین میل تک پھیلا ہوا تھا۔ جب وہ ختم ہوا تو اسے کچھ فاصلے پر نشیب میں دو چار کھیت دکھائی دیے۔ قریب ہی درختوں کے پاس چند ایک کچے مکان بنے ہوئے تھے۔ شیر خان نے جیپ کھیتوں کے پاس ایک جانب کھڑی کی اور بھرا ہوا پستول جیب میں ڈال کر کچے مکانوں کی طرف بڑھا۔ وہاں ایک بوڑھا آدمی صحن کے باہر کلہاڑی سے لکڑیاں کاٹ رہا تھا۔ شیر خان نے اسے سلام کیا اور پانی مانگا۔ بوڑھے نے کلہاڑی ایک طرف ڈالی شیر خان کی طرف غور سے دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ صحن میں ایک طرف پانی کا مٹکا رکھا ہوا تھا۔ بوڑھا کٹورے میں پانی بھر کر لے آیا۔ شیر خان نے پانی پی کر بوڑھے کا شکریہ ادا کیا اور گردو پیش پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔

"میں اپنے ایک دوست کی تلاش میں ادھر آیا تھا مگر لگتا ہے کہ راستہ بھول گیا ہوں۔"

"تمہارا دوست کس گاؤں میں رہتا ہے۔" بوڑھے نے کلہاڑی اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ بڑے سکون سے لکڑیاں کاٹنے لگا۔ شیر خان نے اسے ایک فرضی نام بتا دیا اور ایک فرضی کہانی بھی گھڑ کر سنا دی کہ ہم دونوں دوسری جنگ میں معرکے محاذ پر اکٹھے رہے تھے۔ پھر وہ مجھ سے بچھڑ گیا۔ کسی نے مجھے بتایا کہ وہ اس علاقے کے ایک گاؤں میں رہتا ہے۔ بس میں گاڑی لے کر ادھر نکل آیا۔ بوڑھے نے کلہاڑی ایک طرف رکھ دی اور صافے سے منہ کا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پسینہ پونچھتے ہوئے شیر خان کے پاس بیٹھ گیا۔

"جو نام تم بتاتے ہو اس نام کا تو کوئی آدمی یہاں نہیں رہتا۔ یہاں دو چار گھر ہیں جوان دن کو کام پر چلے جاتے ہیں۔ قریب ہی کوئی ڈیم بن رہا ہے۔ چھٹی کے وقت کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ تم پیچھے جاؤ۔ وہاں ایک گاؤں ہے۔ شاید وہاں تمہیں اپنے دوست کا سراغ مل جائے۔" شیر خان کو مغرب کی جانب ایک ٹیلے کے ساتھ درختوں کا ایک جھنڈ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے یوں ہی ان درختوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھ لیا کہ اس طرف بھی کوئی گاؤں ہے کیا؟ بوڑھے نے ٹیلے کی طرف ایک نگاہ ڈالی اور کہنے لگا۔

"وہاں شامدو کا ہی مکان ہے۔ وہی اکیلا وہاں رہتا ہے۔ مگر وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ چرس کوکین کا دھندا کرتا ہے۔ گاؤں والوں میں سے کوئی اس سے نہیں ملتا۔" شیر خان کے کان کھڑے ہو گئے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ جس شخص کی تلاش میں نکلا تھا اس کا سراغ مل گیا ہے۔ اس نے بوڑھے سے پوچھا۔

"کیا شامدو وہاں اکیلا ہی رہتا ہے؟" بوڑھا سخت لہجے میں بولا۔ "تمہیں کہا ہے نا کہ اکیلا ہی رہتا ہے۔ ایسے شخص سے کوئی شریف آدمی ملنا پسند نہیں کرتا۔"

شیر خان نے موضوع بدل کر دوسری باتیں شروع کر دیں۔ پھر اٹھ کر بوڑھے سے مصافحہ کیا۔ اس کا شکریہ ادا کیا اور جیپ میں بیٹھ کر اس ٹیلے کی طرف چل دیا جہاں بوڑھے کی اطلاع کے مطابق جرائم پیشہ شامدو کا مکان تھا۔ یہ وہی مکان تھا جہاں شہاب اور فیروز شیر خان کی بیٹی عائشہ کو پہلی بار لے کر آئے تھے اور اسے وہاں چھپایا تھا۔ مکان کا لکڑی کا پرانے زمانے کا دروازہ بند پڑا تھا۔ کچے صحن میں خاک اڑ رہی تھی۔ شیر خان نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی آدمی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ مکان کی پچھلی طرف آیا تو کچھ فاصلے پر ایک عورت کو دیکھا جو درخت کے نیچے گری پڑی سوکھی شاخیں جمع کر رہی تھی۔ شیر خان اس کے قریب گیا اور پوچھا۔

"بی بی اس مکان میں جو آدمی رہتا تھا وہ کہاں چلا گیا ہے؟" عورت کمر پر ہاتھ رکھ کر سیدھی کھڑی ہو گئی اور شیر خان کی طرف دیکھ کر بولی۔

"تم شامدو کا پوچھ رہے ہو؟" شیر خان نے کہا۔

"ہاں ہاں میں شامدو ہی کو ملنے آیا ہوں۔ بڑی دور سے آرہا ہوں۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ وہ کہاں ملے گا؟" عورت نے کہا۔

"ایسے آدمیوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کب کہاں چلے جائیں۔ دو تین روز پہلے تو وہ اپنے مکان پر ہی تھا۔ میں نے اسے دیکھا تھا۔ اس کے کچھ ساتھی بھی آئے ہوئے تھے۔" شیر خان نے جب شہاب اور فیروز کا حلیہ بتایا تو عورت نے تصدیق کی کہ ہاں ایسے حلیئے کے آدمی ہی تھے۔ شیر خان نے آہستہ سے پوچھا۔

"بی بی! کیا ان کے ساتھ کوئی عورت بھی تھی؟" وہ عورت چپ ہو گئی۔ سوکھی ٹہنیوں کو رسی سے باندھنے لگی۔ پھر شیر خان کی طرف چہرہ اٹھا کر دیکھا اور کہا۔

"کوئی عورت ضرور تھی مگر شاید وہ بیمار تھی۔ کوٹھری میں پڑی رہتی تھی۔ میں نے شامدو کو یہ کہتے سنا تھا کہ عورت کو تم نے کوئی سخت دوا تو نہیں پلا دی۔" پھر سر کو نفی کے انداز میں ہلاتے ہوئے بولی۔

"اللہ معاف کرے۔ خدا جانے کیسے کیسے گناہ کرتے ہیں یہ لوگ۔ تم بھی مجھے ان کے بھائی بند ہی لگتے ہو۔" اتنا کہہ کر عورت نے سوکھی شاخوں کا گٹھا اپنے سر پر رکھا اور وہاں سے چل پڑی شیر خان نے آگے بڑھ کر عورت سے کہا۔

"میری بہن! وہ عورت میری بیٹی تھی۔ میں شریف آدمی ہوں۔ یہ لوگ میری بیٹی کو اٹھا کر لے آئے ہیں۔ میری مدد کرو۔" عورت رک گئی۔ اس کی آنکھوں میں شیر خان کے لئے ہمدردی کا جذبہ جھلک اٹھا کہنے لگی۔

"اللہ تم پر اور تمہاری بیٹی پر رحم کرے۔ شامدو بڑا سنگدل آدمی ہے۔ وہ اس عورت کو فروخت کرنے کے واسطے ضرور بارڈر کی طرف لے گیا ہو گا۔ وہاں ایسا ہی دھندا ہوتا رہتا ہے۔ تم بارڈر پر جاؤ شاید تمہیں تمہاری بیٹی مل جائے۔"

"بارڈر؟ کونسا بارڈر میری بہن؟" شیر خان نے پوچھا۔ عورت کہنے لگی۔

"افغانستان کا بارڈر۔" پھر اس عورت نے شیر خان کو ایک سرحدی گاؤں کا نام بھی بتایا جہاں جرائم پیشہ بردہ فروش لوگ اغوا شدہ عورتوں کو آگے بیچ دیتے تھے۔

شیر خان وہیں سے پنڈی آگیا۔ پنڈی پہنچ کر اس نے گاڑی وہیں چھوڑی۔ کچھ ضروری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

چیزیں اور روپے اپنے پاس رکھے اور فوکر جہاز کی فلائیٹ سے پشاور روانہ ہو گیا۔ پشاور سے ٹیکی کرائی اور افغانستان کی سرحد کی طرف چل پڑا۔ جس وقت وہ عورت کے بتائے ہوئے گاؤں سے پچاس میل پیچھے ایک پہاڑی قصبے میں پہنچا تو رات ہو گئی تھی۔ یہاں اس نے ایک سرائے میں رات گزاری۔ ٹیکسی اپنے ساتھ ہی رکھی۔ صبح اٹھ کر وہ بارڈر والے گاؤں کی طرف چل دیا۔ یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ دس پندرہ بوسیدہ سے مکان تھے۔ ایک آدمی رائفل کاندھے پر ڈالے لاٹھی کے سہارے کھڑا تھا۔ اس کی بکریاں سنگلاخ زمین پر گھاس تلاش کرتی پھر رہی تھیں۔

شیر خان نے اسے سلام کیا اور کہا "میں اپنے ایک دوست کی تلاش میں آیا ہوں جو گھر سے ناراض ہو کر چلا آیا ہے اس کا نام شامدو ہے۔ ایک لڑکی بھی اس کے ساتھ ہے سنا ہے وہ بارڈر کراس کر کے افغانستان میں داخل ہونا چاہتا ہے۔" پٹھان چرواہے نے تیز عقابی آنکھوں سے شیر خان کی طرف دیکھا۔

"اس نام کے کسی آدمی کو میں نہیں جانتا۔"

پٹھان چرواہے نے ٹیکسی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"تم کہاں سے آئے ہو؟"

"راولپنڈی سے آیا ہوں۔ میرے دوست کی والدہ بڑی بیمار ہے۔ میں اسے واپس گھر لے جانے آیا ہوں۔" پٹھان چرواہا جیسے کچھ سوچنے لگا۔ پھر پہلو بدل کر بولا۔

"وہ سامنے والا ٹیلہ دیکھ رہے ہو؟ اس کے پاس ایک مکان ہے جہاں میریانی نام کی ایک عورت رہتی ہے وہ ایسے لوگوں کی مدد کرتی ہے۔ شاید اس سے تمہیں کچھ پتا چل سکے۔"

شیر خان شکریہ ادا کر کے ٹیلے کی طرف چل دیا۔ یہ ایک خشک سوکھی زرد جھاڑیوں والا ٹیلہ تھا اس کے پیچھے پتھروں سے بنا ہوا ایک حجرہ سا نظر آیا۔ دو بکریاں صحن میں بندھی تھیں ایک ادھیڑ عمر کی عورت گلے میں منکوں کی مالا ڈالے چارپائی پر بیٹھی بھیڑوں کی اون صاف کر رہی تھی۔ شیر خان نے سلام کیا تو عورت نے ایک نظر اسے دیکھا۔ پھر کام میں مشغول ہو گئی۔

"ابھی میرے پاس اون تیار نہیں ہے۔ کل کسی وقت آنا۔" شیر خان نے جیب سے سو سو کے بیس نوٹ نکال کر اس عورت کے سامنے رکھ دیے اور کہا۔

"مجھے تین آدمیوں کی تلاش ہے جو بارڈر پار کرنے ادھر آئے تھے۔" عورت نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیا پتا کسی کا میں تو یہاں محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالتی ہوں۔"

شیر خان نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو سو کے مزید دس نوٹ نکال کر عورت کی خدمت میں پیش کر دیے۔ عورت نے جلدی سے سارے نوٹ اٹھا کر اپنی صدری میں ڈال لیے اور پوچھا۔

"ان کے ساتھ دو عورتیں بھی تھیں؟"

"ایک لڑکی تھی۔" شیر خان نے کہا "وہ میری بیٹی ہے یہ لوگ میری بیٹی کو اٹھا کر لے آئے ہیں۔" پٹھان عورت کے ہاتھ پشم صاف کرتے کرتے رک گئے۔ اس نے لڑکی کا حلیہ پوچھا۔ شیر خان نے اپنی بیٹی عائشہ کا حلیہ بتا دیا۔ پٹھان عورت نے دوسرے مردوں کا حلیہ پوچھا۔ شیر خان نے شہاب اور فیروز کا حلیہ بیان کر دیا۔ عورت خاموش تھی۔ شیر خان بولا۔

"ان کے ساتھ شامدو نام کا ایک آدمی بھی تھا۔ میں اسے نہیں جانتا۔" پھر شیر خان نے عورت سے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ پٹھان عورت نے صدری کی جیب میں ہاتھ ڈال کر شیر خان نے جو اسے رقم دی تھی وہ ساری کی ساری نکال کر نوٹ شیر خان کے آگے رکھ دی۔

"اسے واپس لے لو۔ میں ایک باپ کی بے بسی کا فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ مجھ پر گناہوں کا پہلے ہی بوجھ ہے۔ میری بات غور سے سنو۔"

اس نیک دل پٹھان عورت نے جس کا ضمیر ابھی زندہ تھا شیر خان کو بتایا کہ شامدو کو وہ جانتی ہے۔ وہ دو روز پہلے اپنے دو آدمیوں اور دو عورتوں کو لے کر بارڈر پار کرنے وہاں آیا تھا۔ ایک عورت پکی عمر کی تھی۔ دوسری نوجوان لڑکی تھی جس کی ٹانگیں کام نہیں کرتی تھیں وہ عورت کے سہارے چل رہی تھی۔ یہ لوگ اسی دن رات کو بارڈر پار کر کے کابل کی طرف چلے گئے تھے۔ مگر شامدو صبح ہونے سے پہلے واپس آ گیا تھا۔ ان لوگوں کا ارادہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کابل سے بھی آگے ترکی ایران کی طرف جانے کا تھا۔ اب تک وہ کہیں کے کہیں نکل چکے ہوں گے۔ تم ان کی تلاش میں جاؤ گے بھی تو ان کا سراغ نہ پا سکوں گے۔" شیر خان کسی بت کی طرح مونڈھے پر ساکت بیٹھا تھا۔ اس نے پوچھا۔

"بہن! کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ شامدو کہاں ملے گا؟"

پٹھان عورت نے جواب دیا۔

"اس خبیث نے کہاں جانا ہے۔ وہ واپس اپنے ڈیرے پر ہی گیا ہو گا۔" پھر نفرت کے انداز میں اپنی گردن کو جھٹک کر بولی۔ "خدا جانے یہ آدمی کتنی عورتوں کے گھر تباہ کر چکا ہے۔ میں تو اس کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں ہوں۔" شیر خان نے بڑی مشکل سے اس عورت کو راضی کیا کہ وہ صرف ایک ہزار روپیہ ہی قبول کر لے۔ وہ گاڑی لے کر شامدو کے ڈیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔

صرف شامدو ہی ایک ایسا آدمی تھا جو اسے یہ حقیقت بتا سکتا تھا کہ شہاب اور فیروز عائشہ کو لے کر کس طرف گئے ہیں اور آگے ان کا کیا ارادہ ہے۔ یہ معلوم کیے بغیر شیر خان کا اپنی بچی کی تلاش میں بارڈر پار کر کے افغانستان میں داخل ہونا بے کار تھا۔ پشاور سے اس نے دوسری ٹیکسی لی اور پنڈی والی سڑک پر چل پڑا۔ سورج مغرب کی طرف کافی جھک گیا تھا جب شیر خان جرنیلی سڑک چھوڑ کر اس کچے راستے پر ہو لیا جو کافی آگے جا کر شامدو کے خفیہ ڈیرے تک جاتا تھا۔ شیر خان نے بہت پیچھے ٹیکسی رکوا کر ڈرائیور سے کہا کہ وہ یہاں اس کا انتظار کرے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو شیر خان نے اتنے روپے دیے ہوئے تھے کہ وہ اتنے پیسے ایک مہینے میں بھی نہیں کما سکتا تھا۔ وہ بولا۔

"صاحب میں جب تک آپ نہیں آتے اسی جگہ رہوں گا۔" پستول شیر خان کی واسکٹ کی جیب میں تھا۔ وہ اپنے اندر جذبات کے کھولتے ہوئے لاوے کو بڑی مشکل سے قابو میں کیے شامدو کے ڈیرے کی طرف چلنے لگا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ شامدو کے ڈیرے کی جانب وہ ٹیلے کے عقب سے ہو کر آیا۔ شامدو کے مکان کا چھوٹا سا صحن ویسے ہی ویران ویران سا پڑا تھا عورت بھی وہاں نہیں تھی۔ اس نے غور سے دیکھا۔ مکان کے دروازے پر تالا نہیں پڑا تھا۔ کنڈی لٹک رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ شامدو مکان کے اندر ہی تھا۔

شیر خان نے اپنا سیدھا ہاتھ واسکٹ کی جیب میں ڈال کر پستول پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ وہ کچھ دیر اس انتظار میں رہا کہ شاید اندر سے کوئی شخص باہر نکلے۔ اس نے شامدو کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پٹھان عورت میربانی نے اسے شامدو کا حلیہ ضرور بتا دیا تھا۔ جب پندرہ بیس منٹ گزر گئے اور نہ باہر سے کوئی اندر گیا نہ اندر سے کوئی باہر نکلا تو شیر خان نے واسکٹ کی جیب سے ہاتھ باہر کیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر آواز دی۔

"شامدو بھائی، شامدو بھائی۔" تھوڑی دیر بعد ہی دروازہ کھلا اور سامنے ایک آدمی کھڑا شیر خان کو گھور رہا تھا۔ اس کا حلیہ وہی تھا جو نیک دل پٹھان عورت نے اسے شامدو کا حلیہ بتایا تھا۔

"کون ہو تم؟ کہاں سے آئے ہو؟"

شامدو نے پوچھا۔ شیر خان نے واسکٹ کی اندرونی جیب سے سو سو روپے کی ایک گڈی نکال کر کہا۔

"مجھے شامدو بھائی سے ملنا ہے۔ اسی سے ایک ضروری کام ہے۔"

سو سو کے نوٹ دیکھتے ہی شامدو بولا۔

"میں ہی شامدو ہوں۔ اندر آجاؤ۔"

اس نے دروازہ کھول دیا۔ کوٹھری میں چارپائی کے پاس لکڑی کی ایک پرانی سی کرسی پڑی تھی۔ چارپائی پر دری بچھی ہوئی تھی۔ "بیٹھو بھائی کہاں سے آئے ہو؟ کیا کام ہے تمہیں مجھ سے؟" شیر خان کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ ایک جرائم پیشہ آدمی ہے اور نوٹ دیکھ کر یہ سب کچھ بتا دے گا۔ شیر خان نے نوٹوں کی گڈی شامدو کے ہاتھ میں تھما دی اور کہنے لگا۔

"میں تم سے صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ شہاب اور فیروز عائشہ کو لے کر کہاں گئے ہیں میں عائشہ کا باپ شیر خان ہوں۔"

پہلے تو یہ سنتے ہی شامدو ایک بار اپنی جگہ سے ہل گیا پھر اس نے جلدی سے نوٹ واپس کرتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"معاف کرنا بھائی میں کسی شہاب اور فیروز کو نہیں جانتا تمہیں کسی نے غلط بتا دیا ہے۔" شیر خان نے جیب سے کچھ اور نوٹ نکال کر رقم میں شامل کر دیے اور بڑی نرمی سے بولا۔

"شامدو بھائی! میں ایک بیٹی کا باپ ہوں میری جگہ پر آکر سوچو مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میرے دشمن تو صرف شہاب اور فیروز ہیں۔ تم مجھے صرف اتنا بتا دو کہ وہ دونوں بارڈر کراس کر کے کابل سے آگے کس طرف گئے ہیں اور میری بیٹی عائشہ چل پھر کیوں نہیں سکتی؟" شامدو نے نوٹ تکیے کے نیچے رکھ لیے اور کہنے لگا۔

"تمہاری بیٹی کو ان لوگوں نے جو بے ہوشی کی دوائی پلائی تھی اس کا اثر اس کی ٹانگوں پر پڑ گیا ہے۔ وہ سہارے کے بغیر نہیں چل سکتی شہاب اور فیروز تمہاری بیٹی کو واپس کرنے ہی میرے پاس آئے تھے۔ وہ رقم لے کر تمہیں بچی واپس کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ مگر تم پولیس کو ساتھ لے آئے....." شیر خان نے بات کاٹ کر کہا۔

"میں پولیس کو ساتھ نہیں لایا تھا۔ مجھے نہیں پتا کہ پولیس کو کیسے پتا چل گیا کہ میں اپنی اغوا شدہ بیٹی کو بدمعاشوں کے چنگل سے چھڑوانے جا رہا ہوں۔ جب پولیس نے فائرنگ شروع کر دی تو میں خود بڑا حیران ہوا کہ یہ پولیس کہاں سے آگئی ہے۔" شامدو بولا۔

"چاہے کچھ وجہ ہوئی ہو۔ بہرحال پولیس کو دیکھ کر شہاب اور فیروز آگ بگولا ہو گئے۔ وہ تمہیں گالیاں دینے لگے۔ شہاب تو اسی وقت تمہاری بیٹی عائشہ کو قتل کر دینا چاہتا تھا مگر فیروز نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ قتل کرنے سے شیر خان کی فتح ہو گی۔ اسے صبر آجائے گا۔ ہم شیر خان سے اس کی بدعہدی اور ہمارے ساتھ دھوکہ کرنے کا ایسا انتقام لیں گے جسے اس کی آنے والی نسلیں بھی نہ بھلا سکیں گی۔" شیر خان کا ماتھا خون کی گرمی سے تمتمانے لگا۔ وہ شامدو کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے تک رہا تھا۔

"وہ مجھ سے کس بات کا انتقام لینا چاہتے ہیں؟ میں اپنی بیوی کو لے کر لنکا سے خالی ہاتھ چلا تھا۔ میں نے پاکستان میں آکر دن رات محنت کر کے دولت کمائی ہے۔ شہاب اور فیروز مجھے بلیک میل کر رہے تھے۔" شامدو نے سگریٹ سلگا لیا۔ دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔

"شیر خان! مجھے ان باتوں کا کچھ علم نہیں ہے کہ تمہاری آپس میں کیا دشمنی ہے مجھے

اس بات کا افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے ایک گھناؤنے جرم میں ان لوگوں کا ساتھ دیا لیکن میں بھی مجبور تھا۔ روپے کے لالچ میں نہیں آیا۔ بس فیروز سے پرانی دوستی نبھا رہا تھا۔ بہرحال اب میں تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں شاید اس طرح سے خدا میرے اس گناہ کو معاف کر دے۔ سنو۔ شہاب اور فیروز تمہاری بیٹی کو کابل سے ترکی یا ایران کی طرف بالکل نہیں لے جا رہے۔ اس طرف جانے کا ان کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ وہ کابل سے عائشہ کو ایک ایسے دور دراز اور خطرناک علاقے میں لے جا رہے ہیں بلکہ اب تک لے جا چکے ہوں گے جس پر آج انڈیا کا قبضہ ہے۔ لیکن جہاں انگریزوں کے زمانے میں خطرناک باغیوں اور خونخوار قاتلوں کو زندگی بھر کے لئے جلا وطن کیا جاتا تھا۔ خطرناک باغیوں میں سیاسی لوگ بھی ہوتے تھے جو انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے لئے بموں کے دھماکے کرتے ٹرینیں الٹ دیتے اور انگریز حاکموں کو قتل بھی کر دیتے تھے۔ انڈیا سے انگریز تو چلا گیا۔ پر انڈیا کی حکومت آج بھی ایسے خطرناک مجرموں کو اس جزیرے میں جلا وطن کر دیتی ہے جو بار بار جیل توڑ کر فرار ہو جاتے ہیں۔" شیر خان کے دماغ میں اس جگہ کا تصور آگیا تھا۔ اس نے شامدو سے پوچھا۔

"تمہارا مطلب کالے پانی سے تو نہیں ہے؟"

"ہاں شہاب اور فیروز اسی جگہ کا ذکر کرتے تھے۔ وہ جب لنکا میں اسمگلنگ کا دھندا کرتے تھے تو اس جگہ اکثر جایا کرتے تھے۔"

شیر خان کو یاد آگیا کہ فیروز نے لنکا کے جنگل میں سے گزرتے ہوئے ایک بار کالے پانی کا ذکر کیا تھا کہ اگر لنکا میں حالات خراب ہو گئے تو ہم کالے پانی جا کر وہاں اپنا اڈہ بنا لیں گے۔ کالے پانی یعنی جزائر انڈیا کے بارے میں شیر خان نے اپنی نوجوانی کے زمانے میں ہی بڑی بڑی ہولناک داستانیں سن رکھی تھیں کہ سانپ بچھوؤں قاتل مچھروں اور کسی حد تک آدم خور جنگلیوں کے اس جزیرے میں کس طرح سیاسی اور خطرناک مجرموں کو زندگی بھر کے لئے جلا وطن کر دیا جاتا ہے اور ان میں سے اکثر لوگ جزیرے کے ناموافق پانی' ملیریا والی مرطوب فضا اور زہریلے سانپوں بچھوؤں کے ڈسنے سے مر جاتے تھے۔ جو بچ رہتے وہ زندگی بھر کے لئے مختلف جسمانی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے کالا پانی ایک ایسی جگہ تھی کہ اس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کا نام سن کر ہی لوگ کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ شامدو کہہ رہا تھا۔

"کالے پانی میں کوئی جگہ جس کا نام فیروز نے کچھ کربخیا کربخیا کر کے بتایا تھا۔ یہاں انڈیا کے شہر کاشی کا ایک بڑا خطرناک اور مشہور بدمعاش رہتا ہے جو کئی خون کر چکا ہے۔ ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے اسے پھانسی تو نہ مل سکی مگر انڈیا کی حکومت نے اسے کالے پانی بھیج دیا۔ یہاں وہ عمر قید کی سزا بھگت رہا ہے اس کی شہاب اور فیروز کے ساتھ دوستی ہے اس کا نام فیروز نے کانچو رام بتایا تھا۔ یہ لوگ عائشہ کو لے کر کانچو رام کے پاس کالے پانی کے جزیرے کربخیا کی طرف ہی گئے ہیں۔ پاکستان سے ہوائی جہاز کے ذریعے انڈیا جانا مشکل تھا چنانچہ وہ کابل چلے گئے جہاں سے انڈیا اور پھر وہاں سے کالے پانی جانے میں انہیں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ کالے پانی پر بھی انڈیا کا قبضہ ہے۔"

شامدو کی باتیں شیر خان کے کانوں سے تیز آندھی کے شور مچاتے تھپیڑوں کی طرح ٹکرا رہی تھیں۔ مگر وہ بڑے ضبط اور تحمل کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس نے کالے پانی کی ساری باتیں اپنے ذہن میں نقش کر لی تھیں وہ اٹھا اور کوٹھری سے باہر آگیا شامدو اس کے پیچھے پیچھے آیا احاطے کی دیوار کے پاس آکر شامدو نے وہ رقم واپس کرنی چاہی جو شیر خان نے اسے دی تھی۔ شیر خان نے کہا۔

"نہیں شامدو اب اس پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔" اسی رات شیر خان واپس اپنے کوہ مری کے مضافات والے بنگلے میں واپس آگیا سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ اپنی بیوی روبی کی قبر پر جا کر فاتحہ پڑھی اور اس کی قبر پر ہاتھ رکھ دیا اس کے ہونٹ اپنے آپ حرکت کرنے لگے۔

"روبی! میں اپنی بیٹی اور شیرنی کی بچی عائشہ کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ اگر اسے واپس نہ لا سکا تو اگلی دنیا میں بھی تجھے اپنا منہ نہ دکھاؤں گا۔" یہ کہہ کر شیر خان روبی کی قبر سے جدا ہو کر اپنے بنگلے کی طرف چل پڑا۔ وہ رات شیر خان نے جیسے ہو سکا گزار دی۔ دوسرے روز اس نے سری لنکا جانے کی تیاری شروع کر دی۔ وہ انڈیا کی بجائے لنکا سے ہوتا ہوا کالے پانی کے جزیروں میں پہنچنا چاہتا تھا۔ کرم دین اور اس کی بیوی کو شیر خان نے اصل بات بتا دی کہ وہ عائشہ کی تلاش میں جا رہا ہے باقی پنڈی آفس والوں کو اس نے یہی کہا کہ وہ

کاروباری دورے پر سنگاپور جا رہا ہے۔

دوسری طرف شہاب اور فیروز نے بھی بڑی تیزی سے اپنے سفر کے مراحل طے کیے تھے۔ عائشہ کے بازوؤں اور ٹانگوں پر دوائی کا اثر کم ہو رہا تھا۔ مگر اس نے شہاب اور فیروز پر ظاہر نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود وہ ابھی تک سہارے کے بغیر چل پھر نہیں سکتی تھی۔ شہاب اور فیروز نے جس عورت کو عائشہ کی دیکھ بھال کے لئے رکھ لیا تھا وہ اب بھی اس کے ساتھ ہی تھی۔ کابل پہنچنے کے بعد انہیں وہاں دو روز قیام کرنا پڑا۔ شہاب اور فیروز سری لنکا کے شہری تھے۔ صرف عائشہ کو ساتھ لے جانے میں تھوڑی سی مشکل پیش آرہی تھی مگر رشوت نے یہ مشکل بھی حل کر دی۔ عائشہ کا پاسپورٹ بھی بن گیا۔ سری لنکا کا ویزا بھی لگوا لیا گیا۔ تیسرے روز وہ سری لنکا ائرویز کے ایک طیارے میں سوار ہو کر کولمبو کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس دوران عائشہ کو شہاب اور فیروز نے اپنی جیب میں چھپائے ہوئے ریوالور کی زد میں لے رکھا تھا۔ عائشہ کو اس حقیقت کا احساس تھا کہ وہ اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ اٹھ کر بھاگ سکے۔ اس کا شور مچانا بھی بے سود تھا۔ کیونکہ کابل کے ہوٹل سے ائرپورٹ تک فیروز جیب میں ریوالور چھپائے اس کے سر پر سوار رہا اور ریوالور کی نالی عائشہ کے سر کے ساتھ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ٹکراتی رہی تھی۔

ہوائی جہاز پر سوار ہونے سے پہلے انہوں نے عائشہ کو خواب آور دوا پلا کر نیم بے ہوش کر دیا فیروز نے ایک جعلی ڈاکٹر کا روپ دھار رکھا تھا اور اس کے پاس جعلی سرٹیفکیٹ بھی موجود تھے۔ اور عائشہ پر ایسی نیند طاری ہوئی کہ جب طیارہ کولمبو کے ائرپورٹ پر اترا تو عائشہ وہیل چیئر پر گردن ایک طرف ڈھلکائے گہری نیند سو رہی تھی۔ ائرپورٹ سے وہ عائشہ کو لے کر اپنے خفیہ ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گئے۔ کولمبو شہاب اور فیروز کا اپنا شہر تھا۔ اس شہر میں ان کے کئی ٹھکانے تھے مگر وہ اپنے گینگ کے آدمیوں کو اس واردات سے بے خبر رکھنا چاہتے تھے۔ جہاں وہ عائشہ کو لے کر گئے وہ جگہ شہر سے شمال مشرق کی جانب ایک پہاڑی علاقے میں واقع تھی۔ رات کو عائشہ جاگ پڑی۔ اس کی دیکھ بھال کرنے والی عورت نے اسے شوربہ اور ڈبل روٹی کھانے کو دی جسے عائشہ نے زہر مار کر لیا اس نے عورت سے پوچھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ہم کولمبو پہنچ گئے کیا؟" عورت نے کوئی جواب نہ دیا اس کی ڈیوٹی میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ عائشہ کے کسی غیر ضروری سوال کا جواب نہیں دے گی۔

شہاب اور فیروز بڑے مطمئن تھے کہ وہ شیر خان کی بیٹی کو پاکستان سے نکال کر اپنے علاقے میں لے آئے ہیں۔ اب وہ دونوں کالے پانی کے جزائر کی طرف چلنے کی تیاریاں کرنے لگے شہاب کی رائے یہ تھی کہ لڑکی کو بذریعہ بحری جہاز کولمبو سے جزائر انڈیمان یعنی کالے پانی لے جایا جائے۔ وہ کہنے لگا۔

"ہم اسے ہوائی جہاز میں لانے کا خطرہ ایک بار مول لے چکے ہیں۔" فیروز نے کہا۔

"یہ خطرہ تو پھر بحری جہاز میں بھی موجود رہے گا۔"

شہاب بولا۔ "مگر بحری جہاز میں ہم ایک الگ کیبن بھی تو لے سکیں گے جہاں وہ ہماری چوبیس گھنٹے نگرانی میں رہے گی۔"

فیروز نے کہا۔

"ہوائی جہاز کا یہ فائدہ ہے کہ ہم اپنی منزل پر جلدی پہنچ جائیں گے۔ بحری جہاز تو ڈیڑھ دن لگا دے گا۔" آخر یہی طے پایا کہ عائشہ کو بذریعہ ہوائی جہاز ہی انڈیمان لے جایا جائے۔ فیروز نے عائشہ کو اپنی بھانجی ظاہر کیا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے عائشہ کے پاسپورٹ پر بھی کولمبو کے بھارتی قونصل جنرل کے دفتر سے انڈیمان کا ویزا لگوالیا۔ انہیں یہ بتایا کہ اس کی بھانجی شدید بیمار ہے اور وہ اسے اس کی والدہ کے پاس لے کر جا رہے ہیں جو انڈیمان میں رہتی ہے۔ کولمبو میں ویسے بھی شہاب اور فیروز کا بہت اثر و رسوخ تھا۔ اسے ویزہ لگوانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ انہوں نے احتیاطاً یہ ضرور کیا کہ جہاز میں سوار ہونے سے پہلے اپنے ایک خاص ڈاکٹر سے عائشہ کو بے ہوشی کا انجکشن لگوا دیا۔ اسے یہ بتایا گیا کہ گلوکوز کا انجکشن دیا جا رہا ہے۔ عائشہ سب جانتی تھی مگر وہ بے بس تھی۔ اس کے بازو اور

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ٹانگیں ابھی اس قابل نہیں تھیں کہ اس کا ساتھ دے سکتیں۔

عائشہ کو بے ہوشی کی حالت میں ہی کولمبو سے جزائر انڈیمان کی طرف پرواز کرنے والے طیارے پر سوار کرایا گیا۔ وہ معذوروں والی وہیل چیئر پر تھی۔ اور جب طیارہ انڈیمان کے سب سے بڑے جزیرے اور ایک طرح سے انڈیمان کے انڈین دارالحکومت پورٹ بلئیر کے ائرپورٹ پر اتر گیا تو عائشہ ابھی تک بے ہوش تھی۔ اب اس کی دیکھ بھال کرنے والی عورت ساتھ نہیں تھی۔ شہاب اور فیروز نے اسے کولمبو ہی سے واپس بھیجوا دیا تھا۔

جزائر انڈیمان لگ بھگ ایک ہزار جزیروں پر مشتمل ہے۔ شمالاً جنوباً ان جزائر کی لمبائی کوئی ایک سو میل ہو گی۔ ان میں کچھ بڑے جزیرے بھی ہیں جہاں شہری آبادی ہے۔ باقی جزیروں میں یہاں کی بونی مخلوق رہتی ہے۔ ان جنگلیوں کے رنگ سیاہ کالے قد چھوٹے اور بال حبشیوں کی طرح گھنگھریالے ہوتے ہیں۔ جو جزیرے شہری آبادی والے جزیرے کے قریب ہیں وہاں یہ جنگلی لوگ کسی کو کچھ نہیں کہتے مگر جو جزیرے چھوٹے اور سمندر میں دور دور واقع ہیں۔

وہاں ایک روایت کے مطابق آج بھی آدم خور جنگلی قبیلے آباد ہیں اور بھولے بھٹکے مسافر کو پکڑ کر بھون کر کھا جاتے ہیں۔ یہاں آتش فشاں پہاڑ بھی ہیں جس میں سے اکثر دھواں اور شعلے نکلتے رہتے ہیں۔ یہاں کوئی ندی نہر نہیں ہے۔ میٹھا پانی حاصل کرنے کے لئے کنوئیں کھودے جاتے ہیں اسے کالا پانی اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ان جزائر کے ارد گرد جو سمندر میلوں تک پھیلا ہوا ہے اس کا پانی کالا ہے۔ یہ سیاہی پانی میں سمندر کی گہرائی کی وجہ سے نظر آتی ہے جب کہ حقیقت میں پانی کو چلو میں بھریں تو وہ شفاف ہو گا۔ یہاں انگریزوں نے ایک بہت بڑا جیل خانہ بنوایا تھا۔ جہاں ان قیدیوں کو بند کیا جاتا جو کالے پانی کے جزیرے میں پہنچنے کے بعد کوئی جرم کرتے تھے۔ ورنہ سارے کا سارا جزیرہ یا جزائر ایک کھلا جیل خانہ تھا۔ قیدیوں کو یہاں کام کر کے پیسہ کمانے اور شادی کرنے کی اجازت تھی۔ مگر وہ ان جزیروں سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ انہیں ساری عمر وہیں بسر کرنی ہوتی تھی۔ انگریزوں کے جانے کے بعد بھارت نے ان جزیروں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ اب ان

جزیروں پر انڈیمان کی حکمرانی ہے اور اب انڈیمان کے عمر قید کی سزا پانے والے خطرناک قیدیوں کو کالے پانی کی جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔

فیروز اور شہاب کا ہندو قاتل دوست کانچورام جزائر انڈیمان کے شمال کی جانب واقع ایک جزیرے سینٹل میں رہتا تھا۔ جنوب کی طرف جو جزائر تھے انہیں نکوبار آئی لینڈ کہا جاتا تھا۔ شہاب اور فیروز یہاں اپنے جرائم پیشہ قاتل ساتھی کانچورام سے ملنے ایک سے زیادہ مرتبہ آ چکے تھے۔ انہوں نے کولمبو سے روانہ ہوتے ہوئے کانچورام کو ٹیلی گرام دے دیا تھا چنانچہ وہ پورٹ بلئیر کے ہوائی اڈے پر اترے تو کانچورام کا آدمی وہاں پہلے سے موجود تھا۔ وہ شہاب اور فیروز کو جانتا تھا۔ یہاں سے عائشہ کو ٹیکسی میں ڈال کر بندر گاہ کی طرف لے جایا گیا وہاں یہ ایک چھوٹے سے اسٹیمر میں بیٹھ کر ایک گھنٹے کا سمندری سفر طے کرنے کے بعد جزیرہ سینٹل پہنچ گئے جہاں کانچورام کا خاص ڈرائیور ایک پرانی سی جیپ لے کر انہیں لینے آیا ہوا تھا۔

یہ جو کانچورام تھا اس نے جزیرے کے ہندو مدراسی کمشنر اور وہاں کی پولیس کے ساتھ مل کر اپنی ایک الگ حکومت بنا رکھی تھی۔ کہنے کو تو وہ عمر قید کا قیدی تھا مگر جزیرے میں کسی راجہ کی طرح رہتا تھا۔ انگریز کے زمانے میں وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا مگر انگریز چلا گیا۔ جزائر انڈیمان پر انڈیا نے قبضہ کر لیا اور وہاں بھی بھارت کے دوسرے علاقوں کی طرح بدعنوانیوں اور رشوت ستانی کا بازار گرم ہو گیا۔

کانچورام اس جزیرے کا سب سے بڑا بدمعاش اور اسمگلر تھا۔ پولیس افسروں اور مدراسی کمشنر کو گھر بیٹھے ہر ماہ بھاری رقم مل جاتی تھی چنانچہ کانچورام کو من مانی کرنے کی کھلی چھٹی مل گئی تھی۔ وہ درمیانے قد مگر گٹھے ہوئے جسم کا آدمی تھا۔ عمر پچاس کے قریب تھی۔ سر درمیان سے گنجا تھا۔ کنپٹیوں پر سفید بال نظر آتے تھے۔ ماتھے پر ہمیشہ تلک لگا کر رکھتا اور پوجا پاٹ بھی باقاعدگی سے کرتا۔ اس کی عمل داری میں جزیرے کے مقامی انڈین قیدی بدمعاشوں کا ایک پورا گینگ تھا۔ یہ سب قاتل تھے جو کالے پانی میں عمر قید کی سزا بھگت رہے تھے۔ کانچورام نے اپنے واسطے آبادی سے تھوڑے فاصلے پر بانس اور تاڑ کے درختوں کے درمیان اپنا ایک الگ مکان بنوا رکھا تھا۔ اپنے مکان سے وہ بگھی میں سوار ہو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کر نکلتا۔ جزیرے کی آبادی کا چکر لگاتا۔ لوگ جھک جھک کر اسے سلام کرتے۔ وہ کبھی کمشنر اور کبھی ہندو انسپکٹر پولیس کے بنگلوں میں جا کر انہیں تحفے تحائف پیش کرتا۔ جزیرے کے لوگ اس سے ڈرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ بدمعاش کانچورام کو کمشنر اور پولیس کا تحفظ حاصل ہے اور اسے کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔

سارے جزیرے میں کانچورام کے ڈیرے کی کشید کی ہوئی دیسی شراب بکتی تھی۔ اس کے پاس تھائی لینڈ سے اسمگلنگ کا مال بھی آتا تھا جسے وہ آگے انڈیمان اور لنکا میں سپلائی کرتا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی مگر گھر میں دو انڈیمانی لڑکیاں ڈال رکھی تھیں جن کے غریب ماں باپ کو وہ ہر ماہ ایک خاص رقم بھیج دیتا تھا۔ اس کے علاوہ جزیرے میں اگر کوئی لڑکی اسے پسند آجاتی تو وہ اسے راتوں رات غائب کروا کر اپنے خفیہ اڈے پر پہنچا دیتا تھا۔

شہاب اور فیروز کو لینے کے واسطے کانچورام نے اپنی بگھی بھجوا دی تھی۔ جب بگھی کانچورام کے مکان کے احاطے میں آکر رکی تو عائشہ کی جوانی اور حسن کو دیکھ کر کانچورام کے سینے میں ہوس کی آگ بھڑکنے لگی۔ وہ شہاب اور فیروز سے گلے لگ کر ملا فیروز سے دبی زبان میں پوچھا لڑکی کو وہیل چیئر پر کیوں لائے ہو؟ فیروز نے کہا۔

"اس کا نچلا دھڑ سن ہو گیا ہے فکر نہ کرو کچھ دنوں میں لڑکی بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔" پھر اسے آنکھ ماری اور شہاب کی طرف متوجہ ہو کر کہا: "شہابو اس رانی کو کمرے میں لے جا کر لٹا دو۔" عائشہ کو وہیل چیئر میں ایک سجے سجائے کمرے میں لے جایا گیا جہاں مسہری لگی تھی۔ ریشمی گاؤ تکیے پڑے تھے۔ کھڑکیوں کے ریشمی پردوں میں سے دن کی روشنی چھن چھن کر کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ کانچورام کی دونوں انڈیمانی داشتائیں عائشہ کو حیرت اور رقابت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھ رہی تھیں۔ وہ کالی تھیں جب کہ ان کے مقابلے میں عائشہ کا رنگ گورا اور بال سنہری تھے اور وہ کوئی مہارانی لگ رہی تھی۔

دوسرے کمرے کے آگے لکڑی کے فرش والے برآمدے میں بانس کی آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے شہاب فیروز اور کانچورام ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ ان کے درمیان میز پر شراب کی بوتل کھلی ہوئی تھی۔ کانچورام نے فیروز کو آنکھ ماری اور شیطانی مسکراہٹ

کے ساتھ کہا۔

"مال اچھا ہے کہاں سے مارا ہے؟" شہاب اور فیروز نے کانچو کو بالکل نہیں بتایا کہ یہ ان کے اسمگلر ساتھی شیر خان کی بیٹی ہے۔ فیروز کہنے لگا۔

"یار تمہیں اس سے کیا بس سمجھ لو۔ کہیں سے اڑا لائے ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ کتنی رقم دو گے؟" کانچو رام ہنس پڑا۔ سگریٹ کو گھاس پر پھینکا اور بولا۔

"تم میرے پرانے یار ہو۔ جو مانگو دے دوں گا۔"

شہاب کہنے لگا۔

"بس ایک بات کا خیال رکھنا کانچو کہ یہ لڑکی یہاں سے باہر نہ نکلنے پائے ورنہ پھر کوئی ہرج مرج ہو گیا تو ہم ذمے دار نہیں ہوں گے۔" کانچورام نے شراب کا ہلکا سا گھونٹ لینے کے بعد گردن کو ذرا ٹیڑھا کر کے شہاب کی طرف دیکھا اور بولا۔

"شہابو! یہ تم مجھے کہہ رہے ہو؟ میرے ڈیرے پر جو لڑکی ایک بار آجاتی ہے پھر اس کی آتما بھی مرنے کے بعد میرے ڈیرے میں ہی رہتی ہے۔" شہاب ہنس دیا۔ فیروز نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"بس ٹھیک ہے باقی اب یہ تمہارا مال ہے اس کے ساتھ جو چاہو سلوک کرو۔ ہم کل واپس کولمبو چلے جائیں گے۔" دوسرے دن شہاب اور فیروز واپس چل دیے اب عائشہ کالے پانی کے ایک چھٹے ہوئے ہندو بدمعاش اور قاتل کے قبضے میں تھی۔ کانچورام کو یہ بالکل نہیں بتایا گیا تھا کہ عائشہ ایک بہادر انسان کی دلیر لڑکی ہے اور دو بدمعاشوں کو پستول سے بھون چکی ہے۔ وہ عائشہ کو ایک عام کمزور اور نازک سی لڑکی سمجھ رہا تھا جو کہیں سے اغوا ہوئی تھی اور پھر مختلف ہاتھوں میں بکتی بکاتی شہاب اور فیروز کے ہتھے چڑھ گئی اور وہ اسے ایک معقول رقم کے عوض اس کے پاس فروخت کر گئے ہیں پہلی ہی رات وہ عائشہ کے پلنگ پر آکر بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا۔

"تمہارا نام مجھے شہابو نے عیشہ بتایا ہے۔ خیر تم ایسی عورتوں کا کوئی نام نہیں ہوتا۔ میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے تمہیں پچاس ہزار روپوں میں خرید لیا ہے۔ اب تم میری داسی ہو۔ تمہیں میرے اشاروں پر چلنا ہو گا۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ تم کالے پانی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں یہاں کے سب سے طاقتور بدمعاش کانچورام کے رجواڑے میں ہو۔ میں کانچورام اس جزیرے کا مالک ہوں۔ یہ میرا رجواڑہ ہے اور میں یہاں کا راجہ ہوں۔ تم میرے مکان سے بھاگ بھی جاؤ گی تو اس جزیرے سے باہر نہ نکل سکو گی۔ جزیرے کے چاروں طرف کالا سمندر ہے میرے آدمی اور میری تنخواہ دار پولیس جہاں کہیں بھی تم چھپی ہوئی ہو گی پکڑ کر میرے پاس لے آئے گی۔ پھر میں تمہارا جو حشر کروں گا اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتی ہو۔" پھر اس نے اپنا ہاتھ عائشہ کی گردن کی ایک جانب رکھ دیا۔ عائشہ نے اسی لمحے دل میں ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے کانچورام کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر دبایا اور بڑے محبت بھرے انداز میں کہا۔

"میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے تم جیسا بہادر مرد مل گیا۔ ورنہ مجھے تو کسی نہ کسی کے پاس بکنا ہی تھا۔ لیکن ان لوگوں نے مجھے بے ہوش کرنے کے لئے کوئی ایسی دوائی پلا دی کہ جس کا اثر ابھی تک باقی ہے۔ میرا نچلا دھڑ بے حس ہو چکا ہے۔ سہارے کے بغیر ایک قدم نہیں اٹھا سکتی۔ تھوڑا انتظار کر لو۔ میں تو تمہاری داسی ہوں ساری زندگی تمہارے پاس ہی رہنا ہے اب تو۔"

کانچورام سے اس قسم کی محبت بھری باتیں پہلے کسی عورت نے نہیں کی تھیں۔ انڈیمانی لڑکیاں ہندوستانی ضرور بول لیتی تھیں مگر وہ محبت کی باتیں اتنی اچھی اردو زبان میں نہیں کر سکتی تھیں۔ کانچورام کو اپنے آبائی شہر کاشی کی اردو یاد آگئی۔ اس نے عائشہ کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"فکر نہ کرو۔ میری رام پیاری میں یہاں کے سب سے بڑے ڈاکٹر سے تمہارا علاج کراؤں گا۔ تم دنوں میں اچھی ہو جاؤ گی۔"

پھر اس نے عائشہ سے باتیں شروع کر دیں اور پوچھنے لگا کہ وہ کون ہے اور پہلی بار کیسے گھر سے بھاگی یا اغوا ہوئی؟ عائشہ کے ذہن میں ایک پورا منصوبہ مرتب ہو چکا تھا۔ اسے یہ تو ابھی علم نہیں تھا کہ وہ اس کالے پانی سے کیسے فرار ہو سکے گی لیکن اس کے سینے میں جو یقین کا بے پایاں جذبہ اس کے دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ دھڑک رہا تھا وہ اسے ہر سانس کے ساتھ یقین دلا رہا تھا کہ عائشہ تم یہاں سے ایک دن نکل جاؤ گی۔ اس نے یونہی ایک

جھوٹی کہانی گھڑ کر سنا دی کہ اس کے ماں باپ مر چکے ہیں۔ ایک لڑکے کی محبت میں وہ گھر سے نکل بھاگی لڑکا دغا دے گیا۔ پھر وہ بدمعاشوں کے ہتھے چڑھ گئی اور مختلف ہاتھوں سے ہوتی ہوئی شہاب اور فیروز کے پاس پہنچ گئی۔ کانچورام نے عائشہ کا ہاتھ دبایا اس کے چہرے پر ہوس کی لہریں امڈ آئیں کہنے لگا۔

"میری بڑی حسرت تھی کہ کسی پنجابی مسلمان لڑکی کو اپنی داسی بناؤں۔ بھگوان نے میری یہ آرزو بھی پوری کر دی۔"

عائشہ کی آنکھیں میں چنگاریاں پھوٹنے لگیں۔ مگر اس نے بڑی ہمت کر کے چہرے پر مسکراہٹ طاری کی اور کہا۔

"اب تو تم میرے بھگوان ہو۔ جیسے کہو گے ویسے رہوں گی۔"

پھر باتوں ہی باتوں میں عائشہ نے کانچو رام سے پوچھا کہ یہ شہاب اور فیروز کالے پانی سے کس طرف گئے ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔ کانچو رام کہنے لگا۔

"اری اب تمہارا ان لوگوں سے کیا سروکار؟ چاہے وہ جہاں چلے گئے ہوں۔" مگر عائشہ ہر حالت میں ان کا اتا پتا معلوم کرنا چاہتی تھی۔ کہنے لگی۔

"میں تو اس ڈر کے مارے پوچھ رہی ہو کہ کہیں یہ دونوں حرامی پھر مجھے یہاں سے اغوا کر کے نہ لے جائیں۔"

اس پر کانچورام قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"اری میری رام پیاری۔ ان گیدڑوں میں یہ ہمت کہاں کہ شیر کا مال اٹھا کر لے جائیں۔ اور پھر وہ دونوں حرامی لنکا واپس چلے گئے ہیں۔" عائشہ کو صرف اتنی ہی معلومات چاہیے تھیں۔ باقی یہ دونوں بدکار آدمی لنکا میں کیا دھندا کرتے تھے اس کے متعلق عائشہ کے باپ شیر خان نے اسے سب کچھ بتا دیا ہوا تھا۔ شیر خان نے تو اپنی شیرنی بیٹی کو اپنی زندگی کی ساری کہانی سنا رکھی تھی اور بتایا تھا کہ وہ اور اس کی ماں روپی نوجوانی کے زمانے میں سری لنکا کے شمال میں جافنا کے جنگلوں میں اسمگلنگ کا دھندا کیا کرتے تھے۔

کانچورام تھوڑی دیر عائشہ کے پاس پلنگ پر بیٹھا باتیں کرتا رہا پھر یہ کہہ کر کہ وہ ڈاکٹر سے بات کرنے جا رہا ہے چلا گیا۔ عائشہ کی جسمانی حالت یہ تھی کہ اس کے دونوں بازو پوری

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرح صحت یاب ہو چکے تھے۔ ٹانگوں کی بے حسی بھی بہت حد تک دور ہو چکی تھی۔ مگر ابھی وہ اپنے پاؤں پر پورا بوجھ نہیں ڈال سکتی تھی۔ وہ ایک نوکرانی کے سہارے غسل خانے تک آتی جاتی۔ یہ نوکرانی ادھیڑ عمر کی کالی کلوٹی عورت تھی اور کالے پانی ہی کی رہنے والی تھی۔ اسے اس جزیرے کی انگریزوں کے زمانے سے لے کر اب تک کی ساری ہسٹری معلوم تھی۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ جزائر انڈیمان کا محل وقوع کیا ہے اور یہ کہ یہاں جو قیدی آتا ہے پھر اسی جزیرے میں مر کر دفن ہوتا ہے۔ یہاں سے کبھی کوئی فرار نہیں ہو سکا تھا۔ ارد گرد سینکڑوں میل کا کالا سیاہ سمندر تھا۔ اس کے باوجود عائشہ ذہن میں فرار کے منصوبے سوچتی رہتی تھی۔

ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ کانچورام ایک ڈاکٹر کو لے کر آگیا۔ یہ ایک سکھ ڈاکٹر تھا جس کی داڑھی مونچھوں کے بال سفید ہونا شروع ہو گئے تھے گلے میں اسٹیتھوسکوپ لٹکی ہوئی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں کالا بیگ تھا۔ عائشہ حسب معمول پلنگ پر ٹیک لگائے نیم دراز تھی۔ کانچورام نے ڈاکٹر سے کہا۔

"یہ ہے جی میری رام پیاری۔ بس اسے دو چار دن میں ٹھیک کر دو۔" سکھ ڈاکٹر نے عائشہ کی ٹانگوں سے چادر ہٹائی اور اس کے پیسر کے انگوٹھے کو دبانے لگا۔ دوسرے پیر کے انگوٹھے کو دبایا۔ اور عائشہ کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔

"کچھ محسوس ہوتا ہے؟" عائشہ نے ڈاکٹر کی انگلیوں کے دباؤ کو برابر محسوس کیا تھا۔ اس نے نفی میں گردن ہلائی اور کہا۔ "کچھ محسوس نہیں ہوا۔" سکھ ڈاکٹر عائشہ کی پنڈلیوں کو دو انگلیوں سے دبانے لگا۔

"اب کچھ محسوس ہوا؟"

"نہیں۔" عائشہ نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر نے چادر دوبارہ ڈال دی۔ کرسی پر بیٹھ گیا اور کانچورام سے کہنے لگا

"بھائیا جی! لگتا ہے اس کی دونوں ٹانگوں پر فالج گر چکا ہے۔ مجھے یہ بات مریض کے سامنے نہیں کہنی چاہیئے تھی مگر میں تمہیں صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں۔" کانچورام ڈاکٹر کا منہ تکنے لگا۔

"کیا یہ لڑکی اب ٹھیک نہیں ہو گی۔ میری ساری رقم ڈوب جائے گی؟" سکھ ڈاکٹر نے بیگ میں سے پیڈ نکالا اور پینسل سے اس پر لکھتے ہوئے بولا۔

"مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں ہر بیماری کا علاج موجود ہے۔ میں دوائی لکھے دیتا ہوں۔ اسے باقاعدہ دوائی دیتے رہو۔ میں بھی روز آکر دیکھ جایا کروں گا۔ واہگورو کی کرپا سے یہ اچھی ہو جائے گی کانچورام جی۔" کانچورام نے ایک دم ادھیڑ عمر سکھ ڈاکٹر کو گردن سے پکڑ کر زور سے دھکا دیا۔ ڈاکٹر بے چارہ کرسی پر سے پیچھے کی طرف قالین پر گر پڑا۔ کانچورام نے ڈاکٹر کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور دو تین جھٹکے دے کر دانت پیستے ہوئے بولا۔

"تمہارے واہگورو نے نہیں، تم نے اسے ٹھیک کرنا ہے۔ کیا سمجھے ہو؟" ادھیڑ عمر کے سکھ ڈاکٹر کی عینک نیچے گر پڑی تھی۔ نسواری رنگ کی پگڑی اپنی جگہ سے ہل گئی تھی۔ وہ خوف زدہ تھا۔ کہنے لگا۔

"مہاراج میں اسے ٹھیک کر دوں گا مجھے معاف کر دو۔ غلطی ہو گئی۔"

عائشہ بستر پر نیم دراز یہ سارا ڈراما دیکھ رہی تھی۔ اسے سکھ ڈاکٹر پر رحم آرہا تھا۔ کانچورام کی دہشت اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر دوبارہ نسخہ لکھنے بیٹھ گیا۔ اس نے کپکپاتی ہوئی انگلیوں سے نسخہ لکھ کر عائشہ کو دیا اور کہا۔

"بیٹی یہ دوا بڑی دکان سے منگوا کر صبح شام کھانا۔ میں کل اسی وقت آکر تمہیں دیکھ جاؤں گا۔"

کانچورام اس کے سر پر کھڑا تھا۔ سکھ ڈاکٹر نے بیگ اٹھایا کانچو کو ہاتھ جوڑ کر نمستے کہا اور عاجزی سے قدم اٹھاتا کمرے سے نکل گیا۔ کانچو نے فاتحانہ انداز سے عائشہ کی طرف دیکھا۔

"ان لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کروں تو کبھی ٹھیک طرح سے کام نہ کریں۔"

پھر جھک کر عائشہ کے گال کو انگلیوں میں لے کر زور سے دبایا۔ عائشہ کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی مگر وہ بستر پر ہی لیٹی رہی۔ وہ مجبور تھی کانچورام یہ کہہ کر باہر چلا گیا۔

"جلدی ٹھیک ہو جاؤ نہیں تو تمہیں جنگلی کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔"

عائشہ خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ دوسرے روز دوپہر کے بعد سکھ ڈاکٹر آیا تو کانچو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رام اس کے ساتھ نہیں تھا۔ ڈاکٹر آتے ہی کرسی کھینچ کر عائشہ کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی نبض دیکھی۔ پھر چادر ہٹا کر پاؤں کے انگوٹھوں کو دبایا اور پوچھا۔

"دوائی لی تھی؟" عائشہ کو کانچو رام نے اپنی نگرانی میں دونوں وقت دوائی کے کیپسول کھلائے تھے۔ ڈاکٹر جانے لگا تو کانچو رام بھی شراب کے نشے میں جھومتا ہوا آیا۔ آتے ہی سکھ ڈاکٹر کو گردن سے پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دے کر پوچھا۔

"کیوں بے ڈاکٹرا کب ٹھیک ہوں گی اس رام پیاری کی ٹانگیں؟"

مرنجان مرنج سکھ ڈاکٹر نے خوشامدانہ انداز میں مسکراتے ہوئے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"مہاراج! پہلے دن ہی دوائی کا اثر شروع ہو گیا ہے۔ تھوڑی مہلت دیں۔"

اگلے روز سکھ ڈاکٹر اور عائشہ کمرے میں اکیلے تھے۔ ڈاکٹر نے عائشہ کی پنڈلیوں کو انگلی سے دو تین بار دبانے کے بعد کپڑا ڈالا اور کرسی قریب کرتے ہوئے رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔

"بیٹی! میرا حساب کہتا ہے کہ تمہاری ٹانگیں ٹھیک ہیں۔ تم کیا کہتی ہو؟"

عائشہ ڈاکٹر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔ عائشہ کی آنکھوں کی مقناطیسی چمک کو سکھ ڈاکٹر نے بھی محسوس کیا بولا۔

"بیٹی! میں جانتا ہوں تو کسی غیرت والے مسلمان مرد کی اولاد ہے۔ اور تقدیر نے تمہیں اس حال تک پہنچا دیا ہے۔ کانچو رام بڑا خونی آدمی ہے یہاں اسی کا حکم چلتا ہے۔ جس کو چاہے قتل کروا دے۔ اس نے مجھے تمہارا نام رام پیاری بتایا ہے۔ مگر تم مجھے کسی مسلمان کی بچی لگتی ہو۔ کیا یہ سچ ہے؟"

عائشہ کے دل میں امید کی ایک کرن چمک اٹھی۔ کالے پانی کے عذاب سے نکلنے کے لئے اس نیک دل سکھ ڈاکٹر سے مدد لی جا سکتی تھی۔ مگر بے حد احتیاط کی ضرورت بھی تھی۔ ذرا سی غفلت اسے ساری زندگی کے لئے جہنم میں دھکیل سکتی تھی۔ اس نے کہا۔

"ہاں ڈاکٹر جی! میں مسلمان ہوں۔ ہمارا گھر راولپنڈی کے پاس مری روڈ پر تھا۔"

یہ سن کر فرط جذبات سے سکھ ڈاکٹر کی آواز بھرا گئی۔ وہ بے اختیار بول اٹھا۔

"راولپنڈی؟ میں قربان جاؤں راولپنڈی کے میں بھی گوجر خان کا رہنے والا ہوں۔

وہیں پیدا ہوا تھا۔" اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک اٹھے پھر جلدی سے رومال کوٹ کی جیب سے نکال کر عینک اوپر کر کے آنکھیں صاف کیں۔ ایک بار پیچھے گھوم کر دیکھا اور بولا۔

"بیٹی! میں مجبور ہوں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ پوتے پوتیوں والا ہوں۔ کانچو رام بڑا ظالم آدمی ہے۔ یہ میرے سارے خاندان کو قتل کروا دے گا۔ اچھا کل آؤں گا جاتا ہوں۔"

عائشہ کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ سکھ ڈاکٹر اس کی ضرور مدد کرے گا۔ کم از کم اتنی ضرور مدد کرے گا کہ اسے کانچو رام کی قید سے نکال دے۔ اگلے روز سکھ ڈاکٹر نے دوائی بدل دی۔ عائشہ نے نئے کیپسول کھائے تو کانچو رام پلنگ پر بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر بھی پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ کہنے لگا۔

"کانچو رام جی! لڑکی ٹھیک ہو رہی ہے۔ اس کے پاؤں میں جان پڑ گئی ہے۔"

کانچو رام اٹھ کھڑا ہوا۔ عائشہ کے گال پر ہاتھ پھیرنے لگا تو عائشہ نے بے اختیار سی ہو کر اس کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ کانچو رام نے فوراً ہی عائشہ کے منہ پر الٹے ہاتھ سے تھپڑ مار دیا۔ عائشہ کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ سکھ ڈاکٹر پیچھے ہٹ گیا۔ کانچو نے عائشہ کی گردن کو دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا اور دبانے لگا۔ عائشہ کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔ کانچو رام وحشی ہو گیا تھا۔ پھر نہ جانے اس کے دل میں کیا خیال آیا کہ اس کی گرفت ڈھیلی ہو گئی۔ ہاتھ عائشہ کی گردن سے الگ کیے اور اسے گالی دے کر کہنے لگا۔

"اپنے پچاس ہزار روپے کھرے کر کے تجھے نار دوں گا مسلمان کی اولاد مسلمانوں کا تو میں جانی دشمن ہوں۔"

سکھ ڈاکٹر سہما ہوا ایک طرف ہو کر کھڑا تھا۔ اسے بھی کانچو نے ایک موٹی سی گالی دی اور دھمکی دے کر کہا۔

"سن لے تو بھی۔ ایک ہفتے میں اس کی ٹانگیں ٹھیک نہ ہوئیں تو میں تیری پوتی اٹھا کر لے آؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ غصے میں بھرا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جانے کے بعد عائشہ نے سکھ ڈاکٹر کو بتایا کہ اس کی ٹانگیں بہت پہلے سے ٹھیک ہو چکی ہیں مگر وہ کانچو رام کو اس لئے نہیں بتا رہی تھی کہ پھر اس کی عزت ان بدمعاشوں کے ہاتھوں غیر محفوظ ہو جائے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گی۔ سکھ ڈاکٹر کو عائشہ سے بڑی ہمدردی ہو گئی تھی۔ اگرچہ وہ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا مگر اس کی تکلیف بھی ڈاکٹر سے دیکھی نہیں جاتی تھی وہ عائشہ کو انجکشن لگاتے ہوئے کہنے لگا۔

"تم یہ بات کب تک چھپاؤ گی بیٹی! یہ درندے تمہیں اب زیادہ دن تک معاف نہیں کریں گے۔ خود تمہارے سامنے اس نے مجھے بھی دھمکی دی ہے کہ اگر تم جلدی ٹھیک نہ ہوئیں تو وہ میسری پوتی کو اٹھوا۔۔۔۔۔ لے گا" عائشہ نے بڑے تحمل سے کہا۔

"تم فکر نہ کرو ڈاکٹر میں تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچنے دو گی" سکھ ڈاکٹر بیگ بند کرتے ہوئے بولا۔

"میں رات کو پھر آؤں گا۔ اس وقت تمہیں تھوڑا چلا کر چیک کروں گا کہ تم کہاں تک ٹھیک ہو چکی ہو"

ڈاکٹر چلا گیا۔ عائشہ خادمہ کے سہارے باتھ روم گئی تو اس نے دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر اس نے دونوں پاؤں پر زور ڈالا۔ اس کی ٹانگیں بالکل ٹھیک ہو چکی تھیں۔ وہ بخوبی چل پھر سکتی تھی۔ اس کے بازوؤں میں بھی تازہ گرم خون گردش کرتا محسوس ہونے لگا تھا۔ وہ اپنی صحت یابی کو اب زیادہ دیر تک بدمعاش کانچورام سے چھپا کر نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ شخص اس کو بے آبرو کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ عائشہ کے لئے اب وہاں سے فرار ہونا ناگزیر ہو گیا تھا۔ وہ یہی سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ یہاں سے بھاگ کر جائے کہاں؟ تھوڑی سی امید اسے سکھ ڈاکٹر پر تھی جس کا رویہ ہمدردانہ اور مشفقانہ تھا مگر وہ بھی اپنے بچوں کی وجہ سے کانچورام سے خوف زدہ تھا۔

اس روز شام کے وقت جزیرے پر بادل چھا گئے اور بارش شروع ہو گئی۔ خادمہ عائشہ کو چائے اور دو سیب دے کر چلی گئی تھی۔ اس دوران کانچورام نے ایک بار عائشہ کے بیڈ روم میں آکر اسے بتایا تھا کہ وہ اب زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔ اس کا صاف مطلب یہی تھا کہ وہ آج رات شراب کے نشے میں دھت ہو کر عائشہ کے بیڈ روم میں ضرور آئے گا۔ عائشہ بستر پر نیم دراز سیب چھیلنے لگی۔ اس نے چھری کو غور سے دیکھا۔ یہ ہاتھی دانت کے دستے والی چھری تھی اور اس کا پھل کافی مضبوط اور چوڑا تھا۔ اگرچہ دھار زیادہ تیز نہیں

تھی۔ عائشہ نے سیب کو چھیلنے اور کاٹنے کے بعد چھری اپنے تکیے کے نیچے چھپا کر رکھ لی۔ یہی وہ اکیلا ہتھیار تھا جو اس کے کام آسکتا تھا۔ خادمہ برتن لینے آئی تو اسے یہ خیال ہی نہ آیا کہ طشت میں چھری نہیں ہے۔ وہ برتن لے کر چلی گئی۔ اس وقت باہر بارش ہو رہی تھی جس کی آواز کھڑکی میں سے سنائی دے رہی تھی۔ کھڑکی پر گرے ہوئے ریشمی پردے ہوا میں لہرانے لگے تھے۔ باہر برآمدے کے کونے کی جانب سے عائشہ کو کانچورام کے قہقہوں اور اپنے گینگ کے ساتھیوں سے ہنسی مذاق کی باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ لوگ شراب پی رہے تھے۔ عائشہ کو یہ خیال بھی تھا کہ سکھ ڈاکٹر بھی رات کو آنے کے لیے کہہ گیا ہے۔ شام کے بعد رات کا اندھیرا باہر گہرا ہو گیا تھا۔ برآمدے میں ہلکی ہلکی روشنی ہو رہی تھی آہستہ آہستہ برآمدے میں بیٹھے بدمعاشوں کی آوازیں بھی کم ہوتی گئیں۔ پھر اسے کانچورام کی آواز سنائی دی۔ اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگا کر اپنے کسی ساتھی کو گالی دے کر اونچی آواز میں کہا۔

"جاؤ اپنی اپنی ماؤں کے پاس۔ ادھر اب کوئی نہ آئے۔" عائشہ سنبھل گئی۔ کانچورام کے ساتھی چلے گئے تھے اور یہ بدمعاش شراب پی کر اب اسی کے کمرے کی طرف آرہا تھا۔ عائشہ اسے قتل کر دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس کا ذہن بڑی تیزی اور پوری ہوشمندی کے ساتھ صرف ایک ہی بات سوچ رہا تھا اور وہ بات یہ تھی کہ سیب اور ترکاری کاٹنے والی چھری کا وار وہ کس طرف سے کرے کہ ایک ہی وار کاری ثابت ہو اور کانچورام دوسرا سانس بھی نہ لے سکے اور شور بھی نہ مچا سکے۔ کانچو کسی بدمست بھینسے کی طرح جھومتا ہوا چلا آرہا تھا۔ دروازے کو بند کر کے اس نے کنڈی نہیں لگائی تھی اسے کنڈی لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہاں کسی کی جرات نہیں تھی کہ اندر داخل ہو سکے۔ چھری عائشہ کے تکیے کے نیچے پڑی تھی۔ وہ عائشہ کے بستر کے پاس آکر رک گیا۔ اس کی آنکھیں شراب کے نشے میں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے ایک ہاتھ سے عائشہ کے اوپر پڑی ہوئی چادر پرے پھینک دی۔

"میری رام پیاری آج میں تجھے نہیں چھوڑوں گا" نشے کی وجہ سے وہ اپنے پاؤں پر آگے پیچھے جھوم رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کانچورام بھوکے درندے کی طرح عائشہ پر جھپٹ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پڑا۔ اس دوران عائشہ کا ہاتھ تکیے کے نیچے چھری پر چلا گیا تھا۔ مگر وہ کانچورام کی کمر پر وار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس طرح سے چھری کے گوشت کے اندر جا کر ٹوٹ جانے کا خطرہ تھا۔ وہ سامنے کی جانب اس جگہ وار کرنا چاہتی تھی جہاں دونوں طرف کی پسلیاں آکر مل جاتی ہیں اور دل بھی بہت قریب ہوتا ہے۔ کانچورام بدمستی کے عالم میں عائشہ کو بھنبھوڑ رہا تھا۔ عائشہ نے چھری کے دستے پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے کانچورام کو پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔

"کیا کرتے ہو؟" کانچورام عائشہ کا ہلکا سا دھکا کھا کر بالکل سامنے آگیا تھا۔ بس عائشہ کو اسی گھڑی کا انتظار تھا۔ اس کے اور کانچورام کے درمیان صرف آدھے گز کا فاصلہ تھا۔ عائشہ بجلی کی طرح کودی اور اس کے ساتھ ہی پوری طاقت سے سیدھے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھری کانچورام کے سینے کے نیچے پسلیوں کے درمیان میں گھونپ دی۔ عائشہ نے پوری کوشش کی تھی کہ چھری کا رخ بائیں جانب دل کی طرف رہے۔ کانچورام کو ایک جھٹکا سا لگا۔ عائشہ نے چھری کو باہر نکال کر عین اسی جگہ دوسرا بھرپور وار کر دیا۔ اب اس کے ہاتھوں پر گرم خون کی دھار بہنے لگی۔ عائشہ نے چھری کانچورام کے سینے میں ہی رہنے دی۔ اور تڑپ کر اپنے آپ کو پلنگ سے نیچے قالین پر گرا دیا۔ چھری کا دوسرا وار اس بدمعاش کے دل پر لگا تھا۔ اس کے حلق سے غراہٹ کی آواز نکلی۔

عائشہ اٹھی اس کے شیر دل باپ شیر خان نے اسے جو کمانڈو ٹریننگ میں داؤ بتا رکھے تھے اس نے ان پر عمل کرتے ہوئے پیچھے سے کانچورام کی گردن پر بھرپور ہاتھ مارا۔ کانچورام آگے کو بستر پر گر پڑا۔ بیڈ روم میں صرف ایک ہی بتی جل رہی تھی۔ اس کی روشنی زیادہ نہیں تھی۔ عائشہ کو جب یقین ہو گیا کہ کانچورام جہنم کے سفر پر روانہ ہو چکا ہے تو اس نے جلدی جلدی چادر اور صوفے پر سے کمبل اٹھا کر اس کے اوپر ڈالا اور بتی بجھا دی۔ بتی کے بجھتے ہی پہلے تو اندھیرا چھا گیا پھر کھلی کھڑکی کے ریشمی پردوں میں سے باہر برآمدے والی بتی کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آنے لگی۔ عائشہ نے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ وہاں کانچورام کا خون لگا تھا۔ اس نے چادر سے خون صاف کیا۔ ایک بار پھر بستر کے قریب جا کر کمبل کو پرے ہٹا کر دیکھا۔ کانچورام مر چکا تھا مگر شراب کی گرمی کی وجہ سے اس کا بدن ابھی

تک گرم تھا اور خون ابل رہا تھا۔

عائشہ نے غسل خانے میں جا کر اپنا ہاتھ دھویا بالوں میں جلدی جلدی کنگھی کی باہر آکر کھڑکی کا تھوڑا سا پردہ ہٹا کر برآمدے میں دیکھا برآمدے میں کرسیاں اور میز پر جہاں بیٹھ کر یہ بدمعاش شراب پی رہے تھے خالی پڑی تھی۔ بارش رک گئی تھی مگر بادل اسی طرح گھرے تھے اور کبھی کبھی ان میں بجلی چمک جاتی تھی۔ عائشہ نے الماری کھولی اس میں سے برساتی نکال کر پہنی۔ اس کا ہڈ سر کے اوپر کیا۔ اور کمرے سے نکل کر برآمدے میں چلتی کانچورام کے بیڈ روم میں آگئی جونہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو کیا دیکھتی ہے کہ قالین پر کانچورام کا ایک بدمعاش ساتھی ایک انڈیمانی لڑکی کو پہلو میں لیے قالین پر شراب کے نشے میں دھت بے ہوش پڑا ہے۔ انڈیمانی لڑکی جاگ رہی تھی۔ اس نے عائشہ کو دیکھا تو اپنے کپڑے ٹھیک کرتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

عائشہ نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور دبے پاؤں آکر شرابی بدمعاش کے قریب بیٹھ گئی۔ یہ کانچورام کا دست راست بدمعاش تھا جس کے ہاتھوں کانچورام کئی لوگوں کا خون کروا چکا تھا۔ سہمی ہوئی کالی کلوٹی انڈیمانی لڑکی ذرا پیچھے کو ہٹی تو عائشہ نے اسے گریبان سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اس کے کان کے پاس منہ لا کر کہا۔

"بیٹھی رہو۔ منہ بند رکھو۔"

دوسرے لمحے عائشہ کے ہاتھوں نے نشے میں بے ہوش بدمعاش کی گردن کو اپنے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔ وہ آدمی پہلے ہی شراب کے نشے میں بے ہوش تھا۔ اس کا نرخرہ اور گردن کی دونوں طرف خون لے جانے والی نالیوں کو عائشہ کی مضبوط گرفت نے بند کر دیا تھا۔ ایک دو بار بے ہوش شرابی نے اپنا منہ اس طرح کھولا جیسے سانس لینے کی کوشش کر رہا ہو مگر اس نے جتنے سانس اپنی زندگی میں لینے تھے وہ لے چکا تھا۔ عائشہ نے اس بدمعاش کو اس لیے ہلاک نہیں کیا تھا کہ وہ شور نہ مچا دے۔ وہ تو اس قابل ہی نہیں تھا کہ آواز نکال سکے۔ اس نے اس لیے موت کی نیند سلا دیا تھا کہ وہ انسانیت اور معصوم عورتوں کی عزتوں کا ڈاکو تھا اور نہ جانے کتنی معصوم لڑکیوں کی عزتیں داغدار کر چکا تھا۔ انڈیمانی لڑکی پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دہشت طاری ہو گئی تھی۔ وہ عائشہ کو..... بیمار اور اپنی طرح کی کمزور اور مجبور لڑکی سمجھ رہی تھی۔ اس کے وہم میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ یہ لڑکی اتنی آسانی سے ایک آدمی کو ہلاک کر سکتی ہے۔ جب بدمعاش شرابی کے دل نے دھڑکنا بند کر دیا تو عائشہ نے انڈین لڑکی سے کہا۔

"میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ میرے جانے کے دس منٹ بعد اگر تم بھی فرار ہونا چاہو تو فرار ہو جانا۔ لیکن میرے جانے کے دس منٹ بعد۔"

عائشہ نے کانچورام کی الماری کھول کر دیکھا وہ کسی ریوالور وغیرہ کی تلاش میں تھی۔ الماری میں کچھ رجسٹر کپڑے اور انگریزی کے فحش تصویروں والے رسالے پڑے تھے۔ عائشہ نے ایک دروازہ کھولا تو وہاں سے اسے ریوالور مل گیا۔ ریوالور میں گولیاں بھری ہوئی ہوتی تھیں۔ اس نے ریوالور اپنی برساتی کی جیب میں چھپا لیا۔ انڈیمانی لڑکی بہت ڈری ہوئی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ اپنے ہونٹوں پر رکھے لاش کے پاس بیٹھی کانپ رہی تھی۔ عائشہ نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس کے کاندھے کو آہستہ سے تھپتھپایا اور کہا۔

"یاد رکھنا میرے جانے کے دس منٹ بعد یہاں سے ہلنا۔" یہ کہہ کر عائشہ دروازہ کھول کر برآمدے میں آگئی۔ بادلوں میں بجلی چمکی۔ کوٹھی کا باغ تھوڑی دیر کے لئے روشن ہو کر پھر اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اس کے ساتھ ہی ٹپاٹپ بارش کی بوندیں درختوں اور پودوں کے پتوں پر گرنے لگیں۔ عائشہ نے مکان کے عقبی باغیچے میں سے گزر کر باڑھ پھلانگی اور شہر کی طرف پتلی سی سڑک پر تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔ وہ کہاں جا رہی تھی؟

رات کے نو بج رہے تھے۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ عائشہ دو ہندو بدمعاشوں کو قتل کرنے کے بعد تیز تیز قدموں سے جزیرے کی اس پتلی سی سڑک پر چلی جا رہی تھی جو شہر کی طرف جاتی تھی۔ یہ انڈیمان کے ایک شمالی جزیرے کا چھوٹا سا شہر تھا۔ اس شہر میں ادھیڑ عمر سکھ ڈاکٹر کی دکان اور ڈسپنسری تھی جو بدمعاش کانچورام کے حکم پر عائشہ کے علاج کے لئے آیا کرتا تھا اور جس کو عائشہ سے بڑی ہمدردی تھی مگر کانچورام بدمعاش کے خوف کے مارے وہ عائشہ کی مدد کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ اب جب کہ عائشہ نے کانچورام اور اس کے ساتھی کو قتل کر ڈالا تھا تو یہی ایک

نیک دل سکھ ڈاکٹر ہی تھا جو وہاں سے نکلنے میں عائشہ کی مدد کر سکتا تھا۔ اس تمام علاقے میں عائشہ کسی دوسرے آدمی کو نہیں جانتی تھی۔ چنانچہ وہ ایک موہوم سی امید لیے سکھ ڈاکٹر کے گھر کی طرف چلی جا رہی تھی۔ کالے پانی کے ان سارے جزیروں پر انڈیمان کا قبضہ تھا۔ ہر جزیرے کا ایک گورنر تھا جو اس جزیرے کے شہروں کے نظم و نسق کا ذمہ دار تھا۔ جس جزیرے میں عائشہ کو کانچورام بدمعاش کے پاس عائشہ کے باپ کے دشمن شہاب اور فیروز پچاس ہزار روپے میں فروخت کر کے گئے تھے اس جزیرے پر عملی طور پر اس بدمعاش اور قاتل کانچورام کی حکومت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سکھ ڈاکٹر تمام تر ہمدردی رکھنے کے باوجود عائشہ کی مدد کرنے کا خطرہ مول نہیں لے رہا تھا۔ بلکہ اس نے تو ایک بار عائشہ کو کہہ بھی دیا تھا کہ میں پوتے پوتیوں والا ہوں۔ اکیلا ہوتا تو کانچورام جیسے اس بدمعاش سے ٹکر لے لیتا مگر اب مجبور ہوں میں اپنی اولاد کو قتل ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔

عائشہ نے ان حالات میں کوئی زیادہ توقعات سکھ ڈاکٹر سے وابستہ نہیں کی تھیں۔ وہ صرف اتنا چاہتی تھی کہ اسے کسی طرح لنکا جانے والے کسی بحری جہاز پر سوار کرا دیا جائے۔ ان جزیروں سے مال لے کر لنکا کی طرف جہاز آتے جاتے رہتے تھے اور سکھ ڈاکٹر یہاں کا بڑا پرانا باشندہ تھا عائشہ کو یقین تھا کہ وہ اس کی اتنی مدد ضرور کرے گا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

عائشہ کو دور سے شہر کی روشنیاں ٹمٹماتی نظر آنے لگیں۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ بارش ابھی تک بوندا باندی کی شکل میں ہی ہو رہی تھی۔ عائشہ کو سکھ ڈاکٹر نے اپنے گھر کا ایڈریس اور حدود و اربعہ بتا دیا ہوا تھا۔ وہ شہر کی سڑک پر آگئی۔ یہاں روشنی تھی۔ ہلکی ٹریفک جاری تھی۔ سکھ ڈاکٹر نے عائشہ کو جس گول دائرے اور گاندھی کے بت والے چوک کی نشانی بتائی تھی وہ اس چوک میں پہنچ کر رک گئی۔ یہاں سے وہ گول بلڈنگ والی سڑک کی طرف مڑ گئی۔ بازار میں رونق تھی۔ دکانیں کھلی تھیں ایک جگہ عائشہ کو سکھ ڈاکٹر کی ڈسپنسری کا بورڈ لگا نظر آگیا۔ یہی سکھ ڈاکٹر کا مکان تھا۔ اوپر اس کی رہائش تھی۔ نیچے ڈسپنسری تھی۔ کچھ مریض ڈسپنسری میں بینچ پر بیٹھے تھے ڈسپنسر دوائیاں بنا رہا تھا۔ عائشہ نے ڈسپنسر سے کہا وہ ڈاکٹر صاحب سے ملنا چاہتی ہے۔ ڈسپنسر نے ایک نظر عائشہ کو دیکھا۔ اس کی گوری رنگت سے سمجھ گیا کہ یہ کوئی پنجابی عورت ہے۔ یہ ڈسپنسر بھی پنجابی ہندو تھا۔ پنجابی میں اس نے عائشہ سے کہا کہ وہ بیٹھ جائے۔

"ڈاکٹر صاحب ابھی تھوڑی دیر میں آنے والے ہیں۔ وہ ایک مریض کو دیکھنے گئے ہوئے ہیں۔" عائشہ بنچ پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔

"ہندو ڈسپنسر دوائیاں تیار کرتے ہوئے عائشہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عائشہ نے اپنی تیز خون پی جانے والی عقابی نظریں ڈسپنسر پر گاڑ دیں۔ ڈسپنسر کی نظریں چار ہوئیں تو اس پر جیسے بجلی سی گری۔ اس نے گھبرا کر نظریں جھکا لیں۔ اس کے بعد اسے عائشہ پر نگاہ ڈالنے کی جرات نہ ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد سکھ ڈاکٹر بھی آگیا۔ عائشہ کو دیکھ کر وہ کچھ ٹھٹکا پھر اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ڈسپنسری کے پہلو میں سکھ ڈاکٹر کا وہ کمرہ تھا جہاں وہ مریضوں کو

دیکھتا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے عائشہ سے پوچھا۔

"تم اس وقت یہاں؟ کیا بات ہوئی ہے؟"

عائشہ نے سکھ ڈاکٹر سے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ ایک بار تو سکھ ڈاکٹر سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ عائشہ نے کہا۔

"میں آپ کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی صرف آپ سے اتنی مدد مانگتی ہوں کہ مجھے کسی طرح لنکا جانے والے اسٹیمر پر سوار کرا دیجئے۔"

سکھ ڈاکٹر نے سر اٹھا کر عائشہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ عائشہ کی ہر ممکن امداد کے لیے تیار ہے۔ اس نے کہا۔

"تم نے اس جزیرے کے سب سے طاقتور درندہ صفت بدمعاش کانچورام کو قتل کیا ہے۔ میں تمہاری دلیری سے بڑا متاثر ہوا ہوں۔ مگر جزیرے پر بھارت کے گورنر کی نہیں بلکہ کانچورام اور اس کے گینگ کی حکومت ہے تمہاری تلاش میں کانچورام کے گینگ کے بدمعاش یہاں کی پولیس کے ساتھ نکل چکے ہوں گے۔ وہ لوگ تمہیں پہچان لیں گے پورٹ کار نوالس کی بندرگاہ اور جزیرے کی دوسری چھوٹی چھوٹی جیٹیوں کو ان لوگوں نے گھیرے میں لے رکھا ہو گا۔ اگر تم اس طرف گئیں تو فوراً پکڑی جاؤ گی۔" عائشہ بڑے سکون اور غور سے سکھ ڈاکٹر کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

"کیا اس جزیرے کا کوئی ویران ساحل ایسا نہیں ہے جہاں سے میں کسی کشتی میں بیٹھ کر لنکا کی طرف فرار ہو جاؤں؟"

سکھ ڈاکٹر کرسی سے اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ دوبارہ کرسی پر بیٹھا اور بولا" بیٹی! تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ تم لنکا سے کتنی دور ہو۔ اور تمہاری راہ میں ایک ایسا خوفناک سمندر حائل ہے۔ جس میں آج کل ہر وقت طوفان آتے رہتے ہیں۔ میں تمہیں اس طرح کشتی پر فرار ہونے کا مشورہ نہیں دوں گا۔" عائشہ نے متفکر ہو کر کہا۔

"پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں آپ کے ہاں بھی نہیں رہ سکتی۔ اس طرح سے آپ کی اور آپ کی ساری فیملی کی جان بھی خطرے میں ہو گی۔" سکھ ڈاکٹر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"یہ باتیں بعد میں سوچیں گے ابھی تم میرے ساتھ آؤ۔ یہاں تم محفوظ نہیں ہو۔"

سکھ ڈاکٹر نے کمرے کا عقبی دروازہ کھولا۔ دوسری طرف ایک تاریک گلی تھی جہاں سے بارش کی آواز آرہی تھی۔ باہر بارش شروع ہو گئی تھی۔ سکھ ڈاکٹر نے عائشہ سے کہا۔

"تم یہاں ٹھہرو۔ میں گاڑی لے کر آتا ہوں۔" ڈاکٹر ڈسپنسری والے دروازے سے باہر نکل گیا۔ عائشہ ادھ کھلے دروازے سے لگی گلی میں گرتی بارش کی آواز سن رہی تھی۔ اس کا ذہن بڑا مطمئن تھا۔ اسے کانچورام اور اس کے ساتھی بدمعاش کے قتل کا ذرا بھی پچھتاوا نہیں تھا۔ یہ قتل اسے بالکل ایسے لگ رہا تھا جیسے اس نے دو باؤلے کتوں کو ہلاک کر دیا ہو۔ اسے اگر کوئی فکر تھی تو صرف اتنی کہ کسی طرح اس جزیرے سے سری لنکا کی طرف نکل جائے تاکہ وہاں اپنے باپ شیر خان کے دشمن شہاب اور فیروز سے اپنے اغوا اور کانچورام بدمعاش کے ہاتھوں فروخت کرنے کے گھناؤنے جرم کا بدلہ لے سکے۔ سکھ ڈاکٹر اپنی چھوٹی گاڑی لے کر گلی میں آگیا' دروازہ کھول کر اس نے عائشہ کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ پھر گاڑی کو گلی سے نکال کر بارش میں بھیگتی سڑک پر ڈال دیا۔ عائشہ کو اس نے پچھلی سیٹ پر لیٹ جانے کی ہدایت کی تھی تاکہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔ کچھ دور تک گاڑی روشنیوں والی سڑک پر چلتی رہی۔ پھر بائیں جانب گھوم کر ایسی سڑک پر آگئی جو غیر ہموار تھی اور جس پر کسی لیمپ پوسٹ کی روشنی نہیں تھی۔ سکھ ڈاکٹر نے عائشہ سے کہا۔

"اب بے شک اٹھ کر بیٹھ جاؤ۔"

عائشہ نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا۔ رات کے اندھیرے اور بارش میں اسے سوائے درختوں کے سیاہ دھبوں کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ اس نے سکھ ڈاکٹر سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ گاڑی نیم پہاڑی اونچی نیچی سڑک پر جا رہی تھی۔ اس جنگل میں سکھ ڈاکٹر کا ایک پرانا گودام تھا جہاں باہر سے آنے والی دوائیوں وغیرہ کے خالی کھوکھے اور کچھ نئے مال کا اسٹاک بھرا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر نے ایک کمرے کا چھوٹا سا لکڑی کا کیبن بنایا ہوا تھا جہاں وہ چھٹی کے دن آکر آرام کرتا تھا۔

وہ عائشہ کو اس کیبن میں لے آیا۔ یہاں کچن میں ریفریجریٹر بھی تھا جس کے اندر کھانے پینے کی تقریباً ساری ضروری چیزیں موجود تھیں۔ سکھ ڈاکٹر نے عائشہ سے کہا۔

"تمہیں یہاں ہو سکتا ہے کچھ دن گزارنے پڑیں اس دوران میں تمہارے یہاں سے نکلنے کا کچھ بندوبست کرتا ہوں۔ ایک ضروری بات ہمیشہ یاد رکھنا۔ کسی بھی وقت خاص طور پر رات کے وقت کچن یا کیبن کی بتی مت جلانا۔ یہاں موم بتیاں دراز میں رکھی ہیں۔ اشد ضرورت کے وقت اسے جلا لینا مگر موم بتی کو فرش پر کسی کونے میں اس طرح رکھنا کہ اس کی روشنی کھڑکیوں پر نہ پڑے۔ میں کل کسی وقت آکر تمہیں ملوں گا۔ اب تم آرام کرو۔ ادھر شہر کا کوئی آدمی نہیں آتا۔ میں دروازے پر تالا ڈال کر کچن کی کھڑکی سے چابی تمہیں دے جاؤں گا۔ تم اس کھڑکی سے باہر آجا سکتی ہو۔ مگر کوشش کرنا کہ دن کے وقت تم کیبن میں ہی رہو۔"

سکھ ڈاکٹر چلا گیا۔ کیبن کے کمرے میں دیوار کے ساتھ چارپائی بچھی تھی جس پر مچھر دانی لگی ہوئی تھی۔ مچھردانی کے بغیر یہاں سونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ یہاں کے مچھر بڑے خطرناک تھے۔ عائشہ نے موم بتی جلائی۔ اسے کچن کے کونے میں فرش پر اس طرح لگا دیا کہ اوپر ایک طشت کا سایہ تھا اور اس کی روشنی کھڑکیوں میں سے باہر نہیں جاتی تھی۔ ساری کھڑکیاں اس نے بند کر کے اندر سے چٹخنیاں لگا دی تھیں۔ اس نے ریفریجریٹر میں سے ڈبل روٹی نکال کر کھائی۔ موم بتی کو پھونک مار کر بجھایا اور مسہری پر لیٹ گئی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ چھت پر پنکھا چل رہا تھا۔ جس کی ہلکی ہلکی ہوا مسہری کے اندر آرہی تھی۔ اس کا خیال اپنے باپ شیر خان کی طرف چلا گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ اس کا غیرت مند بہادر باپ گھر پر بیٹھا بیٹی کی یاد میں آنسو بہاتا رہ گیا ہو۔ وہ ضرور اپنی بیٹی کی تلاش اور شہاب اور فیروز سے انتقام لینے کے لئے گھر سے نکل چکا ہو گا۔ لیکن وہ بھی اپنی ماں کی شیرنی اور غیور باپ کی سرفروش بیٹی ہے۔ وہ بہادر باپ کے لنکا پہنچنے سے پہلے شہاب اور فیروز کو جہنم میں پہنچا چکی ہو گی۔ شیرنی کو یقین تھا کہ اس کا باپ اس کی تلاش میں سیدھا لنکا پہنچے گا۔ کیونکہ شہاب اور فیروز کے ناجائز منشیات کے کاروبار کا تعلق لنکا ہی سے تھا اور شیر خان کے لیے یہ ملک کوئی نیا نہیں تھا۔ یہی کچھ سوچتے سوچتے شیرنی کو نیند نے آلیا اور وہ سو گئی۔

عائشہ تین دن سکھ ڈاکٹر کے اس جنگل والے کیبن میں رہی۔ اس دوران ڈاکٹر روز

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رات کو آکر اسے صورتحال سے باخبر کر جاتا کہ وہ اس کے وہاں سے نکلنے کے لیے کیا کچھ تگ و دو کر رہا ہے۔ چوتھے روز صبح صبح سکھ ڈاکٹر عائشہ شیرنی کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"بیٹی! جہاں جہاں سے جہاز سری لنکا کی طرف جاتے ہیں وہاں ہر جگہ پر کانچورام کے آدمی پولیس کے ساتھ تمہیں پکڑنے کے لیے ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ اب صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے۔"

"وہ کیا؟" عائشہ شیرنی نے پوچھا۔ سکھ ڈاکٹر کہنے لگا۔

جزیرے کے شمال مشرقی گھاٹ سے انڈیا کی بندرگاہ کوکی ناڈا سے ہفتے میں دوبار مال بردار جہاز آتا ہے جس میں ہمارے لیے دوائیوں کے کریٹ بھی ہوتے ہیں۔ آج رات کو ایسا ہی ایک مال بردار جہاز یہاں سے مال لے کر واپس کوکی ناڈا جا رہا ہے۔ بس یہی ایک صورت رہ گئی ہے کہ تم اس جہاز میں سوار ہو کر انڈیا پہنچ جاؤ اور وہاں سے سری لنکا چلی جاؤ۔" عائشہ شیرنی نے کچھ سوچ کر کہا۔

"مگر انکل! انڈیا میں تو مجھے پاسپورٹ کی ضرورت ہو گی۔ وہاں سے میں سری لنکا کیسے جا سکوں گی۔" سکھ ڈاکٹر بولا۔

"بیٹی پاسپورٹ کی تو تمہیں یہاں بھی ضرورت ہے۔ تم ان باتوں کو بھول جاؤ۔ سب سے پہلا کام تمہاری جان بچانا اور یہاں کے خونی غنڈوں سے تمہیں محفوظ کرنا ہے۔ کوکی ناڈا میں میرا ایک دوست ڈاکٹر ہے۔ وہ مدراسی ہے۔ اس کا نام شری ناڈ ہے۔ میں تمہیں اس کے نام خط لکھ دوں گا۔ وہ تمہیں لنکا پہنچانے میں مدد کرے گا۔ وہ اعتبار والا آدمی ہے اور میرا بڑا گہرا دوست ہے۔ وہ ہر طرح تمہاری مدد کرے گا۔ اگر ضرورت پڑی تو وہ تمہارا پاسپورٹ بھی بنوا دے گا۔ اب تم تیاری کرو جہاز سورج غروب ہونے کے بعد سات ساڑھے سات بجے بندرگاہ سے انڈیا کے ساحل کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ میں پورے چھ بجے تمہارے پاس آؤں گا۔ میں نے جہاز کے کپتان سے بات کر لی ہے۔ میں نے اسے کچھ روپے بھی دے دیے ہیں۔ وہ خود تمہیں اپنے ساتھ جہاز پر لے کر جائے گا۔ صرف تمہیں مسلمان عورتوں کی طرح برقع پہننا ہو گا۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔" سکھ ڈاکٹر چلا گیا۔ عائشہ شیرنی سوچ میں پڑ گئی۔

انڈیا ایک ایسا ملک ہے جو پاکستان کے ساتھ دشمنی رکھتا ہے۔ اور شیرنی ایک پاکستانی لڑکی ہے۔ اگر وہاں کسی پر یہ بھید کھل گیا تو اسے پاکستانی جاسوس سمجھ کر پکڑ لیا جائے گا۔ مگر بقول سکھ ڈاکٹر اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس خونی جزیرے سے نکلنا بھی ضروری تھا۔

عائشہ شیرنی نے آخری فیصلہ کر لیا کہ وہ انڈیا کے راستے ہی لنکا پہنچنے کی کوشش کرے گی۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ شیرنی کے لیے سارے جنگل ایک جیسے ہوتے ہیں۔ وہ جس جنگل میں بھی جائے اپنے لیے راستہ تلاش کر لیتی ہے۔ ٹھیک چھ بجے شام سکھ ڈاکٹر عائشہ شیرنی کو لینے آگیا۔ وہ اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی جنگل میں سے گزرتی شام کے جھٹپٹے میں جزیرے کے شمال مغربی ساحل کی طرف روانہ ہو گئی۔ آدھ گھنٹے بعد شمال مغربی گھاٹ کے ٹاپوں کے درمیان بنی ہوئی شہر کی نیم روشن سڑکوں پر سے ہوتے ہوئے گاڑی ایک بوسیدہ سے گودام کی دیوار کے پاس آکر رک گئی۔

"کپتان نے اسی گودام میں آنے کے لیے کہا تھا۔" سکھ ڈاکٹر یہ کہتا ہوا گاڑی سے باہر نکل آیا۔ گودام کا عقبی دروازہ مقفل نہیں تھا۔ سکھ ڈاکٹر نے آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے کسی کی بھاری اور کرخت آواز آئی

"کون ہے؟" سکھ ڈاکٹر نے اپنا نام بتایا۔ "آجاؤ دروازہ کھلا ہے ڈاکٹر۔" یہ کپتان تھا۔ وہ لوہے کی ایک کرسی پر اپنا بھاری بھرکم جسم سنبھالے بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کافی کا مگ تھا اور دوسرے ہاتھ میں موٹا سا کالا سگار سلگ رہا تھا۔ اس نے غور سے عائشہ کا جائزہ لیا۔

"یہ لڑکی ہے؟" سکھ ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔ کپتان نے کافی کا مگ میز پر رکھا۔ منہ سے سیٹی بجائی ایک کالے رنگ کی دبلی پتلی مگر بڑی شوخ آنکھوں والی لڑکی پتلون شرٹ میں ملبوس ایک کمرے سے نکل کر کپتان کی طرف بڑھی۔

"یس۔ کیپٹن!" اس نے دل ربا انداز میں کہا۔ کپتان نے عائشہ شیرنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے لیے جو مسلمان عورتوں والا برقع میں نے تمہیں دیا تھا وہ اسے پہنا دو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کالی لڑکی نے بھی تیکھی نظروں سے عائشہ کا جائزہ لیا۔ پھر اندر گئی اور کالے رنگ کا ایک جھولا نما برقع لے آئی۔ کپتان نے شیرنی سے کہا۔

"لو اسے پہن لو۔ اور میرے ساتھ چلو۔"

پھر سکھ ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔" ڈاکٹر! تم فکر نہ کرو۔ تمہاری امانت بالکل ایسی کی ایسی کوکی ناڈا کی بندرگاہ سے باہر پہنچا دی جائے گی۔ وہ تمہارا ڈاکٹر دوست کیا نام ہے اس مسخرے کا۔"

"شری ناڈ۔" سکھ ڈاکٹر نے اس کا جملہ پورا کیا۔

"ہاں شری ناڈ۔ کیا وہ جیٹی کے باہر موجود ہو گا؟" کپتان نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" سکھ ڈاکٹر نے کہا۔"میں نے اس کے نام خط لکھ کر لڑکی کو دے دیا ہے۔ ڈاک کے ذریعے بھی اسے خط پوسٹ کر دیا ہے۔ میں نے خط میں سارا معاملہ لکھ دیا ہے۔ جب تک تمہارا جہاز انڈیا کے ساحل پر پہنچے گا اسے خط مل چکا ہو گا۔" کپتان نے سگار کا کش لگا کر کہا۔

"ہم دو دن میں پہنچیں گے انڈیا۔" ٹھیک ہے ڈاکٹر اب تم جاؤ۔"

سکھ ڈاکٹر نے شیرنی عائشہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بیٹی! کاش میں اس سے زیادہ تمہارے لیے کچھ کر سکتا ہے۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دینا۔ پوتے پوتیوں نے میرے ہاتھ باندھ رکھے ہیں۔ ورنہ میں خود تمہیں تمہاری منزل تک لے جاتا۔" یہ باتیں سکھ ڈاکٹر نے پنجابی زبان میں کی تھیں جسے شوخ آنکھوں والی کالی لڑکی اور جہاز کا کپتان نہیں سمجھ سکا تھا۔ عائشہ شیرنی نے جذباتی ہوئے بغیر کہا۔

"آپ نے میرے لیے بہت کچھ کیا ہے سردار جی! آپ کا یہ احسان مجھے یاد رہے گا۔"

جہاز کا کپتان بڑا حیران ہو رہا تھا یہ کیسی لڑکی ہے کہ ایک لمحے کے لیے بھی جذباتی نہیں ہوئی اس کے باوجود کپتان نے عائشہ کے انداز کو پسند کیا تھا۔ شوخ آنکھوں والی کالی لڑکی کو عائشہ شیرنی پسند نہیں آئی تھی۔ اس کی وجہ محض اتنی سی تھی کہ عائشہ کے بال سنہری اور رنگ گورا چٹا تھا۔ تھوڑی دیر بعد عائشہ بندرگاہ کی طرف جاری تھی۔ وہ برقع اوڑھے کپتان

کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ بندرگاہ پر کانچورام اور جزیرے کی خفیہ پولیس کے آدمی عائشہ کی تلاش میں برابر موجود تھے مگر ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ عائشہ برقع پہنے کپتان کے ساتھ وہاں آئے گی۔ کپتان کے ساتھ برقع پوش مسلمان عورت کو دیکھ کر پولیس والوں اور وہاں دوسرے آدمیوں کو کوئی تعجب نہ ہوا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ کپتان عورتوں کا بڑا شوقین ہے اور ہر پھیرے پر جزیرے سے ایک نئی عورت اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ اس بار وہ کوئی برقعے والی عورت لے جا رہا تھا۔ کپتان بھی معمول کے مطابق جیپ سے اتر کر اپنے جہاز کی طرف بڑھا جو جیٹی پر کھڑا تھا اور جس پر ابھی کچھ کریٹ اور بوریاں لادی جا رہی تھیں۔ کپتان آگے آگے تھا۔ عائشہ شیرنی اور کالی لڑکی اس کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ کپتان نے سگار منہ سے نکال کر چنگھاڑتے ہوئے کہا۔

"جلدی کرو حرام خور جلدی کرو۔ میں آدھے گھنٹے میں انجن اسٹارٹ کر رہا ہوں۔" وہ تامل زبان میں مزدوروں کو گالیاں بکتا جہاز کے گینگ وے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ شیرنی اور کالی لڑکی اس کے پیچھے تھیں۔ جہاز پر آتے ہی تامل کیپٹن نے کالی لڑکی سے اپنی زبان میں کہا کہ وہ عائشہ کو لوئر ڈیک کے کیبن میں لے جائے اور اسے ہدایت کر دے کہ یہ کسی حالت میں بھی کیبن سے باہر مت نکلے۔ تامل لڑکی نے عائشہ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ عائشہ نے ابھی تک برقعے کا نقاب گرا رکھا تھا۔ تامل لڑکی ایک پیچ دار زینہ اتر کر نچلے ڈیک کی تنگ راہ داری میں سے ہوتی ہوئی ایک کیبن میں آ گئی۔ اس نے عائشہ سے کہا کہ وہ اب برقع اتار دے اور یہاں سے باہر قدم نہ نکالے۔ باتھ روم کیبن کے ساتھ ہی ہے اور اسے کھانا وغیرہ وہیں پہنچ جایا کرے گا۔

تامل لڑکی چلی گئی۔ عائشہ نے برقع اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ چھوٹا سا کیبن تھا جس میں نیچے بیٹھنے کی جگہ تھی اور اوپر سونے کی برتھ تھی۔ ساتھ ہی چھوٹا سا غسل خانہ تھا۔ شیرنی بینچ پر بیٹھنے والی سیٹ پر لیٹ گئی اور انڈیا سے لنکا تک کے سفر کے خطرات کا جائزہ لینے لگی۔ کیا سکھ ڈاکٹر کا مدراسی دوست شری ناڈ واقعی قابل اعتبار آدمی ہے؟ شیرنی نے فیصلہ کر لیا کہ اگر اس شخص نے کوئی گڑ بڑ کرنے کی کوشش کی تو وہ اسے بھی زندہ نہیں چھوڑے گی۔ میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے۔ عائشہ نے سوچا مجھے انڈیا کے ساحل پر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اترتے ہی کوئی ریوالور یا چاقو حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہو گی۔ وہ ان ہی سوچوں میں گم تھی کہ جہاز کے انجن اسٹارٹ ہو گئے۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے جہاز بندرگاہ سے ہٹ رہا ہے۔ پہلی بار اسے تھوڑا سا سکون میسر آیا تو اس پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ وہ سو گئی۔

اس کی آنکھ کھلی تو تامل لڑکی کھانے کی تھالی رکھنے کے بعد اسے جگا رہی تھی۔

"چاول مچھلی کھا لو۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ جہاز بیچ سمندر میں پہنچنے کے بعد ڈول رہا تھا۔ شیرنی نے تھوڑا کھانا کھایا اور پھر سو گئی۔ خلیج بنگال کے متلاطم پانیوں میں دو دن تک سفر کرنے کے بعد یہ مال بردار جہاز آندھیرا پردیش کی بندرگاہ کوکی ناڈا کے ساتھ جا کر لگ گیا۔ سکھ ڈاکٹر کا خط اس کے مدراسی دوست شری ناڈ کو مل چکا تھا۔ اور وہ بندرگاہ پر اپنے سکھ ڈاکٹر دوست کی منہ بولی بیٹی عائشہ کو لے جانے کے لیے آیا ہوا تھا۔ سکھ ڈاکٹر نے جہاز کے کپتان کو شیری ناڈ کی ایک فوٹو دکھائی تھی تاکہ وہ اسے پہچان سکے۔ یہ انڈیا کی بندرگاہ تھی اور یہاں کانچورام کے بدمعاش عائشہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ چنانچہ تامل کپتان نے عائشہ کو ساتھ لیا اور جہاز سے اتر کر جیٹی پر آگیا۔ جنگلے کے ایک طرف اسے اسی شکل کا ایک ادھیڑ عمر دبلا پتلا کالا مدراسی بند چھتری ہاتھ میں لیے نظر آیا جو شکل سکھ ڈاکٹر نے کپتان کو دکھا رکھی تھی۔ وہ عائشہ کو ساتھ لیے شری ناڈ کے قریب آیا اور اسی کی زبان میں اس کا نام پوچھا۔ شری ناڈ نے اپنا نام بتایا اور جیب سے سکھ ڈاکٹر کا خط نکال کر دکھایا۔ کپتان نے عائشہ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ میرے دوست ڈاکٹر کی منہ بولی بیٹی ہے اور اس کی امانت ہے۔ میں اسے تمہارے حوالے کرتا ہوں۔" پھر عائشہ کی طرف منہ کر کے بولا۔ "لڑکی یہی وہ شری ناڈ ہے جس کے پاس سکھ ڈاکٹر نے تمہیں بھیجا ہے۔ وہ خط نکال کر اسے دے دو۔" عائشہ نے سکھ ڈاکٹر کا لکھا ہوا خط نکال کر شری ناڈ کو دیا۔ اس نے وہیں جنگلے کے پاس گرمی میں کھڑے کھڑے خط پڑھا اور مسکرا کر انگریزی میں عائشہ سے کہنے لگا۔

"تم میری بھی بیٹی ہو۔ آؤ میرے ساتھ۔" پھر اس نے تامل کپتان کا شکریہ ادا کیا۔ کپتان نے شیر ناڈ سے کہا۔

"اس کا خیال رکھنا بابو۔ نہیں تو میں ادھر آتا جاتا رہتا ہوں۔" شیری ناڈ نے مسکرا کر

سلام کیا اور عائشہ کو ساتھ لے کر بندرگاہ کے مین گیٹ کی طرف بڑھا۔

شیری ناڈ بڑا شریف مدراسی تھا اور سکھ ڈاکٹر کا پرانا دوست تھا۔ کوکی ناڈا میں اس کا امپورٹ ایکسپورٹ کا چھوٹا سا کاروبار تھا اور شہر کے ایک فلیٹ میں اپنی ادھیڑ عمر بیوی کے ساتھ رہتا تھا۔ ان کے ہاں اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ایک لڑکی کو انہوں نے اناتھ آشرم سے لے کر پال پوس کر پڑھا لکھا کر بڑا کیا اور پھر اس کی شادی کر دی تھی۔ شادی کے بعد وہ اپنے خاوند کے پاس بمبئی میں جا کر رہنے لگی تھی۔ ان دنوں شری ناڈ اور مسز شری ناڈ اپنے فلیٹ میں اکیلے ہی رہتے تھے۔ شہر میں شیری ناڈ کا ایک چھوٹا سا دفتر تھا جہاں وہ بڑی باقاعدگی سے صبح کو جاتا اور دوپہر کے بعد واپس آجاتا تھا۔ عائشہ کو گھر لا کر اسے اپنی بیوی سے ملایا۔ اس کی ادھیڑ عمر بیوی بھی عائشہ سے مل کر بڑی خوش ہوئی۔ شری ناڈ نے اپنی بیوی کو عائشہ کے بارے میں بتا دیا تھا کہ پاکستان سے اسے کچھ بدمعاش اغوا کر کے انڈیمان لے گئے تھے اور اب اسے سری لنکا پہنچانا ہے جہاں سے وہ واپس اپنے وطن پاکستان چلی جائے گی۔ کیونکہ انڈیا کے پنجاب اور راجستھان والے بارڈر کے مقابلے میں راس کماری کی جانب سے بارڈر کراس کرانا زیادہ آسان ہے۔ تینوں نے رات کا کھانا ایک جگہ چٹائی پر بیٹھ کر کھایا۔ کھانے کے بعد شری ناڈ کہنے لگا۔ وہ آپس میں اپنی زبان میں اور عائشہ کے ساتھ انگریزی زبان میں ہی بات کرتے تھے۔ کیونکہ عائشہ ان لوگوں کی زبان اور وہ اس کی زبان نہیں جانتے تھے۔ ہندوستانی بھی انہیں ٹوٹی پھوٹی ہی آتی تھی۔

"بیٹی! تم اب ساڑی پہن کر رکھو۔ ماتھے پر ویشنو کا تلک بھی تمہیں لگا دیں گے۔ تمہارا نام کملا ہو گا اور میں لوگوں سے یہی کہوں گا کہ تم میری بھانجی ہو جو افریقہ میں ہی پیدا ہوئی تھی اور اب بہن کی موت کے بعد میرے پاس آگئی ہو اور چند روز بعد میں تمہیں مزید پڑھائی کے واسطے مدراس یونیورسٹی لے جانے والا ہوں۔ تم یہاں کسی سے بات نہ کرنا۔ میں یہی مشہور کر دوں گا کہ ماں کی وفات کے صدمے سے تمہارے ذہن پر اثر پڑا ہے اور تم بول نہیں سکتی ہو۔ یہاں ہمارا ایک ہی بوڑھا نوکر ہے جو دن میں آتا ہے اور شام کو چلا جاتا ہے اس کے سامنے بھی کوئی بات نہ کرنا۔"

دو دن عائشہ شری ناڈ کے ہاں رہی۔ تیسرے روز شری ناڈ اسے لے کر مدراس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

طرف روانہ ہو گیا۔ مدراس میں وہ دونوں باپ بیٹی بن کر ایک غیر معروف سے ہوٹل میں اترے۔ یہاں شری ناڈ اور شیرنی ایک دن ٹھہرے۔ اس دوران شری ناڈ نے لنکا کے شمالی صوبے کے ساحلی شہر منار میں اپنے ایک دوست رامیکا کو ٹیلی فون پر اطلاع دی کہ وہ منار پہنچ رہا ہے۔ مدراس سے وہ ایک ریل گاڑی میں سوار ہو کر انڈیا کی جنوبی تکون کی طرف چل دیئے ایک رات اور ایک دن کے سفر کے بعد ٹرین دھنش کو ڈی پہنچ گئی یہاں سے انہیں سری لنکا کے شمالی ساحل کے واسطے اسٹیمر پکڑنا تھا۔ شری ناڈ کا دوست رامیکا وہاں پہلے سے موجود تھا اور اس نے کسٹمز والوں کے ساتھ مل کر شیرنی کے داخلے کا سارا انتظام کر رکھا تھا۔ کیونکہ پاسپورٹ صرف شری ناڈ کے پاس ہی تھا۔ شیرنی کے پاس کوئی پاسپورٹ نہیں تھا۔ اتنی جلدی اس کا پاسپورٹ بنوایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ یہاں شری ناڈ نے شیرنی کو اپنے دوست رامیکا کے حوالے کر دیا اور اسے ساری بات سمجھا دی کہ شیرنی کون ہے اور وہ کس مشن پر لنکا میں داخل ہوئی ہے۔ رامیکا اپنی بیوی بچوں کے ساتھ منار شہر میں رہتا تھا وہ ایک بااصول اور اپنا عہد نبھانے والا مدراسی تھا۔ شیرنی کے لیے اس نے گھر کا ایک کمرہ خالی کروا لیا۔ اپنی بیوی بچوں کو یہی بتایا کہ عائشہ ایک مظلوم لڑکی ہے اور یہاں اپنے گمشدہ ماں باپ کی تلاش میں آئی ہے۔ اس نے اپنی طرف سے ایک کہانی گھڑ کر گھر والوں کو سنا دی اور شیرنی کو ہدایت کر دی کہ وہ گھر میں کسی سے زیادہ بات نہ کرے۔

یہاں پہنچ کر شیرنی نے غور شروع کر دیا کہ اسے اپنا منصوبہ کہاں سے شروع کرنا چاہیے۔ یہ بات طے تھی کہ اس کے اور اس کے باپ کے دشمن شہاب اور فیروز شمالی لنکا میں جافنا کے آس پاس ہی تھے۔ مگر شیرنی اس سے پہلے کبھی لنکا نہیں آئی تھی۔ اس کی ماں تو لنکا کے جنگلوں اور شہروں کی ایک ایک شے سے واقف تھی۔ مگر اس کے لیے یہ جگہ اجنبی تھی۔ کافی سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ گوتم بدھ کی بھکشنی بن کر وہاں زیادہ محفوظ رہ سکے گی اور اس بہروپ میں اپنے دشمنوں کو تلاش کرنے میں اسے نسبتاً زیادہ آسانی ہو گی۔ اپنے منصوبے سے اس نے رامیکا کو آگاہ کر دیا۔ پہلے تو وہ خاموش سا ہو گیا۔ اب شیرنی نے اسے بتایا کہ لنکا میں گوتم بدھ کا مذہب سرکاری مذہب ہے اور لوگ اس مذہب کے پابند ہیں اور بودھ بھکشنوں اور بھکشنیوں کا بڑا احترام کرتے ہیں۔ اس وجہ سے

میں آسانی کے ساتھ چل پھر سکوں گی اور کسی کو مجھ پر شک بھی نہیں ہو گا۔ تو پھر رامیکا بھی مان گیا کہنے لگا۔

"مگر بودھ مت کی بھکشنی بننے کے لیے تمہیں اپنا سر منڈوانا ہو گا۔ زعفرانی لباس پہننا پڑے گا۔"

"یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ آپ مجھے صرف یہ معلومات مہیا کر دیں کہ شمالی لنکا میں جافنا شہر کے آس پاس بودھ مت کی خانقاہیں کہاں کہاں پر ہیں۔ کیونکہ مجھے وہیں رہ کر اپنے دشمنوں کو تلاش کرنا ہو گا۔" شیرنی نے کہا۔

رامیکا نے ایک ہی دن میں شیرنی کو شمالی لنکا کے شہر جافنا اور آس پاس کے علاقوں کی بودھ خانقاہوں کے بارے میں ساری معلومات مہیا کر دیں۔ شیرنی نے ساری تفصیلات ذہن نشین کر لیں۔ بودھ بھکشنی کے بھیس میں سفر کرنے کے باعث اسے ریل یا بس میں کرایہ خرچ کرنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اور خانقاہوں میں بھی وہ بڑی آسانی سے قیام کر سکتی تھی۔ چنانچہ دو دن بعد عائشہ نے رات کے پچھلے پہر رامیکا کی مدد سے اپنے سر کے بال صاف کر دیے۔ پہلے سے لاکر رکھا ہوا زعفرانی لباس یعنی گیروے رنگ کی ساڑھی پہنی ۔گلے میں ایک تھیلا لٹکایا۔ رامیکا نے اسے کچھ کرنسی بھی دے دی۔ کندھے کے ساتھ ناریل کے پتوں سے بنائی ہوئی چھتری لٹکائی اور اس کے گھر کے عقبی دروازے سے نکل کر منار شہر کے ریلوے اسٹیشن کی طرف چل دی۔ اس کی پہلی منزل جافنا سے پچاس میل پہلے پورا تھنی قصبے کی بودھ خانقاہ تھی۔

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو شیرنی کے باپ شیر خان کے بارے میں بھی واقعات و حالات سے آگاہ کیا جائے۔ شیر خان کراچی سے سیدھا کولمبو پہنچا تھا۔ سری لنکا کا کوئی بھی شہر کوئی بھی ساحل سمندر اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ اس نے اپنا بچپن لڑکپن اور جوانی یہاں کے جرائم پیشہ اسمگلروں کے ساتھ گزاری تھی۔ یہیں اس کی ملاقات روبی سے ہوئی تھی اور پھر دونوں نے زندگی بھر ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی تھیں۔ وہ ایک مدت کے بعد سری لنکا واپس آیا تھا۔ اب لنکا سے انگریز جا چکا تھا اور وہاں لنکا کے لوگوں کی اپنی حکومت تھی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ شمال کی جانب تامل ایلام بایوں کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

تخریب کاریاں بھی شروع ہو چکی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو کبھی ہندوستان کے جنوبی علاقوں سے آکر لنکا کے شمال میں آباد ہو گئے اور اب وہ بھارت کی شہہ پر لنکا میں اپنا ایک الگ ملک بنانا چاہتے تھے۔ یہ ہندوستان کے تربیت یافتہ تامل تخریب کار تھے اور انہوں نے لنکا کے شمالی اور شمال مشرقی علاقے میں تشدد کی خونی کارروائیاں شروع کر رکھی تھیں۔ لنکا کے یہ وہ علاقے تھے جہاں سیلونی مسلمان بھی آباد تھے۔ تامل تخریب کار ان کو بھی مسلمان ہونے کی وجہ سے اپنے انتقام کا نشانہ بنا رہے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سیلونی مسلمان حکومت کے وفادار تھے اور ملک کو توڑ دینے والی پر تشدد تخریبی کارروائیوں کے خلاف تھے۔

شیر خان کے لیے یہ ایک نئی صورتحال تھی۔ وہ کولمبو کے ایک ہوٹل میں آکر ٹھہر گیا۔ اسے معلوم تھا کہ شہاب اور فیروز شمالی لنکا کی پورٹ پیڈرو کے جنگلوں میں ہی ہوں گے۔ کیونکہ یہی وہ مقام تھا جہاں سے آسٹریلیا' نیوزی لینڈ اور جاوا سماٹرا کے ملکوں کو ہندوستان کی چرس اور اب ہیروئن اسمگل کی جاتی تھی۔ کولمبو میں شیر خان کے اس زمانے کے جاننے والے اب نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس نے اپنے طور پر تحقیق کی تو اسے پتا چلا کہ اس کا پرانا ساتھی ارجنا ٹرنکو مالی کے پاس جنگل کے خفیہ ٹھکانے میں ابھی تک اسمگلنگ کا دھندا کر رہا ہے۔ باقی کے لوگوں میں سے کچھ قیدیں بھگت رہے تھے۔ کچھ مارے جا چکے تھے اور سیٹھ لوگ حکومت کی سختی کی وجہ سے لنکا چھوڑ کر ہانگ کانگ کی طرف فرار ہو گئے تھے۔ شہاب اور فیروز کے بارے میں شیر خان کو کولمبو میں کچھ پتا نہ چل سکا۔ اس نے یہی فیصلہ کیا کہ ارجنا کے پاس ٹرنکو مالی چلنا چاہیے۔ وہیں سے شہاب اور فیروز کے ٹھور ٹھکانے کا کچھ پتا چل سکے گا۔ شیر خان کے پاس کافی پیسے تھے جو ٹریول چیک کی شکل میں اس کے پاس موجود تھے۔ اس نے بینک سے کچھ رقم نکلوائی اور کولمبو کے فورٹ ریلوے اسٹیشن سے ٹرین میں بیٹھ کر ٹرنکو مالی کی طرف روانہ ہو گیا۔ کولمبو سے یہ ایکسپریس ٹرین سیدھی ٹرنکو مالی جاتی تھی۔ یہ لنکا کے مغربی ساحل سے مشرقی ساحل کی جانب کا سفر تھا اور ٹرین میں دو دن اور ایک رات لگ جاتی تھی۔ شیر خان ٹرنکو مالی پہنچ گیا۔ یہاں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لیا وہ رات کے وقت یہاں پہنچا تھا۔ رات کو کھانا کھانے کے بعد شیر خان لیٹ گیا۔ اپنی بیٹی عائشہ کا خیال اسے ہر لمحہ پریشان رکھے ہوئے تھا۔ مگر اسی خیال سے اسے

تھوڑی تسلی بھی ہوتی تھی کہ عائشہ کو اس نے شیرنی کی تربیت دی ہے اور وہ اپنی عزت کی حفاظت کرنا جانتی ہے۔ اگر وہ کسی مقام پر بے بس ہو گئی تو بڑی بہادری سے دو چار کو مار کر خود بھی مر جائے گی مگر اپنی عزت پر حرف نہیں آنے دے گی۔ لیکن شہاب اور فیروز کو وہ ہر حالت میں ہلاک کرنا چاہتا تھا۔ جنہوں نے دوستی کے پاکیزہ رشتے کو پامال کرتے ہوئے اس بچی کو اغوا کر لیا تھا جو ان کی بیٹی کی جگہ پر تھی۔

شیر خان نے کسی نہ کسی طرح رات گزاری۔ دن نکلا تو اپنے پرانے سنہالی اسمگلر ساتھی ارجنا کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ یہ علاقہ بھی شیر خان کا جانا پہچانا علاقہ تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اسمگلروں کا ٹھکانہ کہاں ہو سکتا ہے۔ وہ کچھ دور تک ساحل سمندر کے ساتھ چلتا رہا۔ پھر ایک ٹاپو کی طرف مڑ گیا۔ یہاں سمندر ایک جھیل کی شکل میں تھا اور تین اطراف اونچے اونچے تاڑ کے درخت کھڑے تھے۔ وہ ان درختوں کی طرف چل پڑا یہاں سے آگے زمین اونچی نیچی تھی اور گھنا جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ شیر خان کے پاس سوائے ایک چاقو کے دوسرا کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ وہ ایک درخت کے نیچے تھوڑی دیر ستانے کے لیے بیٹھ گیا۔ اس کی اسمگلروں والی حس بڑی تیزی سے اپنا کام کرنے لگی تھی۔ یہ جنگل اس نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اتنا وہ جانتا تھا کہ اس قسم کی کھاڑیوں میں اسمگلر اپنے خفیہ اڈے عام طور پر ایسی جگہوں پر بناتے ہیں جہاں کوئی ندی نالہ کھاڑی سے نکل کر جنگل میں داخل ہو گیا ہو۔ اس طرح انہیں مال لانے لے جانے میں آسانی ہوتی ہے تھوڑی دیر ستانے کے بعد وہ کھاڑی کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ آخر اسے اپنا مدعا مل گیا۔ یعنی ایک جگہ سے کھاڑی میں سے چھوٹی سی ندی نکل کر جنگل کے اندر چلی گئی تھی۔ شیر خان ندی کے ساتھ ہو لیا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ندی صرف اتنی چوڑی تھی کہ اس میں چھوٹی کشتی یعنی سمپان ہی چل سکتی تھی۔ کنارے پر بے شمار جنگلی جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ کسی کسی وقت کسی پرندے کے بولنے کی آواز آجاتی تھی۔ ایک جگہ پہنچ کر شیر خان رک گیا اور ندی کے کنارے کو جھک کر دیکھنے لگا۔ یہاں زمین پر ایسا راستہ سا بنا ہوا تھا جیسے کسی شے کو یہاں سے گھسیٹ کر لے جایا گیا ہو اور یہ عمل بار بار دہرایا جاتا رہا ہو۔ وہ سمجھ گیا کہ مال یہیں سے آتا جاتا ہو گا۔ اسے اسمگلنگ کے خفیہ اڈے کا سراغ مل گیا تھا۔ وہ ندی سے ہٹ کر اسی نشان کے ساتھ ساتھ جنگل کے اندر آگیا۔ یہاں بڑا حبس تھا اور دیودار کے درخت ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ اچانک ایک طرف سے دو آدمی نکل کر اس کے سامنے آگئے۔ دونوں ناٹے قد کے کالے کالے سیلونی تھے۔ اور دونوں کے ہاتھوں میں پستول تھے جن کا رخ شیر خان کی طرف تھا۔ انہوں نے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں پوچھا کہ تم کون ہو۔ ادھر کیا لینے آئے ہو؟ شیر خان نے بڑے اطمینان سے سنہالی زبان میں جواب دیا۔

"میں ارجنا سے ملنے آیا ہوں۔" ایک اونچے قد کاٹھ کے گورے چٹے ادھیڑ عمر مگر مضبوط جسم کے آدمی کو لنکا کی سنہالی زبان میں بات کرتے دیکھ کر دونوں سنہالی حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ایک نے سنہالی زبان میں شیر خان سے پوچھا۔

"تم ہماری زبان کیسے جانتے ہو؟"

شیر خان بولا "یہ تمہیں ارجنا ہی بتائے گا۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ کیا ارجنا اسی جنگل میں ہے؟ اگر ہے تو اسے جا کر کہو کہ اس کا پرانا دوست اور ساتھی شیر خان اس سے ملنے آیا

ہے۔" دونوں سنہالیوں نے آپس میں سرگوشی میں کوئی بات کی پھر آگے بڑھ کر شیر خان کو ہاتھ اوپر اٹھانے کو کہا۔ شیر خان نے ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔ دونوں نے شیر خان کی تلاشی لی اور اس کا چاقو اپنے قبضے میں کر لیا۔ پھر کہا۔

"تم اسی جگہ بیٹھو۔"

ایک سنہالی چلا گیا۔ دوسرا سنہالی پستول ہاتھ میں لیے شیر خان سے دو چار قدم کے فاصلے پر پہرے پر کھڑا رہا۔ کوئی پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ درختوں میں سے ارجنا اس کی طرف آتا نظر آیا۔ شیر خان نے دور ہی سے اسے پہچان لیا۔ اس کے بال بھی تھوڑے تھوڑے سفید ہو گئے تھے مگر دبلا پتلا جسم اسی طرح چاق و چوبند تھا۔ شیر خان کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ پھر دونوں بازو کھول کر سنہالی زبان میں میرے پیارے شیر کہتا اس سے لپٹ گیا۔ پہرے پر کھڑے سنہالی نے اپنی پستول جیب میں ڈال لی۔ دونوں دوست ایک مدت کے بعد ملے تھے۔ بار بار ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور لپٹ جاتے ارجنا نے اپنا بازو شیر خان کی گردن میں ڈال رکھا تھا۔ وہ اسے اپنے اڈے پر لے آیا۔ یہ خفیہ اڈہ ویسا ہی تھا جیسے اسمگلروں کے خفیہ ٹھکانے ہوا کرتے ہیں۔ اوپر سے دو تین جھونپڑے ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ ایک جھونپڑے میں ناریل بھرے پڑے تھے۔ دوسری جھونپڑے کے باہر ناریل کی چھال سے رسی بٹنے والا تکلا لگا تھا اور تیسرے جھونپڑے میں بیٹھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی۔ ظاہر یہ کیا گیا تھا کہ یہاں ناریل کی چھال سے رسیاں کاٹی جاتی ہیں مگر اصل کام ان جھونپڑوں کے پیچھے ایک زمین دوز تہہ خانے میں ہوتا تھا۔ جہاں اسمگل کرنے والی کوکین چرس اور ہیروئن کی تھیلیاں پڑی تھیں۔ ارجنا شیر خان کو اس تہہ خانے میں لے گیا اور بولا۔

"بس اب اتنا ہی کام باقی رہ گیا ہے بھائی چرس تو اوپر سے آنی بند ہو گئی ہے۔ ہیروئن کی مانگ زیادہ ہے۔ مگر ہیروئن کی اسمگلنگ اب بڑی خطرناک ہو گئی ہے۔ ادھر مال لینے کوئی اپنا آدمی نہیں بھیجتا۔ ہمیں خود مال اوپر کی گھاٹ تک پہنچانا پڑتا ہے۔ لنکا کی حکومت نے اتنی سختی کر رکھی ہے کہ پچھلے ایک مہینے میں ہمارے چار آدمی مارے گئے ہیں اور مال الگ پکڑ لیا گیا ہے۔ تم سناؤ تم انڈیا میں ہو یا پاکستان میں؟ ہم نے تو سنا تھا کہ تم روبی کے ساتھ انڈیا چلے گئے ہو۔ روبی کہاں ہے؟ تم بھی میری طرح بوڑھے ہو گئے ہو مگر اسی طرح

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

باڈی بلڈر ہو ابھی تک۔"

اور ارجنا قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ پھر دونوں دوست اوپر جھونپڑی میں آکر بیٹھ گئے۔ ارجنا نے پوچھا۔

"کیا چلے گا؟ سب کچھ ہے۔ کل ہانگ کانگ سے اصلی اسکاچ آئی تھی۔ کہو تو بوتل ابھی آجائے گی۔" شیر خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں ارجنا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں تب بھی شراب نہیں پیا کرتا تھا۔ اور اب تو اس قسم کی باتوں کی عمر بھی نہیں رہی۔" ارجنا ہنس کر بولا۔

"میرے یار! یہی تو عمر ہوتی ہے اسکاچ پینے کی۔"

"نہیں تم چائے بنواؤ۔ میں تمہارے ساتھ بیٹھ کر لنکا کی اصلی چائے پیوں گا۔"

"بہت خوب۔" ارجنا نے اشارے سے اپنے آدمی کو بلایا اور سنہالی زبان میں اسے چائے بنانے کا حکم دیا۔ پھر کہنے لگا۔

"شیر خان! تم نے یہ نہیں بتایا کہ روبی کہاں ہے۔ تم دونوں لنکا سے کیسے فرار ہوئے تھے۔" پھر خود ہی ہنس کر بولا۔

"یار فرار ہونا اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ تمہارے پیچھے لوگوں نے یہی مشہور کر دیا تھا کہ تم نے نہ جانے کتنے کروڑ کی کوکین بیچ کر سارا روپیہ لے کر روبی کے ساتھ کسی طرف بھاگ گئے ہو۔"

شیر خان سگریٹ سلگا رہا تھا۔ ایک کش لگا کر اس کا دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔

"چائے آجائے تمہیں سب کچھ بتاتا ہوں۔"

لیکن شیر خان نے ارجنا کو سب کچھ نہ بتایا صرف اتنا بتایا کہ اس نے روبی سے پاکستان میں جا کر شادی کر لی تھی۔ پھر روبی فوت ہو گئی اس کے بعد وہ اکیلا رہ گیا۔ کئی کاروبار کیے ہر کاروبار میں نقصان اٹھانا پڑا۔

"اب میں ہر طرف سے مایوس ہو کر دوبارہ یہاں تمہارے پاس آگیا ہوں میں چاہتا ہوں کہ دوبارہ اپنا پرانا دھندا شروع کر دوں تاکہ کچھ دولت کماؤں اور پیچھے مجھ پر جو لوگوں کے قرض ہیں وہ ادا کر سکوں۔"

ارجنا بڑی دلچسپی سے شیر خان کی باتیں سنتا رہا۔ جب شیر خان نے اپنی بات ختم کی تو اس نے بڑی خوشدلی سے کہا۔

"شیر خان بھائی! میں آج سے اتنے برس پہلے بھی تمہارا دوست تھا اور آج بھی تمہارا دوست ہوں۔ مجھے وہ وقت نہیں بھولا جب تم لاکھوں میں کھیل رہے تھے اور میری ہر طرح مدد کیا کرتے تھے تم مجھ پر بھروسہ کر کے مجھے ہزاروں کا مال دے دیا کرتے تھے۔ اب اگرچہ حالات بدل گئے ہیں لیکن میں حاضر ہوں۔ جتنی بھی ہو سکی تمہاری ضرور مدد کروں گا۔"

شیر خان نے ارجنا کا شکریہ ادا کیا۔ دوپہر کو انہوں نے اسی جھونپڑی میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ باتوں ہی باتوں میں شیر خان نے بظاہر بڑی بے نیازی سے شہاب اور فیروز کے بارے میں پوچھا کہ وہ آج کل کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ ارجنا سگار پی رہا تھا۔ اور دری پر ٹانگیں پھیلائے نیم دراز تھا کہنے لگا۔

"ان دونوں سے ایک عرصہ ہوا ملاقات نہیں ہو سکی اصل میں ان کا سارا کاروبار شمال میں جافنا کی طرف ہے۔ وہ وہیں رہتے ہیں۔ کولمبو والے سیٹھوں کا اڈہ تو ایک مدت ہوئی ختم ہو چکا ہے سنا ہے کہ آج کل بھی وہ دونوں جافنا کے پاس کسی جزیرے میں ہوتے ہیں۔ وہیں سے مال باہر اسمگل کرتے اور وصول کرتے ہیں۔"

شیر خان نے سگریٹ جھونپڑی سے باہر اچھالتے ہوئے کہا۔

"ان دونوں سے ملاقات کرنے کو بڑا جی چاہتا ہے۔ ان کے ٹھکانے کا پتا چل جائے تو کبھی ان سے بھی ملاقات ہو جائے۔ آخر وہ بھی میرے پرانے ساتھی ہیں۔"

"کیوں نہیں۔" ارجنا بولا۔ تمہیں پتا کروا دوں گا۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آج ہی ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا کر جافنا کی طرف بھیج دیتا ہوں۔" شیر خان نے جلدی سے کہا۔

"مگر ارجنا میں اپنے ان پرانے ساتھیوں سے بھی اچانک ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ اگر انہیں پتا چل گیا کہ میں یہاں آیا ہوا ہوں تو پھر ملاقات کا مزا نہیں آئے گا اپنے آدمی سے کہو کہ وہ شہاب اور فیروز کو میرے بارے میں کچھ نہ بتائے۔ بس ان کا ٹھکانہ معلوم کر کے واپس آجائے۔ میں خود ان کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ اور جب وہ دونوں مجھے ایک دم سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اپنے سامنے دیکھیں گے تو کتنے حیران ہوں گے۔"

شیر خان مصنوعی ہنسی ہنس دیا۔ کیونکہ وہ یہ ہرگز ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ شہاب اور فیروز کو اس کے لٹکا پہنچنے کا علم ہو۔ اس طرح سے تو وہ دونوں اپنا ٹھکانہ بدل لیں گے اور عائشہ کو لے کر کسی دور دراز مقام پر منتقل ہو جائیں گے۔ شیر خان ابھی تک اسی خیال میں تھا کہ عائشہ شیرنی شہاب اور فیروز کے پاس ہی ہو گی۔ ارجنا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا کہنے لگا۔

"ٹھیک ہے وہ بھی تمہارے بڑے پرانے ساتھی ہیں۔ بلکہ وہ تو تمہارے ملک کے رہنے والے ہیں۔ تمہیں اتنے برسوں کے بعد اچانک دیکھ کر سچ مچ وہ بڑے حیران ہوں گے۔ چلو ٹھیک ہے میں اپنے آدمی کو منع کر دوں گا کہ وہ تمہارے بارے میں کوئی بات نہ کرے۔"

شیر خان جانتا تھا کہ شہاب اور فیروز بڑے عیار ہیں۔ اگر انہیں ارجنا کے آدمی پر ذرا سا بھی شک پڑ گیا تو وہ اسے روپے کا لالچ دے کر یہ معلوم کر لیں گے کہ ارجنا کے پاس فلاں حلیئے کا آدمی آیا ہوا ہے۔ اور پھر شیر خان اور اس کے دشمنوں کے درمیان اور اس کی شیرنی بیٹی کے درمیان فاصلہ مزید طویل ہو جائے گا۔ اس نے ارجنا سے کہا۔

"میرے بھائی! تم ایسا کرو کہ احتیاط کے طور پر کسی ایسے آدمی کو بھجواؤ جس نے مجھے تمہارے پاس نہ دیکھا ہو۔" ارجنا فوراً راضی ہو گیا۔

"ٹھیک ہے شیر خان! میں دوسرے ٹاپو پر جا کر وہاں سے ایک آدمی بھیج دوں گا اور اسے تاکید کر دوں گا کہ وہ شہاب اور فیروز کو یہ بھی نہ بتائے کہ ارجنا نے بھیجا ہے بس ان کے ٹھکانے کا سراغ لگا کر واپس آجائے یہ ہو جائے گا یار بھائی اس کی تم فکر نہ کرو۔ ویسے میں تمہیں ایک مشورہ دوں گا شہاب اور فیروز کے ساتھ کاروبار شروع کرنے کے بارے میں ہرگز نہ سوچنا میں نے ان دنوں سنا تھا کہ وہ دونوں تمہارے خلاف اس قسم کی باتیں کر رہے ہیں کہ تم ان کا مال لے کر فرار ہو گئے ہو۔"

"یہ سب جھوٹ ہے ارجنا میں مال کو وہیں آگ لگا کر گیا تھا اور اگر مجھے شہاب اور فیروز کے ساتھ ہی یہاں کاروبار شروع کرنا ہوتا تو میں تمہارے پاس نہ آتا بلکہ ان کی تلاش میں سیدھا جافنا جاتا یا تیرے پاس آکر سب سے پہلے ان کے بارے میں پوچھتا میں تو خود ان

پر اعتبار نہیں کرتا صرف تمہیں ہی اپنا سچا دوست سمجھتا ہوں اور وطن چھوڑ کر سیدھا تمہارے پاس ہی آیا ہوں۔ ان سے تو میں ویسے ہی ملاقات کرنا چاہتا تھا۔"

"بس ٹھیک ہے۔" ارجنا نے شیر خان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبایا اور کہا۔ "مجھے اپنا جگری دوست سمجھو۔ اپنا خیر خواہ سمجھو۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا تمہارے واسطے کروں گا۔" پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ "میں کچھ دنوں سے سوچ رہا تھا کہ بجائے مال ایجنٹوں کے حوالے کرنے کے خود اسے لے کر آسٹریلیا پہنچنے کی کوشش کروں۔ مگر مجھے کوئی بااعتبار ساتھی نہیں مل رہا تھا۔ اب تم آگئے ہو تو مجھے حوصلہ ہوا ہے۔ اگر تم میرے ساتھ چلنے کی حامی بھر لو تو جو رقم ملے گی دونوں آدھی آدھی کر لیں گے۔ کیا خیال ہے؟ یار بھائی! یہ ایجنٹ تو سو کا ایک روپیہ بھی نہیں دیتے اور ہیروئن بڑا مہنگا آئیٹم ہے۔"

شیر خان نے جانا تو تھا نہیں اس لئے فوراً حامی بھ لی پھر تھوڑی مصنوعی تشویش کے ساتھ کہنے لگا۔

"ارجنا! اب میری وہ جوانی والی عمر نہیں رہی۔ اتنے بڑے کام کے لیے میں اپنے کو اہل نہیں پاتا ہاں یہاں رہ کر میں تیرا ہاتھ ضرور بٹا دوں گا۔"

"اچھا یارا جیسے تیری مرضی۔ میں کسی دوسرے کو ساتھ لے چلوں گا۔ یوں تو کئی لوگ میرے ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔ پر مجھے اعتبار کسی پر نہیں۔ تم پر پورا اعتبار تھا۔ چلو خیر۔ اس بارے میں پھر کبھی بات کریں گے ابھی بہت وقت پڑا ہے اب تم آرام کرو۔"

شیر خان کو بار بار اپنی بیٹی کا خیال ستا رہا تھا۔ کہ وہ نہ جانے کس حال میں ہو گی۔ وہ بجلی کی طرح کڑکتا ہوا شہاب اور فیروز کے سروں پر جا پہنچنا چاہتا تھا مگر وہ مجبور تھا۔ اسے ان دشمنوں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس جگہ پر ہیں۔ ذرا سی بے احتیاطی اور جذباتی پن خود شیر خان کے واسطے جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح دوسری رات بھی گزر گئی۔

دوسرے روز ارجنا نے ایک آدمی شہاب اور فیروز کا پتا چلانے کے واسطے جافنا کی طرف بھیج دیا۔ ارجنا نے دوسرے ٹاپو سے ایک ایسے آدمی کو اس کام کے لیے بھیجا تھا جس کو شیر خان کی آمد کا علم ہی نہیں تھا۔ جب تک وہ آدمی واپس نہیں آیا شیر خان اندر ہی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اندر سخت بے چین رہا۔ مگر اوپر سے اس نے اپنی بے چینی کو ذرا بھی ظاہر نہیں ہونے دیا۔

دو دن بعد وہ آدمی واپس آگیا اور اس نے خبر دی کہ شہاب اور فیروز پورٹ پیڈرو کے جزیرے میں ہوتے ہیں۔ وہیں ہانگ کانگ سے آنے والے ناجائز مال کو وصول کر کے اوپر انڈیا کی طرف اسمگل کرتے ہیں۔ شیر خان وہاں جانے کے لیے بے چین ہو گیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں شہاب اور فیروز اس کی بیٹی کو لے کر کہیں وہاں سے چلے نہ جائیں اس کے ذہن میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ شہاب اور فیروز عائشہ کو قتل بھی کر سکتے ہیں۔ وہ اسے آگے فروخت بھی کر سکتے ہیں۔ ارجنا نے شیر خان کو بہت کہا کہ ابھی کچھ روز اس کے پاس رہے مگر وہ یہی کہتا رہا کہ شہاب اور فیروز سے پہلے مل آؤں۔ پھر تمہارے پاس ہی آکر رہنا ہے۔ چنانچہ اسی روز وہ دوپہر کی ریل گاڑی سے جافنا کی طرف چل دیا۔

اگر آپ نقشہ دیکھیں تو آپ کو سری لنکا کے جزیرے کے شمال میں جافنا کے بالکل اوپر پورٹ پیڈرو لکھا ہوا نظر آئے گا۔ یہ کوئی اتنی اہم بندرگاہ نہیں ہے۔ کیونکہ لنکا سے مال بردار جہاز ٹالی منار کی بندرگاہ ہی سے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ اور جاپان کی طرف جاتے ہیں۔ کیونکہ پورٹ پیڈرو ذرا جنوب کی طرف ہٹ کر واقع ہے اور عام سمندری شاہراہ پر نہیں ہے۔ ویسے بھی اس کے آس پاس سمندری چٹانوں کی بھرمار ہے۔ اور ایسی جگہ تجارتی بندرگاہوں کے لیے موزوں نہیں ہوا کرتی۔ لیکن وہاں حکومت کی طرف سے کوسٹ گارڈز کی پوری گارڈ ہمہ وقت موجود رہتی ہے اور ایک بہت بڑا لائٹ ہاؤس بھی سمندری چٹان پر بنا ہوا ہے کیونکہ ٹرنکو مالی اور باتی کلاوا کی طرف جانے والے بحری جہاز اسی طرف سے گزرتے ہیں۔ یہ لائیٹ ہاؤس ان کو پانی میں چھپی ہوئی نوکیلی چٹانوں سے دور رہنے کی ہدایت کرتا ہے۔ وہاں سمندر مختلف چھوٹے چھوٹے ٹاپوؤں میں تقسیم ہو کر ساحلی چٹانوں میں سے ہوتا ہوا اندر جنگل تک چلا گیا ہے۔ جرائم پیشہ لوگ اور اسمگلروں کے چھپنے اور خفیہ اڈے بنانے کے لیے یہ نہایت موزوں جگہ ہے۔ سمندر میں قریبی بندرگاہوں کی طرف آتے جاتے اسٹیمروں کو لوٹنے والے ڈاکو بھی کبھی کبھی یہاں مال لے کر چھپ جاتے ہیں ساحلی گارڈز کی اکثر ان لوگوں اور دوسرے اسمگلروں سے جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ چونکہ یہاں سے شمال مشرق اور مغرب کی طرف سمندر کھلا ہے اور رات کے اندھیرے

میں اسمگلنگ کا مال لے کر اسٹیمر اور کشتیاں تین اطراف سے آجا سکتی ہیں اس لیے یہ سارے کا سارا شمالی سنگلاخ ساحلی علاقہ جرائم پیشہ افراد کی جنت سمجھا جاتا ہے۔ ساحلی گارڈز بھی ان کی طرف سے چشم پوشی کرتی ہے اور صرف ان لوگوں پر فائرنگ کھولتی ہے جن کے ساتھ کمیشن کا معاملہ طے نہیں ہوا ہوتا۔

یہی پورٹ پیڈرو کبھی شیر خان اور روبی کی سرگرمیوں کا مرکز ہوتا تھا۔ یہاں انہوں نے کئی معرکے مارے تھے اور ساحلی گارڈز کی فائرنگ کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ یوں اس علاقے کا چپہ چپہ شیر خان کا جانا پہچانا تھا۔ وہ رات کے پچھلے پہر جافنا پہنچا۔ اتنی مدت بعد وہ یہاں آیا تھا ریلوے اسٹیشن تھوڑا بدل گیا تھا۔ شہر کی آبادی بھی گنجان ہو گئی تھی۔ کئی نئی عمارتیں اسے جگمگاتی نظر آئیں۔ باقی شہر ویسے کا ویسا ہی تھا اور شیر خان کے لیے اجنبی نہیں تھا۔ جافنا سے ٹرین کنکے سموریا تک ہی جاتی تھی جو شمال کی طرف جزیرہ سری لنکا کا آخری ریلوے اسٹیشن تھا۔ اس کی دائیں جانب تقریباً دس بارہ میل کے فاصلے پر پورٹ پیڈرو کا ساحلی علاقہ آجاتا تھا۔ شیر خان نے رات کا باقی حصہ وہیں اسٹیشن پر گزارا۔

صبح کے چھ بجے ایک چھوٹی ریل گاڑی میں سوار ہو گیا۔ اس ریل گاڑی نے دو گھنٹوں میں اسے کنکے سموریا پہنچا دیا۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں اس نے اپنی نوجوانی کے بہترین ایام گزارے تھے۔ وہ یہاں آنکھیں بند کر کے بھی راستہ تلاش کر سکتا تھا۔ شہاب اور فیروز کے گروہ میں ابھی تک ایسے لوگ موجود تھے جو شیر خان کو شکل سے پہچانتے تھے۔ اس لیے شیر خان بڑا محتاط ہو کر چل رہا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ شہاب یا فیروز میں سے کسی کو اس کے جزیرے پر پہنچنے کی خبر ہو۔ لیکن یہ سراغ لگانا بھی ضروری تھا کہ یہ دونوں بدکردار انسان کس ٹاپو کے جنگل میں ہیں اور انہوں نے عائشہ کو کہاں قید کر رکھا ہے۔

ایک مچھیرا چھوٹی کشتی چلاتا ٹاپو کی کھاڑی میں نمودار ہوا۔ شیر خان ایک طرف چھپ کر اسے دیکھنے لگا۔ مچھیرا کشتی چلاتا آگے نکل گیا۔ شیر خان نے ماحول کا گہری نگاہ سے جائزہ لیا۔ یہ جنگل تھوڑا بدل گیا تھا۔ کہیں درختوں کے پرانے ذخیرے ختم ہو گئے تھے اور کہیں نئے درختوں کے جھنڈ اگ آئے تھے۔ شیر خان جنگل کے اندر گھستا چلا گیا۔ اسے معلوم تھا کہ وہاں ایک اندھا خشک کنواں ہوا کرتا تھا جہاں وہ لوگ کبھی کبھی چھاپہ پڑنے پر اپنا مال چھپا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دیا کرتے تھے وہ چند قدم گیا ہو گا کہ ایک ٹھگنے قد کا سنہالی درختوں میں سے نکل کر اس کے سامنے آگیا اور سنہالی زبان میں بولا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟" جسم کے قد کاٹھ اور رنگ روپ سے شیر خان وہاں کا آدمی کسی طرح سے بھی نہیں لگتا تھا۔ مگر جب شیر خان نے بڑی رواں سنہالی زبان میں جواب دیا کہ وہ کولمبو سے جڑی بوٹیوں کی تلاش میں ادھر آیا ہے تو سنہالی ٹھیک ہے ٹھیک کہتا آگے نکل گیا۔ ذرا آگے جا کر وہ سنہالی جھاڑی میں چھپ گیا اور شیر خان کے وہاں سے گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ شہاب اور فیروز کے گروہ کا آدمی تھا اور اسے سختی سے حکم دیا گیا تھا کہ کوئی بھی اجنبی ادھر سے گزرتا دیکھے تو اسے وہیں ہلاک کر ڈالے کیونکہ یہ شہاب اور فیروز کی ناجائز سرگرمیوں کا بڑا حساس علاقہ تھا۔ مشکوک اجنبی کو ہلاک کر دینے پر کارکن کو شہاب فیروز کی جانب سے بڑا انعام دیا جاتا تھا۔ چنانچہ جب اس سنہالی نے ایک اجنبی کو دیکھا تو انعام کے لالچ میں وہ شیر خان کو وہیں ہلاک کر ڈالنا چاہتا تھا مگر اس کے قد کاٹھ کی وجہ سے سنہالی کی ہمت نہ پڑی۔ چنانچہ وہ آگے جا کر گھات لگا کر بیٹھ گیا۔

شیر خان کے پاس بڑا کمانی دار چاقو ضرور تھا مگر وہ اس کے ہاتھ میں نہیں تھا بلکہ پتلون کی جیب میں تھا۔ جونہی شیر خان جھاڑی کے قریب سے گزرا سنہالی نے پیچھے سے حملہ کر دیا۔ شیر خان کی تقریباً آدھی سے زیادہ عمر انہی کاموں میں گزری تھی۔ اس کی چھٹی حس نے اسے عین وقت پر خبردار کر دیا اور اگر وہ بجلی کی طرح تڑپ کر ایک طرف نہ ہو جاتا تو سنہالی کا دس انچ لمبا خنجر اس کی کمر کو چیرتا ہوا اس کے دل میں گھس گیا ہوتا۔ سنہالی دنگ سا ہو کر رہ گیا کہ یہ آدمی کس مٹی کا بنا ہوا ہے۔ اب یہ سنہالی شیر خان کے ہاتھ سے بچ کر نہیں جا سکتا تھا۔ شیر خان سمجھ گیا تھا کہ یہ شہاب اور فیروز کے گینگ کا آدمی ہے اور اسے یہاں مشتبہ افراد کی نگرانی کے لیے چھوڑ رکھا گیا ہے۔ شیر خان کو صرف ایک ہی خطرہ تھا کہ سنہالی کہیں شور نہ مچا دے۔ اس طرح شہاب اور فیروز کو وہاں سے کسی دوسری جگہ نکل جانے اور عائشہ کو گزند پہنچانے کا موقع مل سکتا تھا۔ سنہالی نے کمال جرات سے کام لیتے ہوئے خنجر تان لیا شیر خان نے بھی جیب سے کمانی دار چاقو نکال لیا۔ مگر وہ سنہالی کے ساتھ داؤ پیچ کا کھیل نہیں کھیلنا چاہتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر سیدھی لات اتنی زور سے سنہالی

کے بازو پر ماری کہ اس کے ہاتھ سے خنجر اچھل کر دور جا گرا۔ شیر خان نے اسے وہیں دبوچ لیا اور چاقو اس کی شہ رگ پر رکھ دیا۔

"شہاب اور فیروز کا اڈہ کہاں ہے؟" شیر خان اس سنہالی کو یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ میں ان لوگوں کی سرگرمیوں سے واقف ہوں اور ان ہی کی تلاش میں وہاں آیا ہوں۔ سنہالی نے پہلے تو زبان بند رکھی لیکن جب شیر خان نے چاقو کا پھل اس کی گردن میں تھوڑا دبایا تو وہ بک پڑا۔

"آگے ایک پوکھر کے پاس ہے۔" شیر خان نے دوسرا اہم ترین سوال پوچھا۔

"وہ جس لڑکی کو اپنے ساتھ ہندوستان سے لائے تھے وہ کہاں ہے۔ جلدی بتاؤ نہیں تو تمہاری گردن کاٹ دوں گا۔" سنہالی کو اپنی جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس نے کہا۔

"وہ کسی لڑکی کو انڈیا سے نہیں لائے وہ تو دونوں اکیلے یہاں آئے تھے۔" شیر خان تذبذب میں پڑ گیا۔ اس نے چاقو کا پھل مزید دباتے ہوئے غصے سے پھر پوچھا۔

"تم جھوٹ بکتے ہو۔ وہ اپنے ساتھ ایک لڑکی بھی لائے تھے۔" پھر شیر خان نے عائشہ کا تھوڑا سا حلیہ بیان کیا۔ سنہالی نے دونوں ہاتھ کانوں سے لگائے اور عاجزی سے بولا۔

"میں بھگوان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جب وہ انڈیا سے واپس آئے تھے تو ان کے ساتھ کوئی لڑکی نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو مجھے بتانے میں کیا حرج تھا؟" شیر خان نے چاقو سنہالی کی گردن سے ہٹایا وہ اٹھا ہی تھا کہ ایک آدمی جھاڑیوں میں سے نکل کر اس جھپٹا۔ اس آدمی کے ہاتھ میں ڈھا تلوار کی طرح کا ہتھیار ہوتا ہے مگر اس کی کاٹ تلوار سے زیادہ مہلک اور تیز ہوتی ہے۔ یہ سارے ہتھیار شیر خان کے آزمائے ہوئے تھے۔ شیر خان اچھل کر پرے ہو گیا۔ اور فوراً ہی ہاتھ کو گھما کر چاقو اس آدمی کی طرف پھینکا اس قسم کی نشانے بازی میں شیر خان کو بڑی مہارت حاصل تھی اور اس کا وار کبھی خالی نہیں گیا تھا۔ چاقو بجلی کی طرح لشکارا مار کر دوسرے سنہالی کے پیٹ پر لگا اور اندر گھس گیا۔ ڈھا اس کے ہاتھ سے گر پڑا اور وہ دونوں ہاتھ پیٹ پر رکھ کر دوزانوں ہو گیا۔ اتنی دیر میں پہلے سنہالی کو موقع مل گیا اس نے اٹھ کر اپنا خنجر پکڑنے کی کوشش کی جو چند قدم کے فاصلے پر پڑا تھا مگر اب شیر خان اسے بھی کوئی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے سنہالی پر چھلانگ لگا دی اور اس کی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گردن کو اپنے طاقتور بازو کے شکنجے میں لے کر ایک ایسا ماہرانہ جھٹکا دیا کہ سنہالی کی گردن ٹوٹ گئی۔ گردن ٹوٹنے کی آواز سنتے ہی شیر خان نے اسے وہیں گرا دیا۔ سنہالی مر چکا تھا۔ دوسرا سنہالی شدید زخمی ہو کر گھاس پر تڑپ رہا تھا۔ خون بری طرح اس کے پیٹ سے بہہ رہا تھا۔ شیر خان نے اس کے پیٹ میں کھبا ہوا چاقو نکالا۔ اسے قریب المرگ سنہالی بدمعاش کے گھٹنوں سے اوپر تک بندھی ہوئی دھوتی سے پونچھ کر صاف کیا۔ اسے بند کر کے جیب میں ڈالا۔ پاس ہی پڑا ہوا ڈھال اٹھا لیا۔ پھر شدید زخمی اور آخری سانس لینے والے سنہالی پر جھک کر پوچھا۔

"شہاب اور فیروز اپنے ساتھ پنجاب سے جو لڑکی لائے تھے وہ کہاں ہے؟"

قریب المرگ سنہالی نفی میں سر ہلانے لگا۔ شیر خان نے کہا۔

"وہ اپنے ساتھ ایک لڑکی لے کر آئے تھے۔ وہ گورے رنگ کی تھی اس کے بال گولڈن تھے بتاؤ وہ انہوں نے کہاں رکھی ہوئی ہے؟"

سنہالی کا کافی خون بہہ چکا تھا اور اس پر نزع کا عالم طاری تھا۔ احساسات جواب دے رہے تھے۔ اس نے جیسے شیر خان کی بات نہیں سنی تھی۔ شیر خان نے ایک بار پھر اپنی بات کو دہرایا مگر سنہالی مر چکا تھا۔ شیر خان نے دونوں لاشوں کو وہیں جنگل میں چھوڑا اور آگے چل پڑا۔ اب وہ اس کنوئیں کے پاس آگیا جہاں کسی زمانے میں وہ اسمگلنگ کا مال چھپایا کرتے تھے۔ سنہالی نے جس پوکھر کا ذکر کیا تھا وہ شیر خان کو معلوم تھا کہ کہاں پر ہے۔ اس پوکھر کے پاس کبھی ہانگ کانگ والے ٹونی نے اپنا خفیہ اڈہ قائم کر رکھا تھا۔ اندھے کنوئیں کی مینڈیروں پر اونچی اونچی گھاس اگ رہی تھی۔ شیر خان نے نیچے جھانک کر دیکھا۔ کنوئیں میں سوکھے پتوں اور درختوں کی شاخوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ کنوئیں کی پتھریلی سیڑھیاں بھی گھاس میں چھپ گئی تھیں۔ صاف ظاہر تھا کہ اب اس کنوئیں کو استعمال نہیں کیا جاتا۔ اس بات کا شیر خان کو علم ہو چکا تھا کہ شہاب اور فیروز پوکھر والے ٹھکانے میں ہوتے ہیں۔ اسے صرف ایک بات کی پریشان تھی کہ عائشہ کو اغوا کرنے کے بعد انہوں نے کہاں رکھا ہے کہیں اسے فروخت تو نہیں کر دیا؟ شیر خان کا خون کھول اٹھا۔ اس کے کانوں سے سینک اٹھنے لگا۔ مٹھیاں بھینچ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کو اپنے اوپر ایک بے بس شیر کا گمان

ہوا جس کو چاروں طرف سے آہنی سلاخوں نے اپنے گھیرے میں لے لیا ہو۔ دل میں شہاب اور فیروز دونوں کو قتل کر دینے کا ارادہ کر کے وہ پوکھر کی طرف چلا۔

تھوڑا آگے چلا ہو گا کہ بائیں طرف سنبل کے ساتھ ساتھ اگے ہوئے بڑے گھنے درختوں کے درمیان اسے ایک جھونپڑا نظر پڑا۔ جس کی ڈھلوان چھت ناریل کی شاخوں سے بنی ہوئی تھی۔ اور جس کے باہر چٹائی پر ایک بوڑھا سنہالی ہاتھ میں تسبیح لئے بیٹھا منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ قریب ہی ایک عورت مٹکے میں سے شاید اچار نکال کر لکڑی کے پیالے میں ڈال رہی تھی۔ عورت بھی ادھیڑ عمر کی تھی اور اس نے سر پر نیلا رومال باندھ رکھا تھا۔ لنکا کی مسلمان عورتیں اسی طرح اپنے سروں کو ڈھانپ کر رکھتی ہیں۔ بوڑھے نے بھی شیر خان کو دیکھ لیا تھا۔ شیر خان نے سوچا کہ یہ لوگ اسمگلروں کے خفیہ اڈے کے قریب رہتے ہیں یہ ان کے پروردہ ہی ہوں گے وہ بوڑھے سنہالی سے آنکھیں بچا کر نکل جانا چاہتا تھا کہ اچانک وہ ٹھٹک گیا۔ اسے یوں لگا جیسے اس بوڑھے کی شکل جانی پہچانی ہے۔ اب بوڑھے نے بھی شیر خان کو دیکھ لیا تھا۔ درختوں میں دھوپ چھن چھن کر آرہی تھی اور وہاں کافی روشنی تھی۔ جونہی شیر خان نے آگے قدم بڑھائے بوڑھے نے سنہالی زبان میں اسے آواز دی۔

"تم شیر خان تو نہیں ہو؟" شیر خان کے قدم وہیں رک گئے۔ وہ بوڑھے کے قریب آگیا۔ ادھیڑ عمر عورت بھی کام چھوڑ کر شیر خان کو تکنے لگی تھی۔ اچانک وقت کے پردے ہٹتے چلے گئے اور شیر خان نے بھی اس بوڑھے کو پہچان لیا۔ وہ بے اختیار کہہ اٹھا

"تم کریم ہو کیا؟"

بوڑھے نے اٹھ کر شیر خان کو گلے لگا لیا۔ "ہاں شیرا میں کریم ہی ہوں۔ مگر بوڑھا ہو گیا ہوں تم بھی وہ پہلے والے جوان شیر خان نہیں رہے مگر تمہاری شکل نہیں بدلی ادھر شہاب سے ملنے جا رہے ہو؟ بیٹھو یہ میری بیوی ہے تم نے اسے پہلے شاید نہ دیکھا ہو۔"

شیر خان وہیں بوڑھے کریم کے پاس چٹائی پر بیٹھ گیا آج سے پچیس تیس برس پہلے کریم ان لوگوں کے خفیہ اڈے پر کھانا وغیرہ پکایا کرتا تھا۔ ابھی شیر خان کریم سے بات ہی کر رہا تھا کہ کچھ اونچی آواز میں باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز ان درختوں کی طرف

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سے آرہی تھی جدھر دو سنہالی بدمعاشوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ کریم نے اس طرف دیکھا اور بولا۔

"شاید شہاب مال لے کر آرہا ہے۔" پھر شیر خان کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔" اچھا ہوا یہ بھی اسی جگہ تمہاری اس سے ملاقات ہو جائے گی۔ تم ابھی ملے نہیں ہو شہاب سے کیا؟" شیر خان نے کریم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا۔

"کریم چچا! میں ابھی شہاب اور فیروز سے نہیں ملنا چاہتا۔ اس میں ایک خاص بات ہے جو تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ تمہیں قسم ہے اسے میرے بارے میں ابھی کچھ نہ بتانا۔ میں پیچھے جھاڑیوں میں چھپ جاتا ہوں۔"

شیر خان نے کریم چچا سے قسم لے لی کہ وہ اس کے بارے میں شہاب یا فیروز وغیرہ کو کچھ نہیں بتائے گا۔ آدمیوں کی اونچی اونچی آوازیں اب قریب آرہی تھیں۔ شیر خان دوڑ کر درختوں کے پیچھے جھاڑیوں میں جا کر چھپ گیا۔ اس نے چاقو کھول کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا تھا۔ جھاڑیوں میں سے اسے کریم چچا کے جھونپڑے کا سامنے والا حصہ بالکل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ درختوں میں سے تین آدمی نکل کر جھونپڑے کی طرف آئے۔ یہ تینوں نوجوان تھے اور شکل و صورت اور دھاریدار بنیانوں سے ہی جرائم پیشہ اسمگلروں کے گروہ کے آدمی لگ رہے تھے۔ وہ گھبراہٹ میں تھے اور آپس میں تیز تیز باتیں کر رہے تھے۔ کریم چچا ان کے قریب گیا۔

"کیا بات ہے۔ تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟" کریم چچا نے ان سے سنہالی زبان میں پوچھا۔ ان میں سے ایک نوجوان نے پیچھے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"کریم چچا ادھرمیش اور سمردھن کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ دونوں کی لاشیں وہاں پڑی ہیں۔"

"شہاب اور فیروز دادا کہاں ہیں؟" کریم چچا نے پوچھا۔

"وہ مال کی ڈلیوری لینے گئے ہیں کل آئیں گے مگر ان لوگوں کو کس نے قتل کیا؟ وہ تو ڈیوٹی پر تھے۔" کریم چچا بھی پریشان نظر آرہا تھا۔ کہنے لگا۔

"کیا پتا انکا آپس میں جھگڑا ہو گیا ہو۔ وہ ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہو گئے ہوں۔"

دوسرا نوجوان بولا۔

"دادا! ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ ہم تو لاشیں یہیں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ مالک آئیں گے تو خود پتا کر لیں گے کیا ہوا۔" کریم چچا نے انہیں ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"ارے لاشوں کو تو اڈے پر لے جاؤ۔ یہاں رات کو جانور نہ کھا جائیں انہیں۔ شہاب دادا کو کیا جواب دو گے کم بختو!" تینوں نوجوان ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ ایک نے کہا۔

"ٹھیک ہے چچا۔ ہم لاشیں لیے جاتے ہیں۔ تم گواہ رہنا ہم نے انہیں قتل نہیں کیا؟"

"ہاں ہاں۔ ٹھیک ہے۔ جاؤ لاشیں لے جاؤ۔" کریم چچا نے کہا اور بیوی کی طرف دیکھا۔ بیوی جھونپڑی کے اندر چلی گئی۔ تینوں آدمی جدھر سے آئے تھے ادھر چلے گئے۔ ان کی باتیں شیر خان نے صاف سن لی تھیں۔ جب تینوں نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ جھاڑیوں میں سے نکل کر کریم چچا کی طرف آیا۔ کریم چچا نے غور سے شیر خان کی طرف دیکھا۔ شیر خان آگے سے کچھ نہ بولا۔ کریم کی بیوی جھونپڑی سے ایک چھاج لے کر باہر آگئی کریم نے شیر خان سے کہا۔

"میرے ساتھ جھونپڑی میں آجاؤ۔" جھونپڑی میں بھی ایک چٹائی بچھی تھی۔ اندر آتے ہی کریم نے شیر خان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

"جھوٹ مت بولنا۔ ان لوگوں کو تم نے قتل کیا ہے؟" شیر خان دو سیکنڈ کے لیے خاموش رہا۔ پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"پہلے حملہ انہوں نے کیا تھا۔ وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ اگر میں انہیں ہلاک نہ کرتا تو ان کی جگہ اس وقت میری لاش پڑی ہوتی۔" کریم چچا نے تعجب کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"شیرو! تم تو شہاب سے ملنے آئے ہو۔ پھر تم نے اس کے آدمیوں کو بتا دینا تھا کہ تم شہاب کے ساتھی رہ چکے ہو۔ وہ آدمی تو نئے تھے۔" شیر خان بولا۔

"چچا! تم مسلمان ہو۔ میں بھی مسلمان ہوں تم مجھے بچپن سے جانتے ہو۔ میں ایک غیرت مند انسان ہوں۔ اب غور سے سنو میں تمہیں سارا قصہ کھول کر سناتا ہوں۔" اور پھر شر خان نے کریم چچا سے شروع سے آخر تک ساری کہانی بیان کر ڈالی۔ کریم چچا پر ان

واقعات کا بڑا اثر ہوا۔ خاص طور پر اس واقعے پر اس نے سخت برہمی کا اظہار کیا کہ شہاب اور فیروز شیر خان کی بیٹی کو اغوا کر کے لے آئے تھے۔ اس نے شیر خان سے کہا۔

"مگر شیرے! شہاب اور فیروز جب تمہارے ملک پاکستان سے واپس آئے تھے تو ان کے ساتھ کوئی عورت نہیں تھی۔" شیر خان کے چہرے پر انتہائی فکر مندی کے تاثرات تھے۔ کہنے لگا۔

"جو سنہالی میرے ہاتھوں مارا گیا اس نے بھی یہ کہا تھا۔ مگر سوال ہے کہ پھر انہوں نے میری بیٹی کو کہاں غائب کر دیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ عائشہ کو وہ کہیں فروخت کر چکے ہوں؟"

"یہ لوگ کچھ بھی کر سکتے ہیں بیٹا۔ تم ان کی خصلت سے واقف ہو۔" کریم چچا نے آزردگی سے کہا شیر خان کے بدن میں جیسے جوالا مکھی کھول رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے اس نے کہا۔

"کریم چچا! میری بیٹی تو اپنی عزت بچانا جانتی ہے۔ وہ اب تک یا تو اپنی جان پر کھیل چکی ہو گی یا کئی لوگوں کو قتل کر چکی ہو گی میں نے اسے یہی تربیت دی ہے کہ اگر جان پر بنے تو مال قربان کر دو۔ لیکن اگر عزت پر حرف آنے کا خطرہ ہو تو اپنی جان بھی قربان کر دو۔ لیکن میں شہاب اور فیروز کو زندہ نہیں چھوڑوں گا انہوں نے برسوں کی دوستی کا گریبان تار تار کیا ہے اور میری عزت کو داغ دار کرنے کی مذموم کوشش کی ہے۔ میں یہی مشن لے کر یہاں آیا ہوں۔" کریم چچا کہنے لگا۔

"بیٹا سب سے پہلے ہمیں بچی کا پتا چلانا ہو گا کہ وہ کہاں پر ہے۔ میرا خیال ہے کہ شہاب وغیرہ نے اسے کسی جگہ پر چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ مگر چھپائے رکھنے سے انہیں کوئی فائدہ نہیں۔ بہت ممکن ہے کہ انہوں نے بیٹی کو بیچ ڈالا ہو۔ تم فکر نہ کرو۔ ابھی تم میرے پاس ہی ٹھہرو۔ میں اپنے طور پر سارا پتا کرا لوں گا۔"

شیر خان کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ سب سے پہلے اپنی بیٹی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکی ہے۔ اس کے بعد اسے شہاب اور فیروز سے نمٹنا تھا۔ اس نے کریم چچا کو سری لنکا کی کرنسی میں دو ہزار روپے دیے اور کہا کہ مجھے کہیں سے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ریوالور یا پستول لا دو۔ خالی چاقو شاید میری حفاظت نہ کر سکے۔ کریم کی بیوی چٹائی پر بچھے ہوئے کیلوں کے پتوں پر کھانا ڈال رہی تھی۔ کریم جھونپڑی میں گیا اور اندر سے ایک جرمن موزر (ریوالور) نکال کر لایا جس کے چیمبر میں میگزین بھرا ہوا تھا۔

"یہ تم اپنے پاس رکھو اور مجھے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے شیرے۔ یہ روپے بھی واپس لے لو۔" مگر شیر خان نے اصرار کر کے روپے کریم چچا کے پاس ہی رہنے دیے۔ جرمن ریوالور آٹو میٹک تھا اور اس کے ساتھ ایک سائیلنسر بھی تھا جو شیر خان نے اسی وقت ریوالور کی نالی پر چڑھا لیا۔ دونوں نے جھونپڑی کے اندر چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھایا۔

شہاب اور فیروز کو اگلے روز پہنچنا تھا۔ کریم چچا نے انتہائی رازداری سے کام لیا۔ اس نے اپنی بیوی کو بھی ساری بات بتا دی کہ شیر خان کی بیٹی کو شہاب اور فیروز نے اغوا کر لیا ہے اور وہ اپنی بیٹی کی تلاش میں آیا ہے۔ ساتھ ہی اسے بھی تاکید کر دی کہ وہ شیر خان کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائے اس جھونپڑی کے پیچھے جھاڑیوں کے اوٹ میں ڈھلان پر ایک اور جھونپڑی تھی جہاں درختوں کی سوکھی شاخوں اور ناریل کی چھال کا اسٹاک پڑا تھا۔ وہاں کریم چچا نے شیر خان کے چھپنے کے واسطے جگہ بنا دی اور ہدایت کی کہ وہ زیادہ تر جھونپڑی کے اندر ہی رہنے کی کوشش کرے۔ وہ رات گزر گئی۔ دوسرے دن دوپہر کے وقت شیر خان کے پاس کریم چچا آیا اور اس نے خبر دی کہ شہاب اور فیروز ابھی ابھی پہنچے ہیں اور اپنے گینگ کے دو آدمیوں کے قتل کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ ادھر بھی موقع واردات دیکھنے آئیں۔

"انہوں نے مجھے بھی پوچھا ہے کہ یہ لوگ جنگل میں کیسے قتل ہو گئے میں نے تو اسے یہی بتایا ہے کہ ہو سکتا ہے دونوں کا آپس میں کسی بات پر جھگڑا ہو گیا ہو۔ مگر شہاب سخت برہم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انہیں ہمارے کسی دشمن نے قتل کیا ہے۔" شیر خان خاموشی سے کریم چچا کی بات سنتا رہا۔ کریم چچا نے کہا۔

"تم یہاں سے باہر مت نکلنا اگر دیکھو کہ شہاب اور فیروز اس جھونپڑی کی تلاشی لینے آ رہے ہیں تو پیچھے کی طرف سے نکل کر جنگل میں چھپ جانا۔ جب تک بیٹی عائشہ کا پوری طرح سے سراغ نہیں مل جاتا تم ان دونوں میں سے کسی کو ہلاک کرنے کی کوشش نہ کرنا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس طرح ہمیں کبھی عائشہ بیٹی کا سراغ نہ مل سکے گا کیونکہ میں نے دیکھ لیا ہے کہ یہاں بیٹی کے بارے میں کسی کو کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔"

شیر خان زہر کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ دوپہر ڈھل رہی تھی کہ شاب اور فیروز وہ جگہ دیکھنے آگئے جہاں اس کے گروہ کے دو آدمی قتل ہوئے تھے۔ اس کی اطلاع کریم چچا نے شیر خان کو کر دی اور خود اپنے جھونپڑے کے سامنے درخت کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ شیر خان اپنی جھونپڑی میں سے چھپ کر باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے شہاب اور فیروز کو درختوں میں سے آتے دیکھا تو اس کا خون ابلنے لگا ہاتھ بے اختیار ریوالور کی طرف چلا گیا مگر پھر کچھ سوچ کر ریوالور پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور وہ ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ وہ شعلے برساتی آنکھوں سے شہاب اور فیروز کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں نے پستول لٹکا رکھے تھے۔ پیچھے رائفل بردار دو باڈی گارڈ چل رہے تھے کریم چچا نے آگے بڑھ کر دونوں کا استقبال کیا اور موقع واردات کی طرف چل دیے۔ اب شیر خان کو صرف باتیں کرنے کی کبھی کبھی آواز ہی آجاتی تھی آدمی کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ کیونکہ جہاں اس نے دو سنہالیوں کو قتل کیا تھا وہ جگہ درختوں کی آڑ میں تھی۔ بمشکل دو تین منٹ گزرے ہوں گے کہ شہاب اور فیروز درختوں میں سے کریم چچا کے جھونپڑے کی طرف آتے نظر آئے وہ جھونپڑے کے سامنے آکر رک گئے شہاب نے سنہالی زبان میں کریم چچا سے کہا۔

"یہ کام کسی باہر کے آدمی کا ہے۔ قاتل خفیہ پولیس کا آدمی بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے وہ اسی جنگل میں کہیں چھپا ہوا ہو۔ تمہیں نظر رکھنی ہے اور ایک ایک پل کی مجھے خبر کرنی ہو گی۔"

"ٹھیک ہے دادا۔ میں چوکس رہوں گا۔" کریم چچا نے بڑے ادب سے کہا۔ فیروز نے گردن گھما کر پچھلی جھونپڑی پر نگاہ ڈالی اور پوچھا۔

"اس میں کیا ہے؟" شیر خان نے ریوالور جیب سے نکال لیا۔ کیونکہ وہ اسی جھونپڑی میں چھپا ہوا تھا۔ کریم چچا نے کہا۔

"ناریل کی چھال پڑی ہے۔ کچھ جلانے کی لکڑیاں ہیں۔"

"چلو چل کر دیکھتے ہیں۔" شہاب بولا۔ اور پھر وہ جھونپڑے کی طرف بڑھے۔ اس کے ساتھ ہی شیر خان تیزی سے باہر نکل کر کچھ فاصلے پر جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا اور اپنی نگاہیں جھونپڑے پر جما دیں۔ ریوالور اس نے سیدھے ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ شہاب اور فیروز آگے آگے تھے۔ پیچھے کریم چچا اور باڈی گارڈ تھے۔ شہاب نے اشارہ کیا کہ ایک باڈی گارڈ رائفل سیدھی کر کے جھونپڑے میں گھس گیا پھر باہر آکر کہا کہ اندر کوئی نہیں ہے شہاب اور فیروز جس طرف سے آئے تھے اس طرف چل دیے۔ باڈی گارڈ اور کریم بھی ان کے پیچھے پیچھے چلا۔ شہاب نے رک کریم چچا کو کچھ کہا اور واپس بھیج دیا۔

شیر خان یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جب شہاب اور فیروز نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ جھاڑیوں سے اٹھ کر جھونپڑے میں واپس آگیا۔ تھوڑی دیر بعد کریم چچا بھی آگیا۔ وہ کچھ پریشان تھا کہنے لگا۔

تمہارے بارے میں تو اس کا وہم و گمان بھی نہیں کہ تم یہاں آئے ہوئے ہو اسے خفیہ پولیس پر شک ہے کہ اس کے آدمی یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ فیروز کا خیال تھا کہ یہ کام تامل گوریلوں کا بھی ہو سکتا ہے۔ بہر حال شہاب نے اپنے آدمیوں کو یہاں نگرانی پر لگا دیا ہے اب تمہارا اس جھونپڑے میں رہنا خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔

شیر خان حسب عادت خاموشی کے ساتھ کریم چچا کے چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ کریم چچا کہہ رہا تھا۔

"تم اس سارے علاقے سے واقف ہو۔ بہتر ہو گا کہ تم دو ایک روز کے لئے جھال

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

والی چٹانوں کے کسی غار میں چھپ جاؤ۔ میں رات کو تمہیں کھانا دے جایا کروں گا۔ وہاں پانی کی بھی تمہیں تکلیف نہیں ہو گی۔ دو ایک دن میں بیٹی کے بارے میں معلومات حاصل کر لوں گا۔ بہر حال میں تمہیں اب اس جگہ رہنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔"

شیر خان جانتا تھا کہ اگر شہاب اور فیروز کو پتا چل گیا کہ وہ جھونپڑے میں پناہ لیے ہوئے تھا تو کریم چچا اور اس کی بیوی کی موت یقینی تھی۔ وہ ان دونوں نیک دل بوڑھوں کو کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ جھال یعنی چھوٹی آبشار والی چٹانوں کی طرف جانے پر راضی ہو گیا۔

"مگر چچا بچی کا سراغ معلوم کرنا بڑا ضروری ہے مجھ سے زیادہ انتظار نہیں ہو گا۔" کریم چچا نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! میں اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں چھوڑ رہا مگر اس میں بڑی احتیاط بھی کرنی پڑ رہی ہے کہ کہیں شہاب یا فیروز کو شک نہ ہو جائے کہ میں اس بارے میں اتنی کرید کیوں کر رہا ہوں۔ بہر حال میں اسی ٹوہ میں ہوں' تم شام کو کھانا کھا کر جھال کی طرف نکل جانا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے وہاں تین غار ہیں۔ تم آخری غار میں چھپنا۔ اس طرف کوئی نہیں جاتا۔"

شیر خان نے ایسا ہی کیا شام کو تھوڑا بہت کھانا زہر مار کرنے کے بعد وہ وہاں سے ایک فرلانگ دور پہاڑی نالے کے اوپر چٹانوں کے درمیان جہاں ایک چھوٹی سی آبشار گرتی تھی وہاں پیچھے جو چٹانوں میں تین قدرتی غار تھے ان میں جو سب سے آخری غار تھا وہاں جا کر بیٹھ گیا۔ کریم چچا نے چٹائی سرہانہ' پانی پینے والا شیشے کا گلاس اور ایک باریک چادر اور دو موم بتیاں اسے ساتھ دے دی تھیں۔ مگر یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ موم بتی غار میں اس طرح جلائے کہ اس کی روشنی باہر سے ہرگز دکھائی نہ دے وہ رات شیر خان نے غار میں گزار دی۔ صبح چھوٹے سے پہاڑی چشمے پر آ کر منہ ہاتھ دھویا۔ وضو کر کے نماز پڑھی اللہ سے اپنی بچی کی خیریت کی دعا مانگی اور غار کے منہ کے قریب ایک طرف آڑ میں ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے یقین تھا کہ کریم چچا عائشہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات ضرور حاصل کرے گا۔ دوپہر کو بوڑھا کریم شیر خان کے لئے کھانا لے کر آیا تو شیر خان نے پہلا سوال عائشہ بیٹی کے بارے

میں پوچھا۔ کریم نے بڑی مایوسی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"شیرے بیٹا! ابھی تک میں کچھ پتا نہیں چلا سکا مجھے بہت سوچ سمجھ کر اس بارے میں پوچھنا پڑتا ہے۔ سیدھے سبھاؤ میں شہاب یا فیروز سے کوئی سوال نہیں کر سکتا۔ تم مجھے دو ایک دن کی اور مہلت دے دو۔ خدا نے چاہا تو بیٹی کا کچھ نہ کچھ پتہ ضرور مل جائے گا۔ یہاں تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے کہہ دو۔"

شیر خان نے نفی میں سر ہلا دیا اور خاموشی سے مچھلی کے ساتھ ابلے ہوئے چاول کھاتا رہا۔ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنا بھی بہت ضروری تھا۔ کریم تھوڑی دیر بعد چلا گیا۔ یہ علاقہ سری لنکا کے بالکل شمال میں تھا اور یہاں پر کوئی شہری آبادی نہیں تھی کہیں کہیں مچھیروں کی چھوٹی چھوٹی بستیاں تھیں۔ ان میں زیادہ تعداد مسلمان سنہالیوں کی تھی یا وہ تامل مچھیرے تھے جو صدیوں سے سری لنکا کے شمالی ساحل میں آباد تھے اور اسلام قبول کر چکے تھے۔ تامل گوریلوں کی سرگرمیاں یہاں سے ذرا نیچے دھنش کوڈی اور ٹالی منار سے شروع ہوتی تھیں۔ اسی مقام پر بھارت اور سری لنکا کے درمیان وہ چھوٹی سی خلیج تھی جہاں سے تامل گوریلوں کو انڈیا سے کمک پہنچتی تھی۔ مگر کبھی کبھی تامل گوریلے اوپر شمال کی بستیوں میں بھی خوراک وغیرہ حاصل کرنے آ جاتے تھے۔ شہاب اور فیروز کے اسمگلنگ گینگ سے تامل گوریلوں کے خوشگوار تعلقات تھے۔ کیونکہ دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ اسمگلر جرائم پیشہ تھے اور تامل گوریلے تخریب کار تھے جو بھارت کی شہ پر سری لنکا کی جمہوری حکومت کے پر امن ماحول کو تہس نہس کر رہے تھے۔ شہاب اور فیروز ان تامل گوریلوں کو مالی امداد کے علاوہ انہیں شراب اور ہیروئن بھی مفت سپلائی کر دیا کرتے تھے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ یہ تامل گوریلے وہاں سے جاتے ہوئے مچھیروں کی بستی سے کسی لڑکی کو اٹھا کر لے جاتے تھے۔

شیر خان کو جھال والی غار میں دوسری رات آ گئی تھی۔ وہ کچھ دیر غار کے باہر ٹہلتا رہا۔ پھر جب چٹانوں اور آس پاس کے درختوں میں رات کا اندھیرا چھا گیا تو وہ غار کے اندر آ کر موم بتی جلا کر چٹائی پر بیٹھ کر ریوالور کا میگزین نکال کر اسے صاف کرنے لگا۔ اس کا ذہن بہت پریشان اور الجھا ہوا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا اس کی پریشانی بڑھ رہی تھی۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

وہ عائشہ کے بارے میں آخری خبر معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر گئی ہے۔ لیکن حالات کا تقاضا یہی تھا کہ وہ ایک جگہ بیکار بیٹھ کر انتظار کی گھڑیاں شمار کرے جو شیر خان جیسے آدمی کے لئے نہایت تکلیف دہ کام تھا۔ پستول کو صاف کر کے اس مین سائیلنسر لگایا اور اسے سرہانے رکھ کر لیٹ گیا۔ مگر نیند کوسوں دور تھی۔ پھر بھی شیر خان نے آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا موم بتی اس نے بجھا دی تھی۔ اس کی کلائی کے ساتھ بندھی ہوئی گھڑی رات کے سوا گیارہ بجا رہی تھی۔ ماحول پر گہری خاموشی چھائی تھی۔ سمندر کی طرف سے آنے والی ہوا کھاڑی کے اوپر سے ہو کر جب ناریل اور تاڑ کی شاخوں میں سے گزرتی تو کسی وقت ان کی پراسرار سی سرسراہٹ سنائی دے جاتی تھی۔ ان راتوں کی یہ آوازیں اور خاموشیاں شیر خان کی جانی پہچانی اور شناسا تھیں۔ یہاں اس نے ایک عمر گزاری تھی۔ مگر یہاں کی فضا بھی کافی حد تک بدل گئی تھی۔ پہلے ادھر اسٹیمروں کی آواز نہیں آتی تھی مگر اب رات کے وقت بھی دور سے اسٹیمر کے انجن کی آواز آجاتی تھی پہلے دن رات میں شاذو نادر ہی کوئی ہوائی جہاز اوپر سے گزرتا تھا۔ مگر اب دن رات میں کتنے ہی جیٹ ہوائی جہاز نکل جاتے ہیں۔ شیر خان پر غنودگی چھانے لگی تھی کہ اسے کچھ انسانی آوازیں سنائی دیں وہ ایک دم سے چوکنا ہو گیا۔ اس کا ہاتھ اپنے آپ ریوالور پر چلا گیا وہ کان لگا کر سننے لگا کہ یہ آوازیں کیسی تھیں۔ ایک عورت کی آواز آئی جو سنہالی زبان میں منتیں کرنے کے انداز میں کہہ رہی تھی مجھے چھوڑ دو مجھے جانے دو۔ اس کے ساتھ ہی کسی مرد نے تامل زبان میں کسی سے پوچھا۔

"کیوں راجہ چھوڑ دیں اس کبوتری کو؟" دوسرے نے بھی تامل زبان میں ہی جواب دیا۔

"بستی سے اٹھا کر لائے ہیں ایسے ہی تو نہیں چھوڑیں گے۔ لے چل اسے غار کے اندر۔"

شیر خان سمجھ گیا کہ یہ تامل گوریلے ہیں اور مچھیروں کی بستی سے کسی عورت کو اٹھا کر لائے ہیں۔ وہ اپنی طرف سے ہوشیار ہو گیا۔ اور سوچنے لگا کہ اسے اس معاملے میں دخل دینا چاہیے یا نہیں۔ اتنے میں عورت نے اللہ رسول کا واسطہ دے کر کہا کہ میری عزت

خراب نہ کرو۔ لڑکی مسلمان تھی اس کے ساتھ ہی شیر خان کو اپنی بیٹی عائشہ کا خیال آگیا۔ اس نے ریوالور تھاما اور رات کے اندھیرے میں دبے پاؤں غار سے نکل کر اس طرف چلا جدھر سے عورت کی آواز آئی تھی۔ یہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر دو اور غار تھے۔ ان غاروں کا محل وقوع شیر خان کو معلوم تھا عورت بے بسی سے خدا رسول کے واسطے دیے جا رہی تھی اور لگتا تھا کہ دونوں تامل گوریلے اسے گھسیٹتے ہوئے لئے جا رہے ہیں۔ پہلے غار میں کچھ نہیں تھا یہ آوازیں اگلے غار کی طرف سے آرہی تھیں۔ شیر خان نے تاروں کی دھیمی دھیمی روشنی میں دیکھا کہ دو آدمی جن کے کاندھوں سے رائفلیں لٹک رہی تھیں ایک عورت کو کھینچ کر غار کے اندر لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ عورت بری طرح تڑپ رہی تھی اور ان کے چنگل سے نکل جانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ ایک تامل گوریلے نے زور سے عورت کے منہ پر تھپڑ مار دیا عورت کی ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ رونے لگی۔ اب انہوں نے مسلمان سنہالی عورت کو ٹانگوں اور بازوؤں سے پکڑ کر اٹھا لیا اور ڈولی ڈنڈا کر کے غار کی طرف لے چلے۔ شیر خان دائیں جانب سے ہو کر غار کے منہ کے قریب جھاڑیوں کے پیچھے آگیا۔ جونہی وہ غار کے سامنے آئے شیر خان نے ریوالور والا ہاتھ آگے بڑھا کر اگلے گوریلے کے سینے کا نشانہ لے کر اوپر تلے دو فائر کر دیے۔ ٹھک ٹھک کی آواز پیدا ہوئی اور اگلا تامل گوریلا منہ کے بل گر پڑا۔ دوسرے نے عورت کی ٹانگیں پکڑ رکھی تھیں وہ فوراً سمجھ گیا کہ سائیلنسر لگے پستول کے فائر ہوئے ہیں وہ عورت کو چھوڑ کر بھاگنے ہی لگا تھا کہ شیر خان اس کے سر پر پہنچ گیا اور اس سے پہلے کہ وہ رائفل سیدھی کرتا شیر خان نے دو گولیاں اس بدکردار تامل گوریلے کی کھوپڑی میں اتار دیں۔

دہشت زدہ عورت سہمی سہمی سی ایک طرف سمٹ کر بیٹھ گئی اور شیر خان کو خوف بھری نظروں سے تکنے لگی۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ یہ بھی کوئی ان کا ساتھی ہے اور انہیں ہلاک کر کے اب خود اس کی عزت سے کھیلے گا وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"مجھے کچھ نہ کہنا۔ مجھے کچھ نہ کہنا۔"

شیر خان اس کے قریب آگیا اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا اور پوچھا کہ اس کا گھر کہاں ہے۔ وہ نوجوان لڑکی تھی عمر انیس بیس سال کے قریب ہو گی شیر خان کے انداز سے اسے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

کچھ حوصلہ ہوا کہنے لگی۔

"ہماری بستی پوکھر کے پاس ہے ہم مسلمان تامل لوگ ہیں مجھے میرے گھر سے اٹھا کر لائے تھے میرے ماں باپ کو رسیوں سے باندھ دیا تھا تم مجھے کچھ نہیں کہو گے نا؟"

شیر خان نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "نہیں۔ کیا تم اکیلی اپنی بستی واپس جا سکتی ہو؟" لڑکی نے کہا۔

"مجھے اکیلی جاتے ڈر لگتا ہے۔ ان کے ساتھی کہیں راستے میں نہ مل جائیں۔"

شیر خان وہاں سے کہیں نہیں جانا چاہتا تھا مگر لڑکی کو بھی حفاظت سے اس کے گھر پہنچانا ضروری تھا۔ "اچھا چلو میں تمہیں تمہاری بستی میں چھوڑ آتا ہوں۔" وہ لڑکی کو لے کر پوکھر کی طرف چلا۔ پوکھر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا جب بستی کے جھونپڑے تاروں کی دھیمی روشنی میں دور سے نظر آنے لگے تو شیر خان رک گیا۔ "اب تم اپنے گھر جاؤ۔" لڑکی جھونپڑوں کی طرف بھاگ گئی اس کے جاتے ہی شیر خان بھی تیزی سے واپس اپنے ٹھکانے کی طرف چلنے لگا۔

دوسرے دن بستی میں ہر ایک مچھیرے کی زبان پر یہی بات تھی کہ رات تامل گوریلے جس لڑکی کو اٹھا کر لے گئے تھے وہ ان کے چنگل سے بچ کر آ گئی ہے اور وہ دونوں گوریلوں کی لاشیں جنگل میں پڑی ہیں۔ اس بات کا علم شہاب اور فیروز کو ہوا تو وہ پریشان ہو گئے کیونکہ وہ کسی بھی صورت میں تامل ایلام یعنی تامل گوریلوں سے دشمنی پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ان سے دشمنی مول لینے کا مطلب یہ تھا کہ تامل ایلام حملہ کر کے ان کے اڈے کو بموں سے اڑا دیتے اور ایک ایک کو موت کے گھاٹ اتار دیتے۔ تامل گوریلوں کی لاشیں شہاب اور فیروز کے لئے خطرے کا نشان تھا۔ انہوں نے فوراً اپنے آدمی بھیج کر گوریلوں کی لاشیں وہاں سے غائب کروا دیں اور مسلمان مچھیرن لڑکی اور اس کے باپ کو بلوا کر سختی سے ہدایت کی کہ وہ کسی کے آگے اس کا ذکر نہ کرے کہ تامل ایلام کے دو گوریلے اس کی لڑکی کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ لڑکی کے باپ نے ہاتھ باندھ کر کہا۔

"حضور! خدا نے ہماری بچی کی عزت بچا لی ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے۔ آپ مالک ہیں جیسا کہتے ہیں ویسا ہی کریں گے۔" فیروز نے لڑکی سے پوچھا۔

"کیا وہ بھی کوئی تامل تھا جس نے ان دونوں گوریلوں کو ہلاک کیا؟" لڑکی سہمی ہوئی تھی۔ اس نے یونہی سر کو اثبات میں ہلا دیا۔ شہاب نے فیروز کی طرف دیکھ کر پنجابی میں کہا۔

"اگر وہ بھی تامل ایلام کا آدمی تھا تو یہ راز تو پھر راز نہ رہا۔" شہاب نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔

"ہم نے لاشیں غائب کر دی ہیں۔ یہ لوگ چپ رہیں گے ہمیں اس سے کیا۔ یہاں تامل ایلام اور سنہالی فوجیوں کی جھڑپیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ وہ کوئی سنہالی فوجی بھی ہو سکتا ہے۔" فیروز نے یونہی لڑکی سے سوال کر دیا۔

"جس آدمی نے دونوں تاملوں کو گولی ماری تھی کیا اس نے فوجی وردی پہنی ہوئی تھی۔"

"نہیں۔" لڑکی نے سنہالی زبان میں آہستہ سے کہا۔ فیروز نے پوچھا۔

"اس نے تم سے بات کی تھی۔"

"ہاں۔" لڑکی نے جواب دیا۔

"وہ سنہالی بولتا تھا یا تامل؟"

"سنہالی۔"

"اس کا حلیہ کیسا تھا؟" فیروز نے پوچھا۔ لڑکی ڈری ہوئی تھی۔ آگے سے چپ رہی۔ اس کا باپ کہنے لگا۔

"بچی ڈری ہوئی ہے حضور۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بھی کوئی مسلمان تھا۔ اس کا رنگ گورا تھا۔ چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھی۔" یہ سننا تھا کہ شہاب اور فیروز نے چونک کر یوں ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے ان کے اوپر سے کوئی انتہائی زہریلا سانپ گزر گیا ہو۔ گورے رنگ کا مسلمان آدمی یہاں کون ہو سکتا ہے؟ دونوں کے دماغ میں یہی ایک سوال تھا۔ شہاب نے اب لڑکی کو جیب سے کچھ روپے نکال کر دیے اور بڑی شفقت سے پوچھا۔

"بیٹی اس کی عمر کیا ہو گی؟ ہاں ہاں ڈرو نہیں بتاؤ۔" لڑکی کو ذرا سا حوصلہ ہوا کہنے لگی۔

"جتنی آپ کی ہے اتنی ہی عمر ہو گی۔" شہاب نے ایک بار پھر فیروز کی طرف دیکھا اور پنجابی میں کہا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مجھے وہی لگتا ہے۔"

پھر لڑکی اور اس کے باپ کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا کہ وہ اس واقعے کا کسی سے ذکر نہ کرے اور خود فیروز کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ لکڑی کے بنے ہوئے چھوٹے سے شیڈ کے اندر جاتے ہی شہاب نے الماری میں سے دو پستول نکالے ایک پستول فیروز کی طرف اچھال دیا اور دوسرے پستول میں گولیاں بھرتے ہوئے بولا۔

"شیر خان یہاں پہنچ چکا ہے فیروز۔ اس سے بڑا خطرہ ہمارے لئے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔" فیروز کہنے لگا۔

"تو پھر کیا ہوا شہابو۔ وہ ہم سے بچ کر نہیں جائے گا۔ ابھی چل کر اس کا کام تمام کئے دیتے ہیں۔"

"چلو۔" یہ کہہ کر شہاب اور فیروز ان چٹانوں کی طرف چل پڑے جہاں ساتھ ساتھ تین غار تھے اور جن کے ایک غار میں شیر خان چھپا ہوا تھا۔ شہاب اور فیروز پیچھے سے ہو کر آئے وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر شیر خان نے انہیں دیکھ لیا تو پھر ان کا بچنا ناممکن نہ ہو گا وہ سب سے پہلے جنوب کی طرف جو بڑا غار تھا وہاں آئے۔ شہاب جھاڑیوں میں چھپا رہا۔ اس نے فیروز کو اشارہ کیا۔ فیروز پستول ہاتھ میں لئے چٹان کی دیوار کے ساتھ آہستہ آہستہ کھسکتا غار کے منہ پر آیا اور پھر اندر جھانک کر دیکھا۔ غار خالی پڑا تھا۔ اس نے شہاب کو اشارہ کیا کہ اندر کوئی نہیں ہے۔ اسی طرح وہ دوسرے غار میں ہو گئے۔ شیر خان وہاں بھی نہیں تھا۔ تیسرے غار میں جانے سے پہلے دونوں بے حد محتاط ہو گئے۔ انہیں یقین تھا کہ شیر خان اسی غار میں چھپا بیٹھا ہو گا۔ اب فیروز پیچھے رہا۔ شہاب خود پتھروں پر رینگتا ہوا غار کے پاس پہنچا اور دن کی روشنی میں غار کے اندر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اس نے ایک پتھر اٹھا کر غار کے اندر پھینکا غار سے کوئی باہر نہ آیا۔ دوسرا پتھر پھینکا جب پھر بھی کوئی اندر سے کوئی نہ نکلا تو وہ دونوں پستولیں تانیں دوڑ کر غار میں گھس گئے۔ غار خالی پڑا تھا۔ مگر انہیں کسی انسان کی موجودگی کا ثبوت مل گیا تھا۔ زمین پر چٹائی بچھی تھی۔ ایک جگہ پتھر پر بجھی ہوئی موم بتی اور ماچس پڑی تھی۔ پلاسٹک کی چھوٹی بالٹی اور شیشے کا ایک گلاس بھی رکھا تھا۔ شہاب دھیمی آواز میں بولا۔

"فیروز مجھے یقین ہے کہ یہ شیر خان ہی ہے۔" فیروز شہاب کو بازو سے پکڑ کر غار سے باہر لے آیا۔ باہر آتے ہی وہ لپک کر ایک طرف درختوں اور جنگلی جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گئے۔ فیروز نے آہستہ سے کہا۔

"یہ کوئی اور بھی ہو سکتا ہے۔" شہاب نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں پھوجے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہ شیر خان ہی ہے۔ وہ کہیں ادھر ادھر گیا ہے ہم اس کا انتظار کرتے ہیں۔ آج اس کا کام تمام کر کے ہی یہاں سے واپس جائیں گے۔" فیروز ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی ساحلی چٹانیں اور کہیں کہیں کھڑے تاڑ اور ناریل کے جھنڈ دن کی حبس آلود فضا میں خاموش تھے۔ شہاب نے ایک نظر اپنے پیچھے ڈالی اور سرگوشی میں کہا۔

"وہ یہیں کہیں ہو گا۔" فیروز نے کہا۔

"میرا خیال ہے وہ قصبے کی طرف کچھ کھانے پینے کی چیزیں لینے گیا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے ہم یہاں اس کا انتظار کریں گے۔" شہاب بولا۔

شیر خان ان دونوں کے پیچھے کوئی تیس قدموں کے فاصلے پر سنبھل کر ایک درخت کے پیچھے بیٹھا انہیں دیکھ رہا تھا۔ ریوالور اس کے سیدھے ہاتھ میں تھا۔ شہاب اور فیروز اس کی زد میں تھے وہ بڑی آسانی سے ان کو ہلاک کر سکتا تھا۔ مگر وہ ایسا نہیں کرنا چاہتا تھا ان دونوں کے ہلاک ہو جانے سے اس کی بیٹی عائشہ کے اغوا کا معمہ حل نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف یہی اسے بتا سکتے تھے کہ عائشہ کہاں ہے۔ ویسے بھی شیر خان کے لئے ان دونوں کو موت کے گھاٹ اتارنا کوئی مشکل کام نہیں تھا یہ کام تو یہاں آنے کے ساتھ ہی کر سکتا تھا۔ لیکن جب تک اسے اپنی بیٹی کا سراغ نہیں مل جاتا وہ انہیں مارنا نہیں چاہتا تھا شیر خان اسی بات پر بھی حیران تھا کہ شہاب اور فیروز کو کیسے پتا چل گیا کہ وہ اس غار میں چھپا ہوا ہے۔ اسے اچانک مسلمان مچھیرن لڑکی کا خیال آگیا۔ ہو سکتا ہے اس کے منہ سے یہ بات نکل گئی ہو کہ اس کو ایک اجنبی آدمی نے بچایا تھا۔ دن کے وقت جب شیر خان نے تامل گوریلوں کی دونوں لاشوں کو وہاں سے غائب دیکھا تھا تو اس کا اسی وقت ماتھا ٹھنکا تھا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔ اسی وجہ سے وہ غار سے نکل کر درخت کی اوٹ میں آکر بیٹھ گیا تھا اب جب اس نے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

شہاب اور فیروز کو وہاں آتے دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ اسی کی تلاش میں وہاں آئے ہیں ان لوگوں نے لڑکی سے پوچھ گچھ کی ہو گی لڑکی نے ضرور بتایا ہو گا کہ جس آدمی نے اسے تامل گوریلوں سے بچایا ہے اس کا رنگ گورا ہے اور گورا رنگ اس علاقے میں کسی کا نہیں ہوتا۔ یہاں سے شہاب اور فروز کو شک پڑا ہو گا کہ ہو نہ ہو یہ شیر خان کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا۔ شیر خان کے دل میں کئی بار خیال آیا کہ ابھی ان دونوں کا خاتمہ کر دوں۔ پھر یہ سوچ کر وہ ریوالور کی نالی کا رخ نیچے کر لیتا کہ نہیں۔ اتنی آسانی سے میں انہیں مرنے نہیں دو گا۔ پہلے ان سے عائشہ کے بارے میں پوچھوں گا کہ وہ کہاں ہے پھر ان دونوں کو ایسی ہولناک اذیت دے کر ماروں گا کہ جہنم میں پہنچ کر ان کی روحیں بھی اس اذیت کو فراموش نہ کر سکیں گی۔ جب پندرہ بیس منٹ انتظار کرتے گزر گئے اور شیر خان نہ آیا تو فیروز نے کہا۔

"میرا خیال ہے ہمیں کھاڑی کی طرف اسے تلاش کرنا چاہئے۔ اگر وہ قصبے میں گیا ہے تو ادھر ہی سے واپس آ رہا ہو گا۔ یہاں ہمارا چھپے رہنا ویسے بھی خطرناک ہے۔ شیر خان اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے اور وہ پورا کمانڈو بھی ہے۔ اگر اس کی نگاہ ہم پر پڑ گئی تو پھر ہمارے لئے جان بچانا مشکل ہو جائے گا۔"

شہاب نے ماحول کا جائزہ لیا اور جھاڑیوں کے پیچھے سے اندر کو چل پڑا۔ فیروز اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ جب وہ دونوں شیر خان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تو شیر خان وہاں سے اٹھا نہیں وہیں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب اسے کونسی حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے غار میں پناہ لئے رہنے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ جگہ یقیناً شہاب اور فیروز کی مسلسل نگرانی میں رہے گی۔ اسے کوئی دوسرا ٹھکانہ تلاش کرنا ہو گا۔ مگر سب سے پہلے کریم چچا کو صورت حال سے باخبر کرنا ضروری ہے۔ اگر وہ کھانا لے کر آ گیا تو شہاب کے آدمی اسے دیکھ لیں گے اور پھر اس کا اور اس کی بیوی کا نہایت اندوہناک انجام ہو گا۔ شیر خان کو یہ ہرگز گوارا نہیں تھا۔ یہ خیال آتے ہی شیر خان اٹھا اور جھاڑیوں پتھروں درختوں اور چٹانوں کی آڑ لیتا ایک لمبا چکر کاٹ کر کریم چچا کے جھونپڑے کے عقب میں نکل آیا۔ جھونپڑے کے باہر کریم کی بیوی کھانا تیار کر رہی تھی۔ چولہے میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

کریم چچا شیر خان کو دکھائی نہ دیا۔

وہ کچھ دیر وہیں سے ماحول کا جائزہ لیتا رہا جب اسے یقین ہو گیا کہ وہاں شہاب فیروز وغیرہ کا کوئی آدمی نہیں ہے تو وہ اٹھ کر جھونپڑے کی طرف آیا کریم کی بیوی نے گھبرا کر اسے دیکھا۔ شیر خان نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پوچھا چچا کہاں ہے۔ بیوی نے بتایا کہ جھونپڑے میں سو رہا ہے شیر خان جھونپڑے میں گھس گیا اسی وقت کریم چچا چٹائی پر آنکھیں ملتا اٹھ بیٹھا تھا۔

"کیا بات ہے شیرے خیر تو ہے؟"

شیر خان نے مختصراً الفاظ میں کریم چچا سے سارا ماجرا بیان کر دیا۔ کریم چچا نے پہلا سوال کیا۔

"تمہیں یہاں آتے تو کسی نے نہیں دیکھا؟" شیر خان بولا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا ویسے اس وقت شہاب اور فیروز چلے گئے تھے۔" کریم چچا جلدی سے باہر آ گیا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ ڈالی بیوی سے کہا کہ وہ شیر خان کے بارے میں خاموش رہے اور جھونپڑے میں آ گیا۔

"شیرے بیٹا! تم نے اچھا کیا کہ سیدھے میرے پاس آ گئے۔ میں تھوڑی دیر بعد تمہارے لئے کھانا لے کر جانے ہی والا تھا اور اس وقت تک شہاب کے خاص جاسوسوں نے غار کی نگرانی شروع کر دی ہو گی۔ تم ایسا کرو کہ یہاں سے بھی نکل جاؤ کیونکہ اب یہاں بھی خطرہ ہے۔ مگر تم کہاں جاؤ گے؟" شیر خان نے کریم چچا کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا کہنے لگا۔

"چچا! میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے میری مدد کی۔ میں کہیں بھی جا سکتا ہوں اس علاقے کی کوئی بھی جگہ مجھ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ میں تمہیں کسی مشکل میں نہیں ڈال سکتا۔ میں پھر آؤں گا۔" تم اس دوران کوشش کرتے رہنا کہ میری بیٹی کا کچھ اتا پتا معلوم ہو سکے۔" کریم چچا نے شیرے کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر چوم لیا۔ اور بولا۔

"کھانا کھا کر جاؤ۔"

"نہیں چچا! شیر جہاں جاتا ہے اپنی خوراک پیدا کر لیتا ہے۔ خدا حافظ!" یہ کہہ کر شیر خان جھونپڑی کے پچھلے چھوٹے دروازے سے نکل کر ان چٹانوں کی طرف چلا گیا جن کے عقب

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

میں ایک چھوٹا سا ٹاپو تھا اور ٹاپو کی دوسری جانب منڈالی نام کا بڑا قصبہ ہوتا تھا۔ اب یہ قصبہ ایک چھوٹا سا بندرگاہی شہر بن چکا تھا۔ شیر خان شارٹ کٹ راستوں سے گزر رہا تھا پھر بھی جب وہ منڈالی میں پہنچا تو سورج آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا۔ اس کے پاس روپے تھے کبھی یہ چھوٹا سا قصبہ ہوا کرتا تھا مگر اب ایک شہر بنتا جا رہا تھا۔ کئی نئی عمارتیں بن گئی تھیں۔ ان میں چھوٹے اور سستے ہوٹل بھی تھے۔ شیر خان سیدھا ایک ہوٹل میں آگیا جو سمندر سے تھوڑا ہٹ کر بازار کی نکڑ پر تھا۔ یہاں اس نے ایک کمرہ لے لیا۔ سب سے پہلے کھانا کھایا پھر اپنے چھوٹے سے کمرے میں آکر چارپائی پر لیٹ گیا اور سوچنے لگا کہ وہ کتنی دیر تک یوں انتظار کی حالت میں رہ سکتا ہے۔ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ صرف مزید تین روز انتظار کرے گا۔ اسی دوران اگر کریم چچا کو عائشہ کے بارے میں کوئی اطلاع نہ ملی سکی تو پھر وہ خود ڈائریکٹ ایکشن شروع کر دے گا۔ اور سب سے پہلے فیروز کو کسی طرح اغوا کر کے جنگل میں لے جائے گا اور اسے جتنی اذیت دے سکتا ہے دے کر عائشہ کے بارے میں پوچھے گا۔ شیر خان ایسا کر سکتا تھا۔ اگرچہ اس میں خود اسی کے پکڑے جانے اور جال میں پھنس جانے کا اندیشہ بھی تھا کیونکہ شیر خان وہاں اکیلا تھا اور شہاب اور فیروز کا پورا ایک گینگ تھا اور ان کے پاس بے شمار اسلحہ بھی تھا۔ اس کے باوجود شیر خان نے دل میں عہد کر لیا کہ وہ تین دن تک دیکھے گا اس دوران اسے عائشہ بیٹی کی کوئی خبر نہ ملی تو پھر وہ فیروز کو اغوا کر کے جنگل میں کہیں بھی لے جائے گا۔

دوسری طرف شہاب نے غاروں والی چٹانوں کی نگرانی شروع کرادی تھی۔ اس کے چھ مسلح غنڈے باری باری نگرانی کرتے تھے۔ شہاب نے انہیں شیر خان کا حلیہ بتا دیا تھا یہ سارے نئے بھرتی کئے ہوئے جرائم پیشہ نوجوان تھے۔ پرانے لوگ یا تو مرکھپ گئے تھے یا قید کاٹ رہے تھے اور یا کہیں ادھر ادھر چلے گئے تھے اس زمانے کے لوگوں میں سے کریم چچا کے علاوہ چند ایک لوگ ہی شہاب اور فیروز کے پاس باقی رہ گئے تھے۔ اسی دن رات کے وقت شہاب اور فیروز اپنے زیر زمین گودام میں ہانگ کانگ سے آیا ہوا مال چیک کر رہے تھے کہ ٹرنکو مالی سے ایک خاص آدمی ارجنا کا خط لے کر آگیا۔ خط چونکہ ضروری تھا اس لئے اسے نیچے گودام میں شہاب کے پاس جانے کی اجازت مل گئی۔ ارجنا بھی فیروز اور شہاب کے

پرانے ساتھیوں میں سے تھا اور جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اب ٹرنکومالی میں اسمگلنگ کا اپنا الگ دھندا کرتا تھا شہاب خط پڑھنے لگا۔ فیروز پلاسٹک کے ایک لفافے کو کھول کر ہیروئن چکھ رہا تھا۔ خط میں ارجنا نے لکھا تھا کہ ایک بہت بڑا سودا ہو رہا ہے۔ پرتگال سے ایک خاص ایجنٹ آیا ہوا ہے اگر تم چاہو تو اس میں حصہ ڈال سکتے ہو۔ رقم زیادہ چاہیے۔ میرے پاس فی الحال اتنی رقم نہیں ہے۔ اس کا جواب ابھی لکھ کر میرے آدمی کو دے دو۔ پچھلے دنوں پاکستان سے اپنا پرانا ساتھی شیر خان میرے پاس آیا تھا وہ صرف تمہیں ملنے یہاں آیا ہے کہہ رہا تھا ابھی میرا ذکر کسی سے نہ کرنا میں شہاب اور فیروز کو اچانک مل کر انہیں حیران کرنا چاہتا ہوں۔ اب تک تو وہ تمہیں حیران کر چکا ہو گا۔ اسے میری طرف سے گڈ لک کہنا۔ پرانا تجربے کار ساتھی ہے اور آج کل اسے کام کی ضرورت بھی ہے۔ اگر اسے بھی ساتھ ملا لیں تو ہمارے حق میں اچھا ہو گا۔ بہرحال تمہارے جواب آنے پر ہی کوئی فیصلہ ہو سکے گا۔ تمہارا ارجنا۔ شہاب نے فیروز کو سارا خط سنا دیا فیروز بولا۔

"تمہارا اندازہ درست تھا شہابو۔ وہ شیر خان ہی ہے۔"

"دوسرا کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا میری چھٹی حس نے مجھے بتا دیا تھا۔"

"""مگر شہابو۔" فیروز فکر مند سا ہو کر بولا۔ "ہمیں فوراً اس کا کام تمام کر دینا چاہئے۔ وہ زہریلا سانپ اپنی بیٹی کا بدلہ لینے آیا ہے اور ہمیں کسی وقت ڈس کر ہلاک کر سکتا ہے۔"

شہاب گلاس میں وائین ڈال رہا تھا۔ اس کا ایک گھونٹ پی کر کہنے لگا۔

"فیروز! تم بڑی جلدی جی چھوڑ دیتے ہو۔ شیر خان ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں نے اپنے آدمی اس کے پیچھے لگا دیے ہیں۔ لگتا ہے اسے ہمارے ارادوں کی خبر ہو گئی ہے اور وہ کسی دوسری جگہ جا کر چھپ گیا ہے۔ مگر فکر نہ کرو۔ آج نہیں تو کل وہ ہمارے آدمیوں کے قابو میں آجائے گا۔" فیروز اپنا وائین کا گلاس بھرتے ہوئے بولا۔

"مگر شیر خان نے ابھی تک ہم پر کوئی حملہ نہیں کیا۔ ورنہ وہ اگر چاہتا تو اس کے واسطے کوئی مشکل بات نہیں تھی۔" شہاب نے کہا۔

"جہاں تک میرا اندازہ ہے وہ ہم سے اپنی بیٹی کے بارے میں پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہے اور ہمارے اغوا کی فکر میں ہو گا اکیلا ہونے کی صورت میں وہ اپنے منصوبے پر ابھی عمل

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

نہیں کر سکا۔ بہرحال ہمیں خبردار اور چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔"

"مگر وہ چلا کہاں گیا؟" فیروز نے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے پوچھا۔ "یہیں کہیں کھاڑی میں چھپا ہوا ہو گا۔ ہمیں دو مزید باڈی گارڈ رکھنے ہوں گے۔ صرف دو باڈی گارڈوں سے کام نہیں چلے گا۔" فیروز زیادہ پریشان تھا کہنے لگا۔

"تم بھی شیر خان کی خصلت سے واقف ہو اور اس وقت وہ اپنی بیٹی کے اغوا کی وجہ سے غضبناک ہو رہا ہے۔ اسے زیادہ مہلت نہ دو شہابو۔ اس کی گولی کسی بھی وقت ہمارا خاتمہ کر سکتی ہے۔" شہاب نے گلاس کو زور سے میز پر رکھا اور بولا۔

"ٹھیک ہے مجھے صرف کل کا دن دے دو۔ اگر میرے آدمی اسے نہ پکڑ سکے تو میں خود اس کی تلاش میں نکلوں گا۔"

دوسری طرف شیر خان نے تین دن بعد اکیلے ہی شہاب کے خفیہ اڈے پر چھاپہ مار کر فیروز کو اغوا کرنے کا فیصلہ کیا ہوا تھا۔ اس دوران اس نے علاقے کے مختلف مقامات پر گھوم پھر کر عائشہ کا کھوج لگانے کی کوشش جاری رکھی۔ ادھر شہاب نے فیروز سے صرف ایک دن کی مہلت مانگی تھی۔ جب یہ مہلت ختم ہو گئی تو اس نے دو باڈی گارڈ اپنے ساتھ لئے اور صبح صبح شمال مشرق کی چٹانوں کی طرف چل دیا۔ فیروز کو خطرہ تھا کہ شیر خان کسی بھی وقت کسی طرف سے اچانک نکل کر حملہ کر دے گا اور پھر وہ شیر خان کے حملے سے بچ نہ سکے گا دراصل فیروز اندر ہی اندر شیر خان سے خوف زدہ تھا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ خود باڈی گارڈ لے کر شیر خان کو تلاش کرے گا اور جہاں کہیں وہ نظر آیا اسے قتل کر کے یہ قصہ ہی ختم کر دے گا۔ شہاب جس طرف گیا تھا شیر خان اس طرف نہیں تھا۔ فیروز شمال مغرب کی طرف چلا۔ شیر خان اسی علاقے کی چٹانوں میں اپنی بچی کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ فیروز نے بھی اپنے ساتھ ایک باڈی گارڈ لے لیا تھا۔ خود اس کے پاس رائفل تھی۔ باڈی گارڈ نے بھی رائفل اٹھا رکھی تھی اور جیکٹ کی جیب میں چاقو بھی تھا۔ فیروز چاروں طرف سے بڑا چوکنا ہو کر چھوٹے چھوٹے ٹاپوؤں اور چٹانی جنگل سے گزر رہا تھا۔ باڈی گارڈ کو اس نے اپنے پیچھے رکھا ہوا تھا کہ کہیں شیر خان اچانک نکل کر پیچھے سے حملہ نہ کر دے۔ دوپہر تک وہ پتھریلے راستوں پر پھرتے رہے۔ یہاں ایک جگہ بیٹھ کر انہوں نے کھانا کھایا اور تھوڑی دیر ستانے کے بعد ایک بار پھر شیر خان کی تلاش شروع کر دی۔ وہ ایک ایسی جگہ سے گزر رہے تھے جس کی ایک طرف نسواری رنگ کی اونچی اونچی چٹانیں تھیں اور دوسری طرف گھاٹی کی ڈھلان تھی جہاں نیچے ایک تیز رفتار پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا اس وقت فیروز کا باڈی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

گارڈ اس کے آگے آگے چل رہا تھا۔ چلتے چلتے باڈی گارڈ ایک دم سے رک گیا اور اس نے پیچھے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ فیروز بھی اشارہ دیکھ کر رک گیا۔ باڈی گارڈ وہیں بیٹھ گیا فیروز بھی بیٹھ گیا پھر کھسکتا ہوا باڈی گارڈ کے قریب آیا۔ باڈی گارڈ نے ہاتھ سے ذرا آگے ایک درخت کی طرف فیروز کو متوجہ کیا۔ فیروز نے گردن اٹھا کر دیکھا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا درخت کی اوٹ میں شیر خان گھاس پر سویا ہوا تھا اس پر ایسی ہی دہشت طاری ہو گئی جیسے وہ بے خیالی میں کسی سوئے ہوئے آدم خور شیر کے پاس پہنچ گیا ہو۔ رائفل اس کے ہاتھ میں کپکپانے لگی۔ اس نے باڈی گارڈ کو اشارہ کیا کہ اس پر فائر کرے۔ باڈی گارڈ نے رائفل سیدھی کر کے فائر کر دیا۔ دھماکے سے جنگل گونج اٹھا۔ گھبراہٹ میں اس کا نشانہ بھی خطا گیا تھا اور گولی شیر خان کے بازو کو چھوتی ہوئی زمین میں دھنس گئی تھی۔ شیر خان ایک دم جاگ پڑا۔ وہ پستول نکال ہی رہا تھا کہ باڈی گارڈ نے دوسرا فائر جھونک دیا مگر اب شیر خان بیدار ہو چکا تھا وہ تڑپ کر ایک طرف ہو گیا۔ فیروز نے چلا کر کہا۔

"اسے ختم کر دو۔" اب ایک فائر فیروز نے بھی کر دیا۔

دوسری طرف سے شیر خان نے ریوالور چلا دیا۔ گولی فیروز کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل کا اوپر کا تھوڑا سا حصہ اڑاتی ہوئی اسے ناکارہ کرتی ہوئی نکل گئی۔ دوسرا فائر باڈی گارڈ کے پیٹ میں لگا اور وہ شیر خان کے اوپر گر پڑا۔ دونوں ایک طرف کو لڑھک گئے۔ فیروز کے لئے شیر خان کو ہلاک کرنے کا یہ نادر موقع تھا۔ رائفل پھینک کر اس نے خنجر نکالا اور باڈی گارڈ کے نیچے سے پہلو بدل کر نکلتے ہوئے شیر خان کی پشت پر خنجر کے اوپر تلے دو چار وار کر دیے۔ شیر خان نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ایک زخم بڑا کاری لگا تھا وہ اٹھ نہ سکا۔ ریوالور اس کے ہاتھ کے شکنجے میں جکڑ سا گیا تھا اس میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ فیروز پر فائر کر سکتا فیروز کے ہاتھ میں خون آلود خنجر تھا وہ چلایا۔

"شیرے! آج تمہیں ہمیشہ کے لئے راستے سے ہٹا دوں گا۔" وہ شیر خان کی شہ رگ کاٹنے کے لئے بڑھا ہی تھا کہ شیر خان نے اپنے جسم کی بچی کھچی طاقت کو جمع کیا اور اپنے آپ کو گھاٹی کی ڈھلان پر لڑھکا دیا۔ وہ جنگلی جھاڑیوں کے اوپر سے لڑھکتا ہوا نیچے گہرائی میں بہنے والے تیز رفتار پہاڑی نالے میں گر پڑا اور فیروز کے دیکھتے دیکھتے پانی کا تیز بہاؤ اسے لے

کر آگے نکل گیا۔ اس نے اوپر سے دو تین گولیاں چلائیں مگر شیر خان کو پانی کا ریلا وہاں سے بہا کر لے جا چکا تھا۔

فیروز کو یقین ہو گیا کہ شیر خان ہلاک ہو گیا ہے وگرنہ وہ آگے سے ضرور مقابلہ کرتا۔ اب وہ اپنے باڈی گارڈ کی طرف آیا شیر خان کے ریوالور کی گولی نے باڈی گارڈ کے ایک پھیپھڑے کو پھاڑ ڈالا تھا اور وہ جان کنی کے عالم میں تھا۔ فیروز نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی مگر باڈی گارڈ کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ فیروز اکیلا اس کی لاش کو واپس اتنی دور اپنے ٹھکانے پر نہیں لے جا سکتا تھا وہ تیز تیز چلتا اپنے اڈے پر آیا وہاں سے چار آدمی اور ایک بانس کی کھاٹ ساتھ لی اور باڈی گارڈ کی لاش اٹھوا کر لے آیا۔ سہ پہر کے قریب شہاب بھی واپس آ گیا۔ اس نے لاش دیکھی تو فیروز سے پوچھا۔

"کیا ہوا تھا؟" فیروز نے سارا ماجرا بیان کیا اور آخر میں فاتحانہ انداز میں بولا۔

"شہابو لالے۔ شیر خان کو میں نے ختم کر دیا ہے۔" شہاب کو یقین نہ آیا کہنے لگا۔

"تمہیں شیر خان کی لاش بھی نالے سے نکال کر یہاں لانی چاہیے تھی۔"

"مگر لالے دی جان۔ نالے میں پانی بڑی تیز رفتاری سے بہہ رہا تھا وہ تو دیکھتے ہی دیکھتے اس کی لاش کو بہا کر کہیں سے کہیں لے گیا۔" شہاب بانس کے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ چہرہ متفکر تھا۔ پھر تیزی سے اٹھا اور بولا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ فیروز کے علاوہ تین چار آدمی بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ وہاں سے وہ سیدھا اس جگہ پہنچے جہاں نالے کا پانی ایک آبشار کی شکل میں چھوٹی سی جھیل میں گرتا تھا۔ انہوں نے کشتی میں بیٹھ کر جھیل میں شیر خان کی لاش کی تلاش شروع کر دی۔ یہ خیال ان کا بالکل صحیح تھا کہ لاش کو نالے میں بہتے ہوئے اس جھیل میں آ کر گرنا چاہئے تھا مگر لاش کہیں بھی نہیں تھی فیروز بولا۔

"یار اتنی دیر تک لاش میں پانی بھر گیا ہو گا اور وہ جھیل کی تہہ میں بیٹھ گئی ہو گی۔" شہاب نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"تو پھر جھیل میں غوطہ لگا کر نکالو لاش کو....." اور زیر لب فیروز کو گالیاں دینے لگا۔

"جب تک اس کی لاش نہیں ملے گی میں کیسے یقین کر لوں کہ شیر خان مر گیا ہے؟" وہ

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اس دشوار گزار چڑھائی کی طرف بڑھے جہاں سے چھوٹا راستہ اوپر پہاڑی نالے کی طرف جاتا تھا۔ شہاب ہر حالت میں شیر خان کے بارے میں تصدیق کرنا چاہتا تھا کہ وہ مر گیا ہے یا زخمی ہو کر کسی طرف کو نکل گیا ہے۔

اب ہم شیر خان کی طرف چلتے ہیں جب وہ نالے میں گرا تو پانی کی تیز لہریں اسے لے کر آگے بڑھنے لگیں کچھ فاصلے پر جا کر پہاڑی نالا ایک طرف گھوم جاتا تھا جہاں پانی کے کٹاؤ کی وجہ سے درختوں کی کئی ہوئی شاخیں رکی ہوئی تھیں۔ شیر خان کی "لاش" اس میں الجھ کر رہ گئی۔

اتفاق سے اس وقت پہاڑی نالے کی ڈھلان پر منگلی نام کی ایک سنیاسن معمول کے مطابق جنگلی پگڈنڈی پر آئی تو اس کی نظر ایک انسانی لاش پر پڑی جو نالے کے موڑ پر جھاڑیوں میں الجھی ہوئی تھی وہ دوڑ کر لاش کے پاس آئی اور جھک کر شیر خان کو دیکھا اس کی پیٹھ میں خنجر کے تین گھاؤ تھے جن میں سے خون ابھی تک نکل نکل کر پانی میں بہہ رہا تھا۔ سنیاسن منگلی نے شیر خان کی گردن پر کان کے نیچے الٹا ہاتھ رکھا تو اسے محسوس ہوا کہ یہ شخص ابھی زندہ ہے منگلی لنکا کے ایک قدیم سنیاسی قبیلے کی مضبوط جسم والی جوان عورت تھی جو اپنے بوڑھے سنیاسی باپ کے ساتھ اس وقت ساحلی علاقے کی چٹانوں اور ٹیلوں میں جڑی بوٹیاں تلاش کر رہی تھی اس نے اپنے باپ کو آواز دی۔ اس کا باپ بوٹیوں کا جھولا کاندھے سے لٹکائے درختوں سے نکل کر آگیا۔ منگلی نے کہا۔

"باوا یہ آدمی ابھی زندہ ہے۔ گورے چٹے رنگ کا ہے پردیسی لگتا ہے۔"

باوا نے بھی شیر خان کے زخموں کو جھک کر دیکھا۔ پھر اسے پانی سے نکال کر پتھروں پر لٹا دیا۔ منگلی نے کہا۔"باوا تم اس کے پاس بیٹھو میں بیل گاڑی لے کر آتی ہوں۔" ان کی چھوٹی سی بیل گاڑی جس پر جلانے کے واسطے سوکھی لکڑیاں لدی تھیں وہاں سے تھوڑی دور پیچھے کھڑی تھی۔ منگلی دوڑتی ہوئی گئی اور بیل گاڑی لے آئی انہوں نے لکڑیوں کے درمیان جگہ بنا کر بے ہوش اور شدید زخمی شیر خان کو لٹا دیا اور بیل گاڑی چلاتے اپنے ڈیرے پر آگئے ان کا ڈیرہ ٹیلے کے عقب میں تھا۔ چھوٹے سے نالاب کے کنارے درختوں کے درمیان انھوں نے ناریل اور بانس کی شاخوں کو جوڑ کر ایک جھونپڑا ڈال رکھا تھا یہ ان

کا عارضی ڈیرا تھا یہاں وہ برسات کے بعد جڑی بوٹیاں جمع کرنے آتے تھے۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ انہیں لگ جاتا اس کے بعد واپس اپنے قبیلے میں چلے جاتے جو وہاں سے کافی دور جافنا کے قرب و جوار میں تھا جافنا میں ہی وہ جڑی بوٹیوں کو فروخت بھی کر دیتے تھے۔ انہوں نے شیر خان کو جھونپڑے میں لٹا دیا۔ یہ سنیاسی بیماریوں اور زخموں کا علاج بڑی مہارت سے کرتے تھے۔ انہیں ایسی ایسی بوٹیوں کا علم تھا کہ ان کے لگانے سے زخم دنوں میں بھر جاتا تھا۔ منگلی نے فوراً کچھ بوٹیاں پیس کر ان کا لیپ بنایا اور کیلے کے پتوں پر ڈال کر شیر خان کے تینوں زخموں پر باندھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد شیر خان کو ہوش آگیا اس نے آنکھیں کھول دیں اور اپنے سامنے ایک سیاہ فام سفید بالوں والے پستہ قد بوڑھے سنہالی اور جوان چوڑے شانوں والی سانولی جوگن نما عورت کو دیکھا تو بولنے کی کوشش کی مگر بول نہ سکا۔ منگلی نے کہا۔

"باوا اسے ہوش آگیا ہے۔ شیر خان کو انہوں نے پہلو کے بل لٹا رکھا تھا کیونکہ خنجر کے تینوں زخم شیر خان کی کمر پر لگے تھے خوش قسمتی یہ ہوئی تھی کہ ریڑھ کی ہڈی بچ گئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد شیر خان نے دوبارہ آنکھیں کھول دیں اور کوشش کر کے سنہالی زبان میں پوچھا۔

"میں کہاں ہوں اور تم لوگ کون ہو۔" اسے سنہالی زبان میں بولتے دیکھ کر منگلی نے خوش ہو کر باوا سے کہا۔

"باوا یہ ہماری زبان بول لیتا ہے۔" پھر منگلی نے شیر خان کو حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کسی نے اپنی طرف سے قتل کر کے نالے میں پھینک دیا تھا میں منگلی سنیاسن ہوں یہ میرا باپ ہے ہم تمہیں بہت جلد اچھا کر دیں گے۔" شیر خان کے ذہن میں وہ سارا منظر گھوم گیا جب اس پر خنجروں سے پیچھے سے وار کیا گیا تھا اس نے آنکھیں بند کر لیں۔